میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

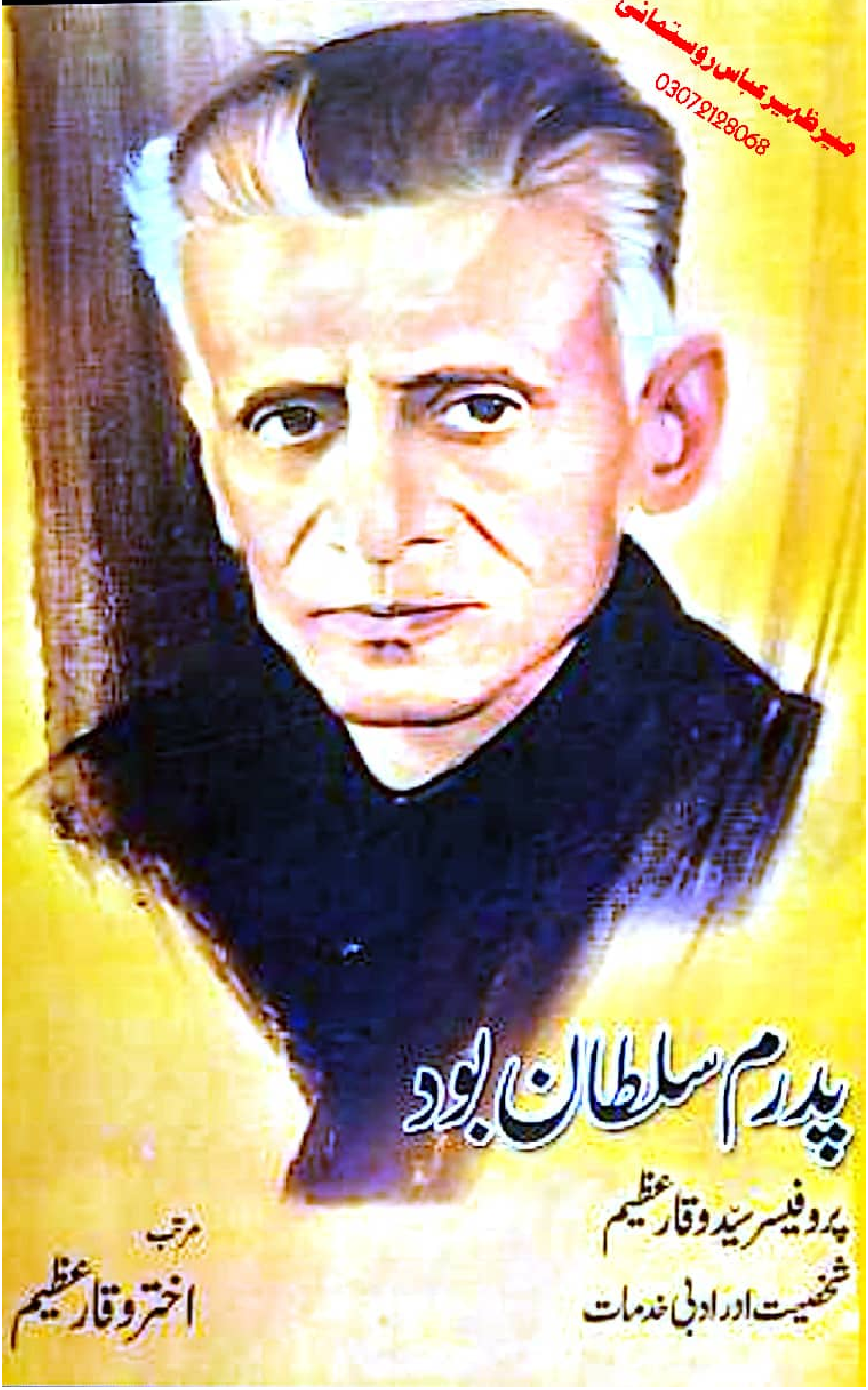

پدرم سلطان بود

پروفیسر سید وقار عظیم
شخصیت اور ادبی خدمات

مرتب
اختر وقار عظیم

پدرم سلطان بود

پروفیسر سیّد وقار عظیم
شخصیت اور ادبی خدمات

مرتب
اختر وقار عظیم

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

Meer Zaheer Abass Rustmani

923.4 Seyyed Waqar Azeem, Prof.
Padram Sultan Bood : Prof. Seyyed Waqar Azeem; Shakhsiat Aur Adabi Khidmaat/ Prof. Seyyed Waqar Azeem, ed. by Akhtar Waqar Azeem.-Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2017.
356pp. : with pictures.
1. Urdu Literature - Biography.
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

Mir Zaheer Abass Rustmani

2017ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-3047-0
ISBN-13: 978-969-35-3047-6

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sangemeel.com e-mail: smp@sangemeel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ ''کتب خانہ'' میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	مضمون	تحریر	صفحہ نمبر
1	پدرم سلطان بود	سیّد اختر وقار عظیم	09
2	آپ بیتی	پروفیسر سیّد وقار عظیم	27
3	بھائی صاحب	پروفیسر سیّد اقبال عظیم	63
4	واؤ۔ وقار عظیم	شوکت تھانوی	75
5	مشفق اُستاذ مخلص دوست	صوفی تبسم	77
6	ایک فردِ یگانہ	ڈاکٹر سیّد عبداللہ	83
7	ایک تاثر	احسان دانش	86
8	وقار صاحب	ڈاکٹر جمیل جالبی	87
9	روشنی کا مینار	ڈاکٹر عبادت بریلوی	95
10	ملاقاتیں	انتظار حسین	113
11	ایک دھیمی شخصیت	انتظار حسین	117
12	شجرِ سایہ دار	محمد طفیل	121
13	لاہور کا ایک خاموش دانشور	اے حمید	139
14	شفقت اور محبت کا دیوتا	صادق حسین	152

Mir Zaheer Abass Rustmani

نمبر شمار	مضمون	تحریر	صفحہ نمبر
15	ایک مکمل انسان	پروفیسر مشرف انصاری	157
16	عظمت و استقامت کا پیکر	ڈاکٹر معز الدین	171
17	میرا دوست	اثر صہبائی	180
18	مشفقِ من	پروفیسر خواجہ محمد سعید	181
19	قلب کی تالیف ہوگئی	پروفیسر صابر لودھی	186
20	ایک پُر وقار شخصیت	سجاد باقر رضوی	198
21	سلسلۂ ملاقات ۔ سید وقار عظیم کے ساتھ	کشور ناہید	204
22	اُستاد محترم	ڈاکٹر سہیل احمد خان	207
23	من موہنی شخصیت	ڈاکٹر پرویز پروازی	213
24	دُھند میں چلتا آدمی	احمد عقیل روبی	223
25	وقار عظیم صاحب	پروفیسر نظیر صدیقی	234
26	کیوں ترا راہ گزر یاد آیا	ڈاکٹر یونس جاوید	241
27	زندہ ہے	خلش مظفر	260
28	سیّد وقار عظیم کے خطوط، انور سدید کے نام	ڈاکٹر انور سدید	262
29	ایک عظیم انسان	اصغر سودائی	270
30	ایک تہذیبی دبستان	ڈاکٹر غلام حسین اظہر	274
31	وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا	ڈاکٹر معین الرحمٰن	284
32	سید محترم وقار عظیم	م ح مصطر	294

Mir Zaheer Abass Rustmani

CS CamScanner

نمبر شمار	مضمون	تحریر	صفحہ نمبر
33	سید وقار عظیم کا اُسلوبِ بیان	مرزا ادیب	296
34	اقبالیاتِ سید وقار عظیم	پروفیسر فتح محمد ملک	302
35	سید وقار عظیم۔ شخص و عکس	پروفیسر سحر انصاری	311
36	اُردو ڈراما تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ۔ وقار عظیم	ضیاء محی الدین	321
37	سیّد وقار عظیم اور ڈرامے کا فن	اصغر ندیم سید	327
38	حیاتِ وقار کے دو ثروت مند عشرے	ڈاکٹر زاہد منیر عامر	336
39	سیّد وقار عظیم بحیثیت نقاد	ریاض صدیقی	344
40	سیّد وقار عظیم فن اور زندگی	ڈاکٹر رضیہ نور محمد	353
41	تاثرات	بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، ڈاکٹر جسٹس ایس۔ اے رحمٰن، ڈاکٹر اعجاز حسین، پروفیسر خواجہ منظور حسین (علیگ) مولانا حامد علی خان، پروفیسر ڈاکٹر گیان چند، احمد ندیم قاسمی، جمیل الدین عالی، پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، مالک رام، ڈاکٹر وحید قریشی، پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں، ابن انشاء، نعیم صدیقی، شہزاد احمد، ڈاکٹر آغا سہیل، عطاءالحق قاسمی، افتخار عارف، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر محمد اجمل نیازی، خورشید زہرہ	
42	شجرۂ نسب		357

Mir Zaheer Abass Rustmani

CS CamScanner

انتساب

اپنی والدہ بیگم عابدہ وقار کے نام

جنہوں نے ہر اچھے 'برے موسم میں
بہت ثابت قدمی سے میرے والد کا ساتھ دیا اور گھر
میں ایسی خوشگوار فضا قائم رکھی کہ وہ اپنا ادبی اور
تدریسی کام اتنی خوش اسلوبی سے انجام دے سکے۔

پدرم سلطان بود

اختر وقار عظیم

میرے والد اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ اسی طرح میری والدہ بھی اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ اس لیے دونوں کو گھر میں بھائی صاحب اور آپا کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ خالاؤں، ماموؤں، پھوپھیوں اور چچاؤں سے سن سن کر مجھ سے بڑے میرے دونوں بہن بھائی بھی اُنھیں بھائی صاحب اور آپا ہی کہا کرتے تھے۔ میری باری آئی تو بھائی صاحب مختصر ہو کر صرف ''با'' رہ گیا اور پھر مجھ سے چھوٹے بہن بھائیوں نے اسے بابا بنا دیا۔ آپا البتہ سب کے لیے آپا ہی رہیں۔

ہم ماشااللہ آٹھ بہن بھائی ہیں، ایک مرتبہ بابا کے کسی دوست نے سب سے الگ الگ پوچھا کہ بابا سب سے زیادہ کسے چاہتے ہیں تو سبھی نے اپنا اپنا نام لیا۔ جواب بالکل درست تھا کیونکہ اُن کی محبت اور پیار سب کے لیے یکساں تھا۔ جمع تفریق ممکن نہیں تھی۔ ہر ایک کی ضرورت، پڑھائی لکھائی، کھیل کود کا سامان، کپڑے، کتابیں، اسکول کالج کی فیس ہر چیز پر اُن کی توجہ ہوتی تھی۔ کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہوئی اسی لیے چھوٹی عمر میں ہمیں ایسے لگتا تھا جیسے محلے میں شائد امیر ترین لوگ ہم ہیں کیونکہ کبھی ماں باپ نے کم آمدنی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ نہ ہی کبھی آپا کو خرچے کی کمی کی شکایت کرتے سنا۔ آج میں سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ یہ سب سہولتیں کیسے میسر کر

CS CamScanner

دیتے تھے۔ یہ کوئی آسان بات نہیں تھی' اس کے لیے اُنہیں بے انتہا محنت کرنا ہوتی تھی۔ کالج میں پڑھانے کے علاوہ امتحانوں کی کاپیاں جانچنا' نصابی کتب کی تیاری' سرکاری اور یونیورسٹی کے اِداروں میں اصطلاحات کے دفاتر میں اصطلاحات سازی' ریڈیو ٹی وی کے پروگرام' رسالوں اخباروں کی فرمائش پر مضمون نگاری اور بہت کچھ۔ یہ سب کچھ صرف اس لیے تھا کہ بچوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔

ہم بہن بھائیوں میں سے کسی کو ہلکا سا بھی بخار ہوتو اُنہیں تشویش ہوجاتی تھی۔ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار دیکھتے۔ پانی اور دوا لا کر کھلاتے اور اگر ضرورت ہوتی تو فوراً ڈاکٹر کے یہاں لے جاتے۔ آدھا بخار تو محبت سے ماتھے پر رکھے اُن کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوتے ہی دور ہو جاتا تھا۔

ہماری چھوٹی چھوٹی باتوں پر اُن کی توجہ کس حد تک ہوتی تھی اور وہ اپنی محبت کا خاموش اظہار کس طرح کرتے تھے۔ اِس کا اندازہ ان دو واقعات سے لگایا جاسکتا ہے۔

میری بڑی بہن کی شادی کم عمری میں ہوگئی تھی۔ بڑی ہونے کے ناطے وہ خاندان بھر کی اور خصوصاً بابا کی بہت چہیتی تھیں۔ جب کبھی میکے آتیں تو بابا کی کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ وقت اُن کے ساتھ گزاریں۔ گھر میں اُن کی پسند کی چیزیں پکتی تھیں۔ بازار سے لائی جاتی تھیں۔ اور وقت ہوتو پکنک بھی منالی جاتی تھی۔ میرے بہنوئی واپس لے جانے کے لیے آتے تو دونوں کو ریلوے اسٹیشن چھوڑنے بابا خود جایا کرتے تھے۔ ٹرین چلنے تک کھڑکی کے ساتھ کھڑے باتیں کرتے رہتے۔ ٹرین چل دیتی تو پلیٹ فارم پر ڈبے کے ساتھ ساتھ کچھ دُور تک آہستہ آہستہ اور پھر اُس وقت تک تیز تیز چلتے رہتے جب تک انجن رفتار نہیں پکڑ لیتا تھا۔

میں 1974ء میں پاکستان ٹیلی وژن کی طرف سے پڑھنے کے لیے سراکیوز یونیورسٹی نیویارک گیا تھا۔ بابا کی ڈائری میں اس کا تذکرہ یوں ہے:

روانگی اختر برائے نیویارک: 21 ستمبر

فلائٹ: پین امریکن ایرلائن

وقت: صبح چھ بجے

وزن: 125 LB

وزن کا حوالہ شائد اِس لیے تھا کہ اُنہیں فکر تھی کہ مجھے امریکہ میں حسب خواہش کھانا ملے یا نہ ملے کیونکہ ابھی امریکہ پہنچے محض ہفتہ دس دن ہوئے تھے کہ والدہ کی طرف سے خط ملا: ''بیٹا مجھے اور بابا کو تمہاری بہت فکر ہے۔ اپنی صحت کا خیال رکھنا' گھومنا پھرنا اور خوب کھانا۔ ہم تمہیں موٹا دیکھنا چاہتے ہیں۔''

یوں خود بابا کھانے کے بہت شوقین نہیں تھے۔ جو مل گیا سو کھالیا۔ خصوصی فرمائش کرکے کوئی چیز بہت کم پکواتے تھے۔ لیکن شہر بھر کی دوکانوں کا اُنہیں معلوم تھا کہ کون سی چیز کہاں سب سے بہتر ملتی ہے چنانچہ خود کھائیں نہ کھائیں لاہوری دروازے کی نہاری' قطب الدین ایبک کے مزار کے پاس کے گولا کباب' پُرانی انارکلی کی جلیبی اور باقرخانی' گنپت روڈ کے موتی چور کے لڈو' لاء کالج کے پاس کا قلفہ' مزنگ چونگی یا بھاٹی گیٹ کی مچھلی میں سے کوئی چیز ہر دوسرے چوتھے روز ہمارے ہاں ضرور آتی تھی۔ پھلوں کی بھی اُنہیں خوب پہچان تھی۔ پھل خود بھی شوق سے کھاتے تھے۔ ہر وقت گھر میں کوئی نہ کوئی موسمی پھل موجود رہتا تھا۔

کھانے سے زیادہ کھلانے کا شوق تھا۔ کسی نہ کسی بہانے رشتہ داروں اور دوستوں کو جمع کر لیتے تھے۔ یوں بھی ہمارے گھر میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی مہمان موجود رہتا

تھا۔ بعض اوقات بابا کے ضرورت مند شاگرد بھی مہمان بنا لیے جاتے تھے۔ یہ لوگ ہمارے یہاں خوش رہتے کہ ایک تو ہر وقت اُنھیں اپنے اُستاد کی صحبت مُیسر آ جاتی اور دوسری طرف اس ناطے بہت سے اُن اہلِ قلم سے ملاقات بھی ہو جاتی جن کا گھر میں مستقل آنا جانا رہتا تھا۔ البتہ ہم بہن بھائی کسی شاگرد کے مہمان بننے سے ذرا فکرمند ہو جاتے تھے کیونکہ اس خیال سے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو اُستادِ محترم پر بوجھ نہ سمجھیں، بابا اُن کے ذمہ بلاضرورت یہ کام لگا دیتے تھے کہ وہ ہمیں ہماری نصابی سرگرمیوں میں مدد دیں۔ اب آپ کو ضرورت ہو نہ ہو یہ ٹیوشن لینا پڑتی تھی۔ بہرحال والد کی خوشنودی کے لیے سب چپ سادھ جاتے تھے۔

مہمانوں کی آؤ بھگت اور تعظیم کی تربیت ہمیں بچپن سے دی گئی تھی اور اس میں کسی قسم کی رعایت کی گنجائش نہیں تھی۔

ڈاکٹر منیر الدین چغتائی، پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات کے سربراہ اور بابا کے بہت دوست تھے۔ وہ میرے چھوٹے بھائی اطہر سے جب بھی ملتے افسوس کرتے تھے کہ میری وجہ سے بچپن میں آپ کو ایک مرتبہ اپنے بابا سے ڈانٹ پڑی تھی۔ اطہر بھول بھال گئے تھے۔ چغتائی صاحب نے یاد دلایا۔ قصہ یوں تھا کہ اطہر گھر سے کچھ دور کرکٹ کھیل رہے تھے۔ چغتائی صاحب کی ان پر نظر پڑی تو اُنھوں نے گھر کا رستہ پوچھ لیا۔ اطہر نے وہیں کھڑے کھڑے رستہ سمجھا دیا: ''سیدھے چلے جائیے، دائیں ہاتھ پر ساتواں مکان ہے جس کے لان میں ایک طرف امرود کا اور دوسری طرف ربڑ کا بڑا سا درخت لگا ہے۔ باہر بابا کے نام کی تختی لگی ہے۔'' چغتائی صاحب بتائی ہوئی نشانی کے مطابق گھر پہنچ گئے۔ گھنٹی بجانے پر بابا، باہر نکلے، چغتائی صاحب سے پوچھا: ''گھر ڈھونڈنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی؟'' اُنھوں نے بتایا: ''بالکل بھی نہیں، چوراہے پر آپ کے صاحبزادے مل گئے

تھے، اُنہوں نے ایسا صحیح رستہ بتایا کہ میں بغیر کسی مشکل کے پہنچ گیا۔‘‘

ابھی چغتائی صاحب گھر ہی میں تھے کہ اطہر کھیل کر واپس آ گئے۔ بابا نے اُن سے پوچھا: ’’چغتائی صاحب کو پتہ تم نے بتایا تھا؟‘‘ اُنہوں نے کہا: ’’جی۔‘‘ اس پر بابا خفا ہوئے: ’’کیا کھیل اتنا ضروری تھا کہ تم نے وہیں سے چغتائی صاحب کو پتہ بتا دیا۔ گھر تک پہنچانے کیوں نہیں آئے؟‘‘ چغتائی صاحب بیچ میں بول پڑے: ’’جانے دیجیے مجھے گھر آنے میں بالکل تکلیف نہیں ہوئی۔‘‘ بات ختم ہو گئی۔

میرے والد کی شخصیت میں ایک خاص طرح کی کشش تھی۔ جو بھی اُنہیں ایک مرتبہ مل لیتا ہمیشہ کے لیے اُن کا گرویدہ ہو جاتا۔ اس کے لیے پڑھا لکھا ہونا یا ادب سے دلچسپی رکھنا ضروری نہیں تھا۔ گھر کے ملازم، مالی، دھوبی سبھی اُن پر جان چھڑکتے تھے۔ محلے داروں کا بھی یہی حال تھا۔ مجھے یاد ہے، سن پچپن یا چھپن میں ہم حسبِ معمول گرمیوں کی چھٹیوں میں مری گئے ہوئے تھے واپس ہوئے تو لاہور شہر سیلاب میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی۔ بابا نے ریلوے اسٹیشن سے کرائے پر تانگہ لیا۔ سامان اُس میں رکھا اور ہم گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھر سے ابھی کچھ دور ہی تھے کہ راستہ میں ایک ہمسائے ماسٹر عبدالرحمٰن صاحب اپنی شلوار کے پائنچے گھٹنوں تک اُونچے کیے، معاملات کا جائزہ لیتے پانی میں کھڑے دکھائی دیے۔ ماسٹر صاحب ریٹائرڈ ڈرائنگ ماسٹر تھے۔ گھر ہی پر رہتے تھے اور پورے محلے کی ایک ایک چیز پر نظر رکھتے تھے۔ اپنے آپ کو بھارتی اداکارہ نمی کا رشتے دار بتاتے اور ہم سب کو اپنے گھر کے باہر لگے جامن کے درخت کے نیچے پڑی چارپائی پر بٹھا کر نمی کے بچپن کے قصے سناتے رہتے تھے۔ محلے میں ایک طرف اداکارہ لیلیٰ اور دوسری طرف اداکار آزاد رہتے تھے جو کبھی قائدِ اعظم کی کار پر ڈرائیور رہ چکے تھے۔

ماسٹر صاحب کا اُن دونوں سے بھی رابطہ تھا۔ وہ اُن کی دی ہوئی فلمی خبریں بھی ہم تک پہنچاتے رہتے تھے۔ ماسٹر صاحب کی نظر ہم پر پڑی تو لپک کر آگے آ گئے اور بابا سے کہا: ''اتنا شدید سیلاب ہے کہ لوگ شہر چھوڑ کر دوسری جگہوں پر شفٹ ہو رہے ہیں اور آپ باہر سے یہاں آ گئے۔ بچوں کا ساتھ ہے تانگہ موڑیے اور واپس مری یا راولپنڈی چلے جائیے۔'' بابا مسکرائے، حسبِ معمول اُن کے چہرے پر پریشانی کے آثار بالکل بھی نہیں تھے۔ ماسٹر صاحب کا کندھا تھپتھپایا اور کہا: ''آپ سب بھی تو اس پریشانی اور سیلاب میں یہاں رہ رہے ہیں، ہم بھی رہ لیں گے۔ آئیے گھر چلتے ہیں۔'' ماسٹر صاحب مزید کچھ کہے بغیر ساتھ ہو لیے۔ گھر پہنچے تو ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ کھیلوں کا میدان جو اپنی گہرائی کی وجہ سے ''ڈونگی گراؤنڈ'' کہلاتا تھا۔ تالاب کی طرح پانی سے بھرا ہوا تھا۔ ہم بچوں نے اتنا پانی سڑکوں اور گھروں میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا اس لیے اسے تفریح کا موقعہ جانتے ہوئے پانی میں خوب چھلانگیں لگائیں اور ربر کی گیند اِدھر اُدھر اُچھال کر اسے پکڑنے کے لیے بھاگتے پھرے لیکن بابا کے لیے بھی یہ سب کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے معمول کی بات ہو۔ دوکانیں بند تھیں، سودا سلف مل نہیں رہا تھا گھر میں پڑے اناج پر گزارا کرنا پڑا لیکن کسی کو اس بات کی پریشانی نہیں تھی۔

ایک دن تو بابا نے آرام کیا، دوسرے دن سے اُن کی مصروفیت شروع ہو گئی۔ صبح کے کوئی نو بجے ہوں گے کہ ایک ریڑھے میں سوار سبطِ حسن صاحب اور مصور شاکر علی صاحب آ گئے۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ کے گھروں میں ہم سے کچھ دور اسی محلے میں رہتے تھے۔ سبطِ صاحب نے باہر سے آواز لگائی: ''ہمارے ہاتھ یہ سواری لگ گئی ہے ریڑھا بھی نیا ہے اور گھوڑا بھی شاندار، شہر جا رہے ہیں سوچا آپ کو بھی لیتے چلیں۔ آ جائیے، بیٹھنے کے لیے اپنا

کشن ساتھ لیتے آیئے گا۔" تینوں بغیر کسی جھجک اور پرواہ کے ریڑھے میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے شام کو اسی طرح واپسی ہوئی۔ ریڑھا سودا سلف اور اخباروں سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ چیزیں گھر کے لیے تھیں اور کچھ آس پاس کے محلے داروں کے لیے۔

سیلاب کے دنوں ہی میں ہمارے ایک ہمسائے' خواجہ آصف صاحب کے گھر کا کچھ حصہ سیلابی پانی کی وجہ سے گر گیا۔ گھر والے محفوظ رہے لیکن گھر کی مخدوش حالت کے پیش نظر ہمسائیوں نے اُنہیں دعوت دی کہ کسی کے گھر میں شفٹ ہو جائیں لیکن آصف صاحب جو پیشے کے اعتبار سے وکیل اور بہت تکلف والے آدمی تھے تیار نہیں ہوئے۔ محلے میں ایک گھر کسی کرائے دار کی تلاش میں خالی پڑا ہوا تھا جس کے مالک ڈاکٹر شفیق الرحمٰن صاحب کچھ ہی دن پہلے خاندان سمیت کسی اور محلے میں جا بسے تھے۔ بابا نے وکیل صاحب کو مشورہ دیا کہ اُس گھر میں چلے جائیں۔ مالک مکان سے رابطے کی ناکام کوشش کے بعد گھر کا تالہ توڑ کر وکیل صاحب کا سامان وہاں پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹر شفیق الرحمٰن ٹی بی کے علاج میں خاص مہارت رکھتے تھے اور خواجہ دل محمد روڈ پر مطب کرتے تھے۔ یہ وہی سڑک ہے جس کے بارے میں شوکت تھانوی صاحب نے لکھا تھا: "دل محمد صاحب ریاضی کے ماہر بھی ہیں اور شاعر بھی۔ دل محمد روڈ اُن کے نام کی سڑک ہے کہیں روڈ کو اِن کا تخلص نہ سمجھ لینا۔" سیلاب کا پانی کچھ کم ہوا تو ڈاکٹر صاحب گھر کا جائزہ لینے آ گئے۔ یہاں ایک بن بلائے مہمان کو براجمان دیکھ کر پہلے کچھ پریشان ہوئے اور پھر غصے میں اُن کی وکیل صاحب سے اچھی خاصی اَن بن ہو گئی لیکن جب اُنہیں بتایا گیا کہ وکیل صاحب کے حالات دیکھ کر اُنہیں یہاں وقار عظیم صاحب نے رہنے کی اجازت دی ہے تو مسکرا دیئے: "اچھا تو پھر ٹھیک ہے۔"

محلے میں کوئی مسئلہ ہو تو بابا کی ثالثی سب کو منظور ہوتی تھی۔ کئی محلے دار تو اُن کی محبت ہی میں وہاں آ بسے تھے، ہمارے دائیں بائیں یونیورسٹی کے کچھ پروفیسر رہتے تھے۔ مدتوں مشہور ناول نگار جمیلہ ہاشمی، افسانہ نگار صادق حسین، مشرق اخبار کے ایڈیٹر مکین احسن کلیم، مشہور صحافی حسین نقی وہیں رہتے رہے۔ ٹی وی کے کمپیئر لعیق احمد خان بھی اپنے والد صدیق احمد خان صاحب کے ساتھ وہیں رہتے تھے۔ اپنی شادی کے کچھ دنوں بعد اُنہوں نے اسی محلے میں ایک اور گھر آغا ناصر صاحب کے ساتھ مل کر کرائے پر لے لیا۔ یوں آغا صاحب بھی ہمارے ہمسائے ہو گئے۔

لکھنے پڑھنے کے کام کے لیے میرے والد نے کبھی میز کرسی پر بیٹھنے کا تکلف نہیں کیا۔ ہم سب کے درمیان مسہری پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھ کر لکھتے تھے۔ باتیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ ٹی وی پر اپنی پسند کے پروگرام اور خبریں بھی دیکھتے رہتے تھے اور کہیں پاکستان کی کرکٹ ٹیم کا میچ ہو رہا ہو تو ریڈیو پر کمنٹری بھی سنتے جاتے تھے۔ کرکٹ اُن کا پسندیدہ کھیل تھا۔ یوں وہ خود کبھی کرکٹ نہیں کھیلے تھے لیکن اس کی باریکیوں کو پوری طرح سمجھتے تھے البتہ طالب علمی کے زمانے میں فٹ بال ضرور کھیلتے تھے۔ کبھی کبھی ہمارے ساتھ بیڈمنٹن اور کیرم کھیل لیتے تھے۔ دونوں ہی کھیلوں میں اُنہیں خوب مہارت حاصل تھی۔ بیڈمنٹن میں اُن کا اُونچا قد اور کیرم میں لمبی لمبی اُنگلیاں مددگار ہوتی تھیں اس لیے عموماً کھیل میں جیت اُن ہی کی ہوتی تھی۔ ہم سب بہن بھائیوں کی کوشش ہوتی تھی کہ ڈبلز میں اُن کے پارٹنر بن جائیں۔

بابا ایک مدت تک درس و تدریس سے منسلک رہے اور ایک اُستاد کی حیثیت سے اُنہوں نے زندگی کو خوب Enjoy بھی کیا۔ اُنہیں اپنی آئندہ آنے والی نسلوں پر بہت بھروسہ اور اعتماد تھا۔ ہر سال پڑھنے کے لیے نئے نئے طالب علم آتے جن کی رہنمائی

سے اُنہیں خوشی ملتی تھی ۔ شوکت تھانوی صاحب نے ایک جگہ اُن کے بارے میں لکھا ہے: ’’سنا ہے اُن کا پڑھایا ہوا لکھنے بھی لگتا ہے۔‘‘ میں اپنے ابا کے اُن کے شاگردوں کی طویل فہرست پر نظر ڈالوں تو بے شمار ایسے نام ذہن میں آ جاتے ہیں جنہوں نے ادب کی دنیا میں خوب نام کمایا۔ اُن کی کامیابی میں اُن کی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اُن کے ہنر کو تراشنے میں اُن کے اُستاد کی رہنمائی بھی یقیناً شامل رہی ہوگی کیونکہ اُن کے سبھی شاگرد جہاں اُن سے بے حد محبت کرتے تھے وہیں اُن کے بتائے ہوئے رستے اور اُن کی رہنمائی پر ہمیشہ اظہارِ تشکر بھی کرتے تھے ۔ یہ شاگرد صرف ادب اور تدریس کی دنیا تک محدود نہیں تھے جگہ جگہ اُن سے رابطہ ہو جاتا تھا۔ اِس سلسلے میں اپنے دو تجربات آپ کو سناتا ہوں ۔ ایک مرتبہ مجھے کسی سرکاری دورے پر ملک سے باہر جانا تھا ۔ نہ جانے کتنی ہی وزارتوں سے اس کی منظوری لینا ہوتی تھی ۔ جانے میں ایک دن رہ گیا تو میرے دوست عون محمد رضوی نے پوچھا: ’’کیا پروگرام ہے؟‘‘ میں نے بتایا: ’’یوں تو کل روانگی طے ہے لیکن شائد جا نہ سکوں کیونکہ ابھی تک حکومتی منظوری نہیں ہوئی ہے۔‘‘ عون نے پوچھا: ’’کس وزارت میں فائل ہے؟‘‘ میرے بتانے پر اُنہوں نے کہا: ’’وہاں تو ایک بڑے عہدے پر میرے ایک دوست تعینات ہیں جو میرے پیر بھائی بھی ہیں۔ آؤ چل کر ان سے بات کرتے ہیں۔ شائد یہ کیس اُنہی کے پاس ہو۔‘‘ ہم متعلقہ وزارت پہنچے۔ عون نے میرا تعارف کراتے ہوئے آنے کا مقصد بتایا تو وہ صاحب یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے: ’’آپ لوگ بیٹھیے میں ابھی آیا۔‘‘ کچھ دیر بعد واپس ہوئے تو ہاتھ میں ایک فائل تھی جو عون کی طرف بڑھاتے ہوئے اُنہوں نے کہا: ’’اچھا ہوا جو تم یہاں آ گئے ورنہ یہ فائل دبی رہ جاتی ۔ اس پر میں نے منظوری دے دی ہے لیکن یہ تمہاری وجہ سے نہیں

بلکہ اس وجہ سے ہے کہ اختر میرے اُستاد پروفیسر سید وقار عظیم کے بیٹے ہیں اور آج یہ پہلی مرتبہ میرے دفتر آئے ہیں۔" اسی طرح ایک واقعہ جنرل ضیاءالحق کے زمانے کا ہے۔ مشکل وقت تھا' آئے دن کوئی نہ کوئی انکوائری چلتی رہتی تھی۔ ایک دن کسی میٹنگ میں جانا ہوا جس کی صدارت جنرل ضیاءالحق کے قریبی ساتھی اور پیداوار کے وزیر جنرل سعید قادر کر رہے تھے۔

پاکستان ٹیلی وژن سے متعلق ایک آدھ سوال کا میں نے جواب دیا تو انہوں نے کہا: "میٹنگ کے بعد آپ ذرا ٹھہریے گا۔ مجھ سے مل کر جایئے گا۔" میں نے سوچا کوئی نئی مصیبت آنے والی ہے۔ بہرحال رُک گیا۔ میٹنگ ختم ہوئی تو جنرل صاحب اُٹھ کر میرے پاس آ گئے' خیریت پوچھی' دوسرے بھائیوں کی مصروفیات کے بارے میں کچھ سوال کیے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیغام دیا: "اگر کبھی کوئی کام یا ضرورت ہو تو مجھے بتانا میں سید صاحب کا دلی پالی ٹیکنیک کا شاگرد ہوں۔" اللہ کا شکر ہے کہ ایسی کوئی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ بچپن سے والد نے یہ سبق سکھا رکھا تھا کہ کسی پر دارومدار کرنے کے بجائے مشکل میں اپنے آپ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

ایسے سبق وقتاً فوقتاً اُن سے ہمیں ملتے رہتے تھے۔ کہیں اور بھی میں نے ذکر کیا ہے کہ ہم بھائی بہنوں کو اُن کی ہدایت تھی کہ اگر کوئی شخص آپ سے زیادتی کرے اور آپ جواب میں اُس کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کریں تو دونوں میں کیا فرق رہ جائے گا۔ ایسی صورت میں بہتر جواب" خاموشی "ہوتی ہے۔ خاموشی اور مسکراہٹ انسان کے پاس دو بڑے ہتھیار ہیں۔ مسکراہٹ کئی مسائل کو حل کرتی ہے اور خاموشی کئی مسائل سے بچاتی ہے۔"

خود بھی اس مقولے پر عمل کرتے تھے جس کی وجہ سے بعض لوگ غلط طور پر اُنہیں انتہائی سنجیدہ مزاج سمجھتے تھے حالانکہ اُنہوں نے بے حد شگفتہ مزاج پایا تھا۔ ہنستے مسکراتے

لوگ اُنہیں اچھے لگتے تھے اور خود اُن کے چہرے پر بھی مسکراہٹ ہمیشہ رہتی تھی۔ اُن کی بات چیت اور تحریر میں بھی ایک خاص طرح کی شگفتگی تھی۔

تحریر کے ساتھ ساتھ عام گفتگو اور تقریر میں بھی اُن کا ایک منفرد انداز تھا۔ الفاظ کا چناؤ اور ایک خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار سننے والے کو متاثر کرتا تھا چنانچہ پاکستان ٹیلی وژن اور ریڈیو پاکستان کے پروگراموں میں شرکت کے لیے وہ پسندیدہ ترین انتخاب ہوا کرتے تھے۔ قائداعظم کی رحلت ہوئی تو اُن کے سفرِ آخرت کو ریڈیو پاکستان نے براہِ راست نشر کیا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اِس اہم موقعہ پر رواں تبصرے کے لیے بھی ذوالفقار علی بخاری صاحب کے ساتھ اُن کا انتخاب ہوا تھا۔ اس موقعہ کا آنکھوں دیکھا حال اُنہوں نے چند روز بعد ''ماہِ نو'' کے اکتوبر 1948ء کے شمارے میں بہت محبت سے لکھا۔ یہ مضمون قائداعظم کے آخری سفر کے حوالے سے لکھے جانے والے اولین مضامین میں سے ایک ہے جس میں کچھ ایسی تفصیلات بھی ہیں جن کا ذکر شائد کہیں اور نہیں ملتا:

''صبح ساڑھے سات بجے ریڈیو پاکستان نے اس غم انگیز خبر کا اعلان کیا اور یہ خبر بجلی کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی۔ فوراً شہر کی ساری دوکانیں بند کر دی گئیں اور شہر کے ہر گوشے سے گورنر جنرل ہاؤس کی طرف جانے والی سڑکوں پر لوگوں کی قطاریں نظر آنے لگیں۔ ان قطاروں میں بے جان‘ بے سکت بوڑھے بھی تھے اور کمزور اور ناتواں عورتیں بھی .... ان میں سے ہر ایک اپنے محبوب قائد کی یاد پر آنسوؤں کے موتی نچھاور کرتا، اس کے آخری دیدار کے اشتیاق میں اس طرف جا رہا تھا جہاں انہیں آزادی دلانے والا ان کے حال سے بے خبر ابدی نیند سو رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں یہ قطاریں ہجوم میں بدل

گئیں۔ اور رفتہ رفتہ ہجوم ایک سیلاب میں بدل گیا، جسے کسی کی یاد کی کشش اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے گورنمنٹ ہاؤس کے وسیع و عریض میدانوں کے چپہ چپہ پر۔ اس کے صدر دروازے کے سامنے کی سڑک پر آدمی ہی آدمی اکٹھے ہو گئے۔ قائداعظم کے محبوب جسم کو گورنر ہاؤس کے صدر ہال میں رکھ دیا گیا۔ اور لوگوں کو اس بات کی اجازت دی گئی کہ وہ قطار در قطار اس کے قریب سے گزر کر آخری دیدار کی حسرت پوری کر لیں۔ لوگ ہال میں داخل ہوئے اور ایک کے پیچھے ایک میت کے قریب سے گزرنے لگے۔ میت کا چہرہ کھلا ہوا تھا اور اس کے سکون اور نور کو دیکھ کر صرف یہ خیال ہو سکتا تھا کہ قوم کے غم میں زندہ رہنے والا کام کرتے کرتے تھک کر سو گیا ہے۔

میت کے جلوس کی روانگی کے لئے تین بجے دن کا وقت مقرر کیا گیا تھا۔

تین بجنے سے کچھ پہلے وزیراعظم لیاقت علی خاں، سر محمد ظفر اللہ خان، سردار عبدالرب نشتر، آنریبل جوگندر ناتھ منڈل، پیرزادہ عبدالستار اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے جنازہ کو صدر ہال سے اٹھا کر اپنے کاندھوں پر رکھا، اور ہر زبان نے کلمہ طیبہ کا ورد شروع کر دیا۔

قوم کے اکابر جب اس امانت کو اپنے کاندھوں پر رکھے ہوئے باہر نکلے، جو خدا نے اب دنیا والوں سے واپس لے لی تھی۔ تو باہر کھڑے ہوئے ہزاروں انسانوں کو ضبط کا یارا نہ رہا، اور ہر ایک بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

جنازہ کے دائیں بائیں حکومت کے وزرأ۔ اس کے پیچھے قائداعظم مرحوم کی دل شکستہ بہن محترمہ فاطمہ جناح اور مرحوم کی صاحبزادی مسز واڈیا کی موٹر اور ان کے پیچھے دو لاکھ آدمیوں کا ہجوم یہ سارا جلوس بڑی خاموشی سے سوا تین بجے کے قریب گورنر جنرل ہاؤس کے صدر دروازے سے روانہ ہوا۔

سوگواروں میں ہر عمر، ہر جنس، ہر طبقہ اور ہر ملت کے لوگ شامل تھے، عورتیں، مرد، بچے بوڑھے غریب سے غریب اور امیر سے امیر، مسلمان، ہندو، یہودی، عیسائی اور پارسی اور سب کے دل قوم کے اس عظیم غم کو اپنا غم سمجھ رہے تھے۔ ہر دل سوگوار تھا اور ہر آنکھ اشکبار۔

مولانا شبیر احمد عثمانی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اور اس کے بعد ایک تقریر فرمائی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ قائداعظم رحلت فرما گئے لیکن جس قوم کو ان کی ذات نے منظم و مرتب کیا ہے وہ زندہ ہے اور انشاء اللہ اسی طرح زندہ رہے گی۔ مولانا کی تقریر ختم ہوئی تو لوگ جنازے کو مدفن کی طرف لے چلے۔ وہ جگہ یہاں سے کوئی ایک فرلانگ آگے اس اونچے ٹیلے پر تھی۔ جو قائداعظم نے کراچی کی جامع مسجد کے لئے منتخب فرمایا تھا۔

چھ بج کر چوبیس منٹ پر جناب لیاقت علی خاں، سر ظفر اللہ خان، سردار عبدالرب نشتر، پیر الٰہی بخش اور سیٹھ یوسف ہارون نے اپنے مرحوم رہنما کے جسم کو قبر میں اتار کر آخری خدمت سرانجام دی۔ قبر کے منہ کو پتھروں سے ڈھکا گیا اور لیاقت علی خاں صاحب نے کلمہ طیبہ کے ورد کے ساتھ مٹھی بھر مٹی آہستگی سے قبر کے پتھروں پر ڈال دی۔ اس کے بعد دوسرے وزراء اور سفراء نے یہ آخری رسم ادا کی۔ اور تھوڑی سی دیر میں ایک نازک جسم پر منوں مٹی کے انبار لگ گئے۔ مٹی پر پانی چھڑکا گیا۔ پھول چڑھائے گئے۔ عود اور اگر سلگایا اور لاکھوں آدمیوں نے ایک ساتھ ہاتھ اٹھا کر قائداعظم کی مغفرت کے لئے دعا کی۔”

نصابی سرگرمیوں کے حوالے سے معلم ہونے کے باوجود بابا نے ہم بھائی بہنوں کو اپنی خواہش کا پابند نہیں کیا۔ سب نے اپنی مرضی کے مطابق تعلیم حاصل کی اور ماشاءاللہ اپنے اپنے میدان میں خوب کامیاب رہے۔ کبھی کبھی ہماری ضرورت کی صورت میں پڑھائی میں مدد البتہ دیتے تھے اور سوال چاہے وہ حساب کا ہو یا کسی اور مشکل مضمون کا کچھ

اس طرح سے سمجھاتے تھے کہ آئندہ بھولنے یا غلط طریقے سے حل کرنے کا امکان نہیں رہتا تھا۔

انسانی سطح پر انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں کا بہت خیال رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے بچپن میں ہمارے بال تراشنے ایک حجام فرید صاحب آیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ بال کاٹنے آئے تو سبھی بھائیوں نے یہ کہہ کر بال کٹوانے سے انکار کر دیا کہ ہمارے بال ابھی بہت چھوٹے چھوٹے ہیں اور انہیں کٹوانے کی ضرورت نہیں۔ فرید صاحب ہمیں پکڑنے کی کوشش کرتے رہے اور ہم اِدھر اُدھر بھاگتے چھپتے رہے۔ بابا نے دیکھا تو میرے لیے حکم ہوا: ''جاؤ بیٹا تم بال کٹوا لو۔'' میں نے کہا: ''آج رہنے دیں۔ اگلے ہفتے کٹوا لیں گے۔'' جواب تھا: ''کوئی بات نہیں بیٹا، آج ہی کٹوا لو۔ فرید کو پیسوں کی ضرورت ہوگی۔'' اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عام زندگی میں اِنسان اور انسانیت کے احترام کی اُن کی نظر میں کتنی اہمیت تھی۔ ایک خط میں اُنہوں نے کسی کو لکھا تھا: ''ہم نے بحیثیت انسان، انسان کے ساتھ مساوات کا وہ رشتہ منقطع کر لیا ہے جو انسانیت کی بقا کی بنیادی شرط ہے۔ آپ ابھی نوجوان ہیں اور زندگی کے وہ مرحلے جن میں آدمی کو آدمی سے سابقہ پڑتا ہے آپ کے سامنے نہیں آئے۔ خدا آپ کو آزمائش کے اِن مرحلوں سے کامیاب و کامران گزرنے کی توفیق دے لیکن اِن مرحلوں سے گزرتے ہوئے یہ بات برابر یاد رکھیے کہ آدمی کا سب سے بڑا معاشرتی فریضہ یہ ہے کہ آدمی سے محبت کرے اور اُس کو محترم جانے:

آدمیت احترام آدمی

ہمارے گھر میں دھوبی نذیر صاحب، مالی خدا بخش، ڈرائیور چاچا عزیز کو گھر کے ایک فرد کی حیثیت حاصل تھی۔ تینوں ہم سے بڑے تھے اس لیے ہمیں ہر بات میں روکنے ٹوکنے کا حق رکھتے تھے۔ اِسی طرح گھر میں ہونے والی مرمتوں اور گھر کی عمارت میں

اضافے کا کام دو مستریوں کے ذمہ ہوتا تھا' مولوی صاحب اور حاجی صاحب۔ دونوں اپنے فن میں یکتا۔ اُن کے معاملات میں بھی ہم میں سے کسی کو مداخلت کی بابا کی طرف سے اجازت نہیں تھی۔ مجھے یاد ہے ہمارے گھر کی اوپری منزل میں دو کمروں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ اُس زمانے میں آرکیٹکٹ تو ہوتے نہیں تھے اس لیے مولوی صاحب سب معاملات کے نگران تھے۔ محلے میں ایک اوورسیر رہتے تھے جو اپنی محبت میں اپنی فرصت اور چھٹی کے وقت میں آ کر مولوی صاحب کا کام دیکھتے رہتے تھے۔ ایک دن وہ آئے تو اُنہوں نے کام میں کوئی نقص نکال کر مولوی صاحب کو کوئی مشورہ دے دیا جو اُن کی نظر میں تکنیکی اعتبار سے بہتر تھا۔ مولوی صاحب کو اپنے کام میں اُن کی مداخلت پسند نہیں آئی۔ دونوں میں بحث چھڑ گئی' کام رُک گیا۔ جھگڑے کی آواز بابا تک پہنچی تو وہ بھی آ گئے۔ وجہ پوچھی تو اوورسیر صاحب نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ وہ عمارت کی مضبوطی کے لیے کیا مشورے دے رہے تھے۔ مولوی صاحب چپ رہے۔ بابا نے اُن سے پوچھا: ''کیوں مولوی صاحب آپ کا کیا خیال ہے؟'' تو مولوی صاحب نے غصے میں اوورسیر صاحب کی طرف گھورتے ہوئے جواب دیا: ''یہ آج مجھے سمجھانے آ گئے ہیں۔ شاہ جی اِن سے پوچھیں۔ تاج محل اِن کے بڑوں نے بنایا تھا یا میرے بڑوں نے۔'' بابا ہنس دیئے اُنہوں نے مولوی صاحب کو کام جاری رکھنے کا اشارہ دیا اور اوورسیر صاحب کو اپنے ساتھ چائے پلانے کے لیے گھر لے آئے۔

روزانہ دفتر صبح میرے ساتھ جاتے تھے۔ گیارہ نومبر 1976ء کی صبح ہم حسب معمول ساتھ ساتھ نکلے تو اُنہوں نے کہا: ''آج کچھ طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔ ایک مختصر سی میٹنگ ہے میں وہاں ہو کر ڈاکٹر صفدر بخاری کو دکھاتا ہوا گھر جاؤں گا۔ تمہیں تمہارے دفتر پہلے اُتار

CS CamScanner

دیتے ہیں۔ میں نے ساتھ چلنے کو کہا تو کہنے لگے: ''ایسا کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ چاچا عزیز میرے ساتھ ہیں، تم فکر مت کرو۔'' میں دفتر میں اُتر گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر صاحب کا فون آ گیا: ''میں وقار صاحب کو فیملی ہسپتال لے جانا چاہتا ہوں، چیک اپ ہو جائے گا اور کچھ ٹیسٹ ہیں وہ بھی ہو جائیں گے۔'' میں نے کہا: ''میں آ رہا ہوں میرا انتظار کیجیے۔'' دس منٹ میں میں ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ بابا گاڑی میں تیار بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے: ''پریشانی کو کوئی بات نہیں ہے، اچھا ہے دو چار دن ہسپتال میں آرام مل جائے گا اور مرض کی تشخیص بھی ہو جائے گی۔ پہلے گھر چلو میں کچھ ضروری سامان لے لوں، اقبال پر کچھ کام کر رہا ہوں اس کے کاغذات اور جانچنے کے لیے آئی ہوئی کچھ امتحانی کاپیاں ساتھ رکھ لوں گا۔ یہ کام تو ہسپتال میں بھی ہو جائے گا۔'' ہم گھر روانہ ہو گئے گھر پہنچ کر میں نے سوٹ کیس میں اُن کے لیے ضروری کپڑے رکھے۔ بابا نے کتابیں اور کاپیاں سنبھالیں، ایک پیالی چائے پی۔ آپا پریشان ہو رہی تھیں اُنھیں سمجھایا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں اور ہسپتال کے لیے روانہ ہو گئے۔ دو تین دن فیملی ہسپتال میں رہے جہاں اُنھیں Jaundice کی تکلیف ہو گئی اور ہم لوگوں نے اُنھیں انتظار حسین صاحب اور بابا کے دوسرے دوستوں کے مشورے سے جیل روڈ پر ہاجرہ میموریل کلینک میں شفٹ کر دیا۔ یہاں پہنچ کر Jaundice کی تکلیف میں شدت آ گئی۔ چودہ نومبر کی صبح ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ اُن کا مکمل خون تبدیل کر دیا جائے۔ اتوار کا دن تھا، ٹی وی پر ایک پاکستانی فلم دکھائی جا رہی تھی اُسی کے دوران زمان علی خان صاحب نے جو اُن دنوں لاہور ٹیلی وژن کے جنرل مینیجر تھے اور خود بھی بابا سے بہت محبت کرتے تھے اُن کی بیماری اور خون کی ضرورت کے حوالے سے خبر نشر کروا دی۔

کچھ ہی دیر میں خون دینے کے لیے ہسپتال آنے والے لوگوں کی لمبی لمبی

قطاریں لگ گئیں۔ اُن میں بابا کے شاگرد بھی تھے، صحافی، ادیب اور شاعر بھی، ٹیلی وژن کے فنکار بھی اور عام شہری بھی اُن میں خواتین بھی تھیں اور بوڑھے بھی۔ سب بے چین، مضطرب اور بیشتر آبدیدہ۔ ہسپتال کی انتظامیہ کے لیے اتنے لوگوں کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا اس لیے اُن کی طرف سے بار بار اعلان کروایا جا رہا تھا کہ ہمیں حسبِ ضرورت خون مل گیا ہے مزید خون کی ضرورت نہیں لیکن کوئی خون دیئے بغیر واپس جانے کو تیار نہ تھا۔ ایک کونے میں ڈاکٹر جہانگیر خان صاحب کھڑے تھے، مجھے دیکھا تو قریب آ گئے: ''بیٹا میں کافی دیر سے تم بچوں کی تلاش میں تھا۔ ماجد خان کی بیوی میری بہو میرے ساتھ ہے۔ اُس کا بلڈ گروپ وہی ہے جو تمہارے ابا کا ہے ہمارا فون نمبر لے لو، اِس وقت تو خون کی مزید ضرورت نہیں ہے۔ کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں ہمیں فون کرنا۔ ہمارا گھر قریب ہی ہے ہم دس منٹ میں پہنچ جائیں گے۔'' پھر اُن کے مشورے پر دوسرے لوگوں کے بھی ٹیلی فون نمبر اور پتے نوٹ کر لیے گئے تاکہ بوقتِ ضرورت اُن سے رابطہ کیا جا سکے۔ پہلے دن خون بدلنے کے بعد طبیعت میں کچھ بہتری آ گئی۔ ڈاکٹروں نے اطمینان دلایا لیکن دوسرے ہی روز طبیعت پھر خراب ہو گئی اور رفتہ رفتہ مزید بگڑتی چلی گئی۔ 17 نومبر 1976 کو شام سات بج کر تینتیس منٹ پر چھیاسٹھ برس کی عمر میں بابا کا انتقال ہو گیا۔ آج اس بات کو چالیس سال ہونے کو آئے ہیں لیکن ایسا لگتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔ اُن کی یادوں نے، اُن کے چاہنے والوں اور دوستوں نے اور بابا کی تحریروں نے کبھی احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ ہم میں نہیں۔ احسان دانش صاحب نے میرے چچا اقبال عظیم صاحب کی فرمائش پر نوحہ لکھا جس کے آخری مصرعے سے بابا کی عمر اور ہجری سنہِ وفات 1397 نکلتا ہے

آبدیدہ ہوئے خبر پا کر
جن میں تھا فطرتاً مذاقِ سلیم
منہ سے نکلا خدا اسے بخشے
اپنے الطاف سے بہشتِ نعیم
دانش' اقبال نے کہا رو کر
لکھیے اِک 'نوحۂ وقار عظیم

بچوں کے لیے دو چیزیں بہت اہم ہوتی ہیں۔ ماں کی محبت اور دعائیں اور باپ کی شفقت۔ ہم بہن بھائی خوش قسمت ہیں کہ ہمارے ماں باپ نے ہمیں بھرپور محبت اور شفقت دی۔ ماں کی دعائیں ہمیشہ شاملِ حال رہیں اور باپ نے بچوں کی خوشی اور اُن کے آسودہ مستقبل کے لیے اپنے آرام کا کبھی خیال نہیں رکھا۔ افسوس ہے تو صرف یہ کہ جب ہم کسی قابل ہوئے اور اُن کے آرام کا وقت آیا تو اُنہوں نے بہت جلدی جلدی میں دوسری دنیا کا سفر اختیار کرلیا۔

''پدرم سلطان بود'' کتاب کا میں نے یہ نام تجویز کیا تو کشور آپا (کشور ناہید) نے محاورے کے منفی معنوں کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کوئی اور نام سوچنے کا مشورہ دیا۔ فرہاد زیدی صاحب نے کہا: ''اس سے اچھا نام ہو ہی نہیں سکتا۔'' پروفیسر فتح محمد ملک صاحب نے کہا: ''کتاب کا عنوان ایسا ہونا چاہیے کہ وہ آپ کو اپنی طرف فوری متوجہ کرے۔ میری رائے اِس نام کے حق میں ہے۔'' افتخار عارف صاحب نے یہ کہہ کر بات ختم کردی: ''اس میں کیا شک ہے کہ وہ اپنے میدان کے سلطان تھے۔ محاورے میں کوئی برائی نہیں۔ یوں بھی تم اِسے Tribute کے طور پر استعمال کر رہے ہو۔ دوسرا نام سوچو بھی نہیں۔ کتاب کا یہی نام ہونا چاہیے۔'' چنانچہ یہی نام طے ہوگیا۔ کتاب میں جن لوگوں کے مضامین شامل ہیں اُن کے لیے میں شکرگزار ہوں' سعید اختر صاحب کا خصوصی شکریہ جن کی بنائی ہوئی تصویر ٹائٹل کی زینت ہے۔

CS CamScanner

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

آپ بیتی [1]

پروفیسر سید وقار عظیم

وقار عظیم۔ نام میرا تاریخی ہے۔ میری تاریخِ پیدائش دسمبر 1910ء (1327ھ) کی ہے لیکن اسکول میں داخلے کے وقت جن صاحب نے میرا داخلہ کرایا اُنہوں نے دسمبر 1910ء کے بجائے اگست 1910ء لکھوا دی، تو اس طرح صحیح تاریخِ ولادت کچھ بھی سہی، لیکن دستاویزات میں پندرہ اگست 1910ء رہی اور اسی کو میں اب صحیح تاریخِ ولادت سمجھتا ہوں.... میری پیدائش الٰہ آباد کی ہے۔ ہمارا اصل وطن انبیٹھہ ہے جو کہ گنگو کے قریب ایک قصبہ ہے۔ ننہال میرٹھ کی ہے۔ والد صاحب پولیس میں ملازم تھے۔ جب الٰہ آباد سے اُن کا تبادلہ کان پور ہوا تو میں پانچ چھ سال کا تھا۔ اسکول کی تعلیم کا آغاز کان پور ہی سے ہوا۔ اس سے پہلے گھر پر پڑھتا تھا۔ کچھ تو والدہ مرحومہ پڑھاتیں پھر مجھے ایک پنڈت جی نے پڑھانا شروع کیا۔ جنہیں لوگ عام طور سے پٹواری جی کہا کرتے تھے اور جو ٹیوشن کیا کرتے تھے۔ شروع شروع میں تو وہ بس گھر پر پڑھا دیتے، پھر مجھ سے اتنے مانوس ہوئے کہ جہاں بھی پڑھانے جاتے مجھے اپنے ساتھ لے جاتے۔ اُن کا زیادہ زور حساب پر

---

[1] اس حوالے سے کوئی باقاعدہ تحریر موجود نہیں۔ یہ سرگزشت ریڈیو پاکستان کی نشریات، اخباروں اور رسائل میں چھپنے والے مضامین، مکالموں اور انٹرویوز کے اقتباسات پر مشتمل ہے۔

CS CamScanner

ہوتا۔ حساب کی ایک مشہور کتاب تھی ''چکرورتی'' اسی سے سوال کروایا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا تو وہ مجھے نویں دسویں کے طلبہ کے ساتھ بٹھا کر سوال حل کرنے کو دیتے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ میں سوال حل کر لیتا مگر نویں دسویں کے طلبہ نہ نکال سکتے۔ پنڈت جی اُردو نہیں جانتے تھے۔ ہندی ہی میں سوال کرواتے اور اسی ضرورت سے مجھے بھی ہندی سکھائی۔ چنانچہ ہندی زبان سے میری دلچسپی اسی ابتدائی تربیت کا نتیجہ ہے اور یہ دلچسپی اب بھی قائم ہے۔ فرصت ملے تو ہندی کی کتابیں اب بھی پڑھ لیتا ہوں۔ ابتدائی عمر میں جیسا اُستاد مل جائے، ذہن پر اس کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ ہر چند یہ بات اب سے کئی سال پہلے کی ہے مگر ان کے کرائے ہوئے سوال مجھے ابھی تک اچھی طرح یاد ہیں۔ اس طرح کے سوالوں کا جواب زبانی نکال لیتا ہوں۔

گھر پر والدہ صاحبہ اُردو، دینیات اور کلام پاک پڑھاتی تھیں۔ فارسی کی ایک کتاب بھی اُن سے پڑھی۔ انگریزی وہ نہیں جانتی تھیں۔ میرے والد بزرگوار سید مقبول عظیم پولیس میں ملازم تھے۔ انھیں اپنے سرکاری کاموں سے بہت کم فرصت ملتی تھی۔ وہ کبھی کبھی پڑھائی کے معاملے میں بس پوچھ لیا کرتے تھے۔ البتہ ایک بات قابل ذکر ہے کہ وہ شعر کہتے تھے۔ عرش تخلص کرتے تھے۔ نعت گوئی سے خاص طور سے دلچسپی تھی۔ بڑی اچھی نعتیں کہتے تھے۔[1]

---

[1] اُن کی ایک غزل کا یہ شعر نیاز فتح پوری نے ''نگار'' کے ایک شمارے میں لکھنؤ کے اساتذۂ سخن کے نمونۂ کلام میں شامل کیا تھا:

دو آنسو بہہ گئے تو ہوئی درد میں کمی
رونے کا ورنہ شوق نہیں چارہ گر مجھے

(اعجاز الحق قدوسی میری زندگی کے 75 سال)

اُن کے دوست احباب آ کر بیٹھتے، محفل جمتی اور ہم بھی وہاں جا بیٹھتے۔ والد صاحب یوں تو پولیس کے آدمی تھے مگر ان میں پولیس والوں جیسی شائد ہی کوئی عادت پائی جاتی تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ زندگی میں اکثر لوگوں کو کس طرح فقط پیٹ کی خاطر اپنے مزاج کے خلاف کوئی دوسرا کام کرنا پڑتا ہے اور عمرِ عزیز اسی طرح گزر جاتی ہے۔ والد صاحب بیان یزدانی میرٹھی کے شاگرد تھے۔ بیان صاحب نعت اور غزل خوب کہتے تھے۔ والد صاحب بھی اُن سے اِن ہی دو صنفوں میں مشورے لیتے تھے۔

اسی طرح میرے نانا صاحب اور دو ماموں صاحبان بھی شعر کہتے تھے۔ نانا صاحب کا تخلص ادیب تھا اور وہ غزل داغ کے رنگ میں کہتے تھے۔ بڑے ماموں لبیب اور چھوٹے ماموں طبیب تخلص کرتے تھے۔

گھر میں اُردو اور فارسی کے مشہور شعرا کے دیوان موجود تھے۔ کتابوں سے الماریاں بھری ہوئی تھیں اور گھر میں کئی قسم کے رسالے آتے تھے جنہیں الٹنے پلٹنے کا مجھے بہت موقع ملتا رہتا تھا۔ دراصل ہمارے گھر کا ماحول ہی کچھ اس قسم کا تھا کہ اگر میری جگہ دوسرا بچہ ہوتا تو وہ بھی اس سے یقیناً متاثر ہوتا اور میری طرح اسے بھی لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہو جاتا۔

چھٹی جماعت تک میں نے کان پور کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد والد صاحب کا تبادلہ اُناؤ ہوگیا۔ یہ 1919ء کا ذکر ہے۔ اس وقت میری عمر کوئی نو برس کی ہوگی۔ اُناؤ، کانپور سے کوئی گیارہ بارہ میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ یہ لکھنؤ اور کانپور کے درمیان واقع ہے۔ حسرت

موہانی کا قصبہ موہان اسی ضلع کی تحصیل ہے۔ ریل دن بھر چلتی ہے۔ دن میں کوئی آٹھ گاڑیاں لکھنؤ جاتی اور واپس آتی ہیں۔ یہ سب اُناؤ سے ہو کر گزرتی ہیں۔ تو اُناؤ کا کانپور اور لکھنؤ سے بڑا گہرا رابطہ ہے۔ کانپور کا مزاج ہے بالکل کاروباری۔ وہاں کارخانے ہیں اور مزدوروں کی زندگی۔ لکھنؤ کا مزاج خالصتاً علمی، ادبی اور تہذیبی ہے۔ اس کا اُناؤ پر اثر پڑا تو یہ ایک ملی جلی معاشرت کا نمونہ چھوٹا سا شہر ہے۔

والد صاحب کے زیادہ تر دوست بھی صاحب ذوق تھے۔ اُناؤ میں بھی اُنہوں نے ایسے دوست ڈھونڈ نکالے۔ اُناؤ میں ان دنوں یوں تو کئی شاعر تھے مگر ان میں سے چار شاعر خصوصاً مشہور تھے۔ نواب جعفر علی خان اثر، جگت موہن لال رواں، رضی بدایونی اور فرخ بنارسی۔ ایک مادھولال مست تھے۔ واقعی مست اور مجذوب۔ اُن کا ایک شعر مجھے یاد آرہا ہے:

وہ لحد میں بُوئے مے تھی کہ نہ آسکے فرشتے

میں عذاب میں پھنسا تھا جو نہ بادہ خوار ہوتا

تو یہ غیر معروف شاعر وہاں اس طرح کے تھے جو اتنے اچھے شعر کہہ سکتے تھے۔ شعر و شاعری کا بڑا اچھا ماحول تھا۔ یہ حضرات اکثر والد صاحب کے پاس آتے اور شعر و سخن کی طویل محفلیں گرم ہوتیں۔ میں پان یا کوئی دوسری چیز دینے کی خاطر کمرے میں آتا تو ایک آدھ شعر میرے کان میں بھی پڑ جاتا جو اکثر مجھے یاد ہو جایا کرتا۔ بعد میں والد صاحب مجھے دیدہ دانستہ ایسی محفلوں میں بٹھانے لگے کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ ایسی محفلیں بچوں کی تربیت کے لیے بڑی مفید ہوتی ہیں۔

اچھے شاعروں کے قریب جا کر، اُن کی زندگی کے طور طریق دیکھ کر یہ

CS CamScanner

خیال ہوا کہ اُن ہی کی سی زندگی بسر کرنی چاہیے۔ شعر اس طرح سے گویا شخصیت کا ایک جزو بن گیا اور میں سمجھنے لگا کہ شعر حقیقت میں ہماری تہذیبی زندگی کی ایک خاص بنیاد ہے۔ اس سے الگ اور اس سے قطع نظر مذہب کا ایک تصور تھا جو گھر سے لیا۔ تو مذہب اور شعر دو چیزیں ہیں جو زندگی میں ہر قدم پر ساتھ رہیں۔

1923ء میں' میں اناؤ کے گورنمنٹ ہائی سکول کی ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ جہاں ہمارے ایک اُستاد مولوی انوارالحق ہوا کرتے تھے جو ہمیں فارسی پڑھاتے تھے۔ وہ بچوں کو فارسی اس رغبت سے پڑھاتے کہ اُن میں ادب کا شوق پیدا ہو جاتا۔ ان دنوں ہمارے نصاب میں ''گلستان'' کی فقط چند حکایتیں تھیں لیکن مولوی صاحب نے فارسی کا کچھ ایسا چسکا ڈال دیا کہ میں نے یہ ساری کتاب گھر پر ختم کر ڈالی۔ ہمارے اُردو کے استاد بھی بہت اچھے تھے۔ نام اُن کا اب ذہن میں نہیں رہا وہ پڑھانے کے دوران میں اشعار کا حوالہ دیتے جاتے اُن کی بدولت مجھے میر اور غالب کی کئی غزلیں ازبر ہوگئیں اور خود شعر کہنے کا شوق بھی پیدا ہو گیا۔

وہ شعر کیا تھے بس تک بندی ہوتی تھی مثلاً ہمارے ایک دوست حشمت علی ہوتے تھے ایک دفعہ ہم نے ان پر ایک مصرع کہا۔ ایک اس لیے کہ دوسرا مصرع مرزا غالب کا ہے۔ ہاں تو وہ تھا:

جان لیوا ہیں ناز حشمت کے
موت آتی ہے پر نہیں آتی

اسی طرح ہمارے ایک اور دوست تھے جو خاصے خوب صورت تھے۔

ایک دفعہ ان کی ایک تصویر چوری ہوگئی، جس سے متاثر ہو کر میں نے پھر ایک

مصرع لکھا۔ اس مرتبہ بھی ایک ہی مصرع کیونکہ دوسرا مصرع ایک مشہور غزل کے شعر کا ہے، وہ یوں تھا کہ:

ہوتی ہے اُناؤ میں، تصویر کی چوری بہت
اسی لیے تصویر جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں

بس اسی قسم کا اوٹ پٹانگ سلسلہ ہوا کرتا تھا۔ شعر گوئی باقاعدہ میں نے کبھی نہیں کی۔ البتہ اسکول میں مشاعروں کے لیے اکثر غزلیں کہتا تھا۔

ان دنوں آٹھویں جماعت کے لیے وظیفے کا امتحان ہوا کرتا تھا اس میں پورے صوبے کے طلبہ شریک ہوتے تھے۔ میں بھی اس میں بیٹھا اور مجھے بھی وظیفہ مل گیا۔ میں نے وظیفہ لیا تو مولوی صاحب انوار الحق نے کہا کہ میں وظیفے کی رقم میں سے ہر ماہ چند کتابیں خرید لیا کروں۔ درسی کتب کے علاوہ نئی کتابیں پڑھنے کا شوق تب ہی پیدا ہوا۔ یہ زمانہ 1926ء کا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ نویں جماعت میں جب مجھے وظیفہ ملا تو پہلے وظیفے کی رقم (پچیس روپے) والد صاحب نے مجھے دی تاکہ میں اپنی پسند کی کتابیں خرید سکوں چنانچہ میں نے بڑے اشتیاق سے صفدر میرزاپوری کے مرتب ''ادیبوں کے خطوط کا مجموعہ'' اُن ہی کا مرتب کردہ ''ادبی لطائف کا مجموعہ'' ''مسدس حالی'' یہ سب کتابیں خرید لیں۔ جو دوسری تین چار کتابیں خریدیں ان میں سے ایک ''آب حیات'' بھی تھی۔ یہ کسی صاحب سے پوچھ کر یا مشورہ کر کے نہیں خریدی تھیں بلکہ یونہی اپنی مرضی سے۔ آزاد کی ''نیرنگ خیال'' اور ''دیوان غالب'' بھی پہلی قسط میں خریدی ہوئی کتابوں میں شامل تھا۔ ان کے علاوہ سوئیل سمائیلز کی دو انگریزی کتب Self Help اور Duty اپنے انگریزی

کے اُستاد کے مشورے سے خریدیں۔ یوں مولوی صاحب انوار الحق کی نصیحت کے مطابق ہر ماہ کتابیں خریدنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد کتابوں کے خریدنے کی مستقل عادت سی پڑ گئی۔ جب پیسے ملتے اردو کے اساتذہ سے مشورہ کر کے کتابیں خرید لیتا۔ نویں دسویں جماعت میں میں نے ستر اسی کتب پر مشتمل اپنی ایک ذاتی لائبریری بنالی۔ ان میں زیادہ تر شاعری اور تنقید کی کتابیں اور شرر اور ڈپٹی نذیر احمد اور پریم چند کے ناول وغیرہ تھے۔

اُناؤ میں ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی۔ مسلمان جاگیردارانہ تہذیب میں رچے ہوئے تھے۔ امیروں اور رئیسوں نے تعلیم کی طرف اتنی توجہ نہیں دی جتنی ہندوؤں نے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے محسوس کیا کہ ہمیں کچھ کرنا چاہیے، اپنی تہذیبی روایات کو محفوظ رکھنا چاہیے۔ اسی طرح نوجوانوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ اپنی ایک تنظیم قائم کرنا چاہیے تو ہم نے ایک تنظیم بنائی۔ ایک چھوٹی سی لائبریری قائم کی۔ گھروں گھروں گئے وہاں سے کتابیں جمع کیں۔ انہیں جمع کرتے تھے تو پڑھتے بھی تھے۔ اس لائبریری نے میرے اندر لکھنے پڑھنے کے شوق کو ہوا دی۔

اُناؤ میں ہمارے اسکول کا رسالہ بھی نکلتا تھا۔ میں اس میں لکھتا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ اناؤ سے ایک ہفت روزہ اخبار ''آفتاب'' شائع ہوتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر ہمارے ہمسائے تھے۔ مجھے پڑھنے لکھنے کا شروع سے بہت شوق تھا۔ اس لیے وہ مجھ سے بہت محبت سے پیش آتے تھے۔ ایک دفعہ پاس ہی کے قصبہ صفی پور میں عرس کے موقعہ پر مشاعرہ ہوا۔ میں بھی والد صاحب کے ساتھ اس میں شریک ہوا۔ واپسی پر ''آفتاب'' کے ایڈیٹر صاحب نے مجھ سے اس مشاعرے کی روداد لکھنے کو

کہا۔ میں نے یہ لکھ دی۔ یہی روداد میرا پہلا مضمون ہے جو میں نے اسکول کے رسالے سے الگ کسی باہر کے اخبار کے لیے لکھا۔ یہ 1929ء کا ذکر ہے۔

اناؤ سے میٹرک کرنے کے بعد میں لکھنؤ چلا گیا اور وہاں گورنمنٹ جوبلی انٹرمیڈیٹ کالج میں داخل ہوگیا جس کی عمارت کے بارے میں آتش کا شعر ہے:

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے
زمیں یاں کی چہارم آسماں ہے

یہاں مجھے حامد اللہ افسر، علی عباس حسینی، اختر علی تاہری اور مولوی محمد حسین جیسے بلند مرتبت اساتذہ سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ اول الذکر تین حضرات ہمارے اُردو کے پروفیسر تھے اور مولوی صاحب ہمیں فارسی پڑھاتے تھے۔ اُنہیں فارسی کی کتابیں ازبر تھیں۔ جس کے باعث اُنہوں نے کبھی ہمیں کتاب سے نہ پڑھایا۔ انھیں فارسی قواعد پر بہت عبور تھا ان کی پڑھائی ہوئی باتیں کل کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک ایک چیز اب تک ذہن میں محفوظ ہے۔ حامد اللہ افسر صاحب کی شاعری اور تنقید نے بہت متاثر کیا اور وہیں سے تنقید لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ان دنوں علی عباس حسینی صاحب ''ناول کی تاریخ اور تنقید'' لکھ رہے تھے۔ ان کے بھانجے توقیر ہمارے ہم جماعت تھے جن کی وساطت سے ہم اکثر حسینی صاحب کے گھر جایا کرتے۔ وہ اپنی اس کتاب کے باب ہمیں پڑھ کر سناتے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے اکثر باتیں اس وقت ہمارے سر پر سے گزر جاتیں مگر ان کی اس کتاب میں جا بجا انگریزی ناولوں کے حوالے تھے جن کے باعث مجھے انگریزی

ناول پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔

اُنہی دنوں علی عباس حسینی صاحب نے اپنے دو ایک افسانے بھی سُنائے جنہیں سُن کر احساس ہوا یہ پریم چند کے افسانوں سے ملتے جلتے ہیں۔ میں اس زمانے میں نیاز فتح پوری کا رسالہ ’’نگار‘‘ بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ حامد اللہ افسر کی کتابیں پڑھنے کا اتفاق بھی ہوا۔ خصوصاً ان کے افسانوں کا مجموعہ ’’ڈالی کا جوگ‘‘ جسے پڑھ کر معلوم ہوا کہ وہ پریم چند اور علی عباس حسینی سے کچھ مختلف ہیں، کیوں کہ حامد صاحب کے افسانے مسلمانوں کے متوسط طبقے کی نمائندگی کرتے تھے اور پریم چند دیہات کے متعلق لکھا کرتے تھے۔

1930ء میں میں نے خود ایک افسانہ لکھا جس کا نام تھا ’’پریم رس۔‘‘ ہوا یہ کہ اس زمانے میں علی عباس حسینی صاحب کے ایک دوسرے بھانجے نے ’’ادب‘‘ نام کا ایک رسالہ نکالا اُنہوں نے اس کے پہلے شمارے کے لیے مجھے کچھ لکھنے کو کہا۔ میں نے اُنہیں ایک افسانہ لکھ کر دیا جس کا نام تھا ’’جو میں ایسا جانتی‘‘ یہ افسانہ خاصا پسند کیا گیا۔ ’’پریم رس‘‘ بھی ادب لکھنؤ میں شائع ہوا۔ اس کے بعد میں نے مزید دس بارہ افسانے لکھے جو اس وقت کے مشہور جرائد مثلاً ساقی، نیرنگ خیال، اور عالمگیر میں شائع ہوئے لیکن 1933ء کے شروع میں جب ایم اے میں داخلہ لیا تو افسانہ لکھنا میں نے ترک کر دیا اور تنقید کی طرف توجہ زیادہ ہو گئی۔

ہم چار پانچ طلبہ جنہیں اُردو کا ذوق تھا اور ہاسٹل میں رہتے تھے، لکھنؤ کے ہر مشاعرے میں جا پہنچتے۔ پھر اس زمانے کے لکھنؤ کے مشاعرے بھی ایسے تھے کہ

بعض تو مسلسل تین تین دن تک جاری رہتے۔ ان میں ہندوستان بھر کے شعرا شریک ہوتے۔ ان سے ہمیں لکھنؤ کی علمی و ادبی زندگی سے واقفیت حاصل ہوتی۔

بی اے کرنے کے لیے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخل ہوا تو اور بھی اچھے اُستادوں سے سابقہ پڑا۔ مسعود حسن رضوی ادیب سے کسب فیض کیا۔ مسعود صاحب خصوصیت سے ''مقدمہ شعروشاعری'' پڑھایا کرتے تھے اور حق تو یہ ہے کہ بہت اچھا پڑھاتے تھے۔ ''مقدمہ'' کے علاوہ مسعود صاحب کی کتاب ''ہماری شاعری'' خریدی جسے پڑھ کر یہ شعور پیدا ہوا کہ نقاد کا ہر خیال حرف آخر نہیں ہوتا بلکہ اس میں اختلاف کی گنجائش رہتی ہے۔ ''کاشف الحقائق'' مسعود صاحب کے کہنے پر پڑھی۔ چوں کہ بی اے میں فارسی لے رکھی تھی اس لیے گلستان سعدی، دیوان حافظ کے مطالعے کا موقع ملا۔ ہمیں سودا کا قصیدہ لامیہ اتنی اچھی طرح پڑھایا گیا کہ فارسی کے بڑے بڑے قصیدہ گو شاعروں کو پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ مولوی محمد حسین صاحب کے پڑھانے کا انداز بھی بہت دل پذیر تھا۔

انگریزی میں ڈاکٹر سریشتا جیسی قابل ہستیوں کے نادر خیالات نے ذہن کے کئی تاریک گوشوں کو منور کیا۔ یہ حضرات نصاب کے علاوہ اور بھی بہت کچھ بتاتے تھے۔ شیکسپیئر سے لگاؤ انھی کے فیضان طبع کا نتیجہ ہے۔ بی اے میں ہمارے اُستاد مسٹر سریشتا نے ہمیں شیکسپیئر کے دو ڈرامے ''بارہویں رات'' اور ''اتھیلو'' پڑھائے جو ہمارے نصاب میں شامل تھے۔ سر والٹر اسکاٹ کا ''آئیون ہو'' نصاب میں پڑھا۔ ڈکنز کے ناولوں کی طرف توجہ ہوئی۔ ''سیاسیات'' بھی چونکہ لے رکھی تھی اس لیے اس سے دل چسپی بھی برابر قائم رہی اور پھر ہماری یونیورسٹی کی لائبریری بے حد

خوبصورت تھی اتنی خوبصورت کہ وہاں خود بخود بیٹھنے کو جی چاہتا تھا۔ میں فرصت کے اوقات میں اکثر وہاں بیٹھتا اور یہ سارا وقت مطالعہ میں صرف کرتا جس سے پڑھنے کے شوق کی تربیت پروان چڑھتی چلی گئی۔

بی اے کرنے کے بعد 1933ء میں ایم اے (اُردو) میں داخلہ کے لیے لکھنؤ سے الٰہ آباد یونیورسٹی آنا پڑا، کیونکہ اس زمانے میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم اے (اُردو) کی کلاسیں شروع نہ ہوئی تھیں۔ میرا الٰہ آباد جانا بھی ایک عجب واقعہ ہے جس کا تذکرہ یہاں بے جا نہ ہوگا۔ والد صاحب ملازمت سے ریٹائر ہو کر کانپور جا چکے تھے۔ ان کی تنخواہ سے گھر کے اخراجات ہی بہ مشکل پورے ہوتے تھے، ان حالات میں کچھ پس انداز کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ رشوت سے وہ کوسوں دور بھاگتے تھے۔ اب سوال پیدا ہوتا تھا کہ اگر میں ایم اے' میں داخل ہو گیا تو میرے اخراجات کون برداشت کرے گا۔ میں نے والد صاحب سے کہا کہ اس کی آپ فکر نہ کریں۔ اس مسئلے سے میں خود ہی نمٹ لوں گا۔ مجھے الٰہ آباد جانے کی فقط اجازت چاہیے اور آپ کی دُعا۔ بادل نخواستہ والد صاحب رضا مند ہو گئے اور جب میں گھر سے رخصت ہوا تو اُنہوں نے مجھے پچاس روپے دیے۔ یہی پچاس روپے لے کر میں الٰہ آباد آ گیا اور اِس کے بعد پھر میں نے جب تک ایم اے کی تعلیم حاصل کی اپنے والد سے کچھ نہیں لیا۔ الٰہ آباد میں ان کے ایک دوست تھے۔ کچھ عرصہ میں ان کے یہاں ٹھہرا۔ پھر نہ جانے کیوں میں خود ہی اپنے آپ کو ان پر بوجھ سا محسوس کرنے لگا۔ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد یونیورسٹی کے ہوسٹل میں منتقل ہو جاؤں مگر جیب میں اتنے پیسے کہاں تھے۔ آخر ایک دن میں روزگار کی تلاش میں نکلا

CS CamScanner

اور سیدھا رام نرائن لال، ناشر کی دکان پر گیا۔ رام نرائن وفات پا چکے تھے اور اب اُن کا بیٹا للو بابو دکان پر بیٹھا کرتا تھا۔ اُس نے مجھے ایف اے کے نصاب کی فارسی کتاب دی اور کہا کہ اس کا خلاصہ انگریزی میں تیار کر دوں۔ کیوں کہ ان دنوں فارسی کے پرچے کا جواب انگریزی ہی میں دیا جاتا تھا۔ میں نمونے کے طور پر شروع کے آٹھ صفحے ترجمہ کر کے اس کے پاس لے گیا۔ اس نے یہ ترجمہ الہٰ آباد یونیورسٹی کے اُردو کے پروفیسر ڈاکٹر اعجاز حسین کو دکھایا جو انھیں بے حد پسند آیا۔ تب للو بابو سے مجھے باقاعدہ کام ملنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میری رسائی ''انڈین پریس'' تک بھی ہو گئی اور میں وہاں سے بھی کام حاصل کرنے لگا اور اس طرح گزر اوقات ہونے لگی۔ خیر بات چلی کہاں سے تھی اور کہاں جا پہنچی۔ ذرا خیال کی باگ ڈھیلی چھوڑیے پھر دیکھیے یہ آپ کو کن کن اجنبی راستوں پر لے جاتا ہے۔

الہٰ آباد یونیورسٹی میں ڈاکٹر ضامن علی، ڈاکٹر حفیظ سید، ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر زبیر احمد، نسیم الرحمان، مولوی محمد علی، فراق گورکھ پوری اور پروفیسر دھرم ورما جیسے مقدس اور عالم حضرات سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ اسی طرح ساتھیوں میں سے بھی بعض بڑے اچھے طالب علم تھے، ان میں طالب الہٰ آبادی، صغیر احمد جان جو ایٹ آباد کالج میں اُستاد رہے۔ سیّد احتشام حسین جو مجھ سے ایک سال پیچھے تھے، حامد بلگرامی جو اسلامی یونیورسٹی بہاول پور کے وائس چانسلر رہے پروفیسر احمد علی اور ڈاکٹر اشرف بھی وہیں قریب رہتے تھے اور ادب کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ الہٰ آباد یونیورسٹی میں تمام شعبوں کے صدروں کے کمرے ایک دوسرے کے بالکل قریب تھے۔ فرصت کے اوقات میں

ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کے کمرے میں ان کی محفلیں جما کرتی تھیں جن میں باذوق طلبہ کو بھی شریک ہونے کا موقع دیا جاتا تھا۔ ان محفلوں سے بھی میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور آگے چل کر زندگی میں یہ سیکھنا بہت کام آیا ہے۔

اُنھیں ایام میں سید جالب دھلوی، شوکت تھانوی، نیاز فتح پوری سے حامد اللہ افسر کے مکان پر ملاقاتیں ہوئیں۔ مجلس معین الادب کے زیر اہتمام تین روزہ مشاعروں میں اس زمانے میں نامور شعراء مثلاً جگر، صفی، اثر، ظریف، بیخود، رواں اور سید آل رضا وغیرہ حصہ لیا کرتے تھے۔ اُنھیں نہایت ذوق وشوق سے سُنا کرتا۔ اس زمانے میں پنجاب کے ''نیرنگ خیال'' کا طوطی بولتا تھا۔ میں نے مختلف رسالوں میں مضامین لکھنے شروع کر دیے۔ چنانچہ ہمایوں، ساقی، ادبی دنیا، عالمگیر، ہندوستانی، معارف، اُردو، زمانہ وغیرہ باقاعدگی سے پڑھتے اور اُن میں لکھا۔ ایم اے کے دو سالوں (1933-34) میں اول اول تو میں ان چیزوں پر مضامین لکھتا رہا جو نصاب میں شامل تھیں۔ یہ مضامین نیرنگ خیال، ہمایوں، عالمگیر، زمانہ، الناظر، نگار اور اُردو وغیرہ رسالوں میں چھپے۔ ادب اور تنقید کے علاوہ تعلیم پر بھی مضامین لکھے۔ بعض اچھے مضامین کا ترجمہ بھی کیا۔ چنانچہ معاشیات پر بعض مضامین کا ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ برٹرینڈ رسل کے ایک فلسفیانہ مضمون کا ترجمہ بھی کیا جو معارف میں چھپا۔ ترجمہ کرنے کا شوق چرایا تو جوڈ کی Modern Political Theory اور برنز کی Political Ideals کا ترجمہ کیا۔ اُردو، انگریزی، فارسی کے علاوہ ہندی سے بھی دلچسپی رہی۔ چنانچہ پریم چند کے ناول اور اُن پر چھپی ہوئی

CS CamScanner

تنقیدی کتابیں ہندی میں پڑھیں۔ جامعہ ملیہ کے قیام کے دوران میں بعض ہندی کتب کا ترجمہ بھی کیا۔

اُس زمانے میں آج کل کی طرح لوگ قہوہ خانوں میں جا کر اپنا وقت ضائع نہیں کرتے تھے بلکہ کلاس کے بعد بھی جو وقت ملتا تھا، اس میں پڑھتے تھے۔ میرے نزدیک علمی و ادبی زندگی پر ان چائے خانوں اور قہوہ خانوں کا اثر اچھا نہیں پڑا۔ اس سلسلے میں میرا مشاہدہ صرف لاہور ہی تک محدود نہیں بلکہ لکھنؤ اور الٰہ آباد کی زندگی کو دیکھ کر بھی میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ طلبا، یہاں بیٹھ کر تعلیم سے زیادہ سیاست میں دلچسپی لینے لگتے ہیں اور ادب کے معاملے میں بھی طلبا اپنے آپ کو گروہوں میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ یہ چیز پہلے بھی تھی لیکن اب اس نے اور بھی شدت اختیار کر لی ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ طلبا کو سیاسی مسائل پر سوچنا ہی نہیں چاہیے۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ اس عمر میں چونکہ ان میں پختگی نہیں ہوتی اس لیے وہ غلط روش پر پڑ جاتے ہیں۔

ایم اے میں سوائے پڑھنے لکھنے کے اور کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ اس لیے خوب پڑھا۔ مراثی کو دیکھا تو ان کے متعلق مضامین لکھے۔ شوق قدوائی کی ''عالم خیال'' پر ایک تنقیدی مضمون لکھا جو ''زمانہ'' میں چھپا۔ بیان یزدانی، کے مجموعہ کلام پر بھی ایک مضمون لکھا جو ''زمانہ'' ہی میں شائع ہوا۔ اب افسانے سے شغف بڑھا۔ فن افسانہ پر جتنی کتابیں مل سکیں پڑھ ڈالیں۔ فراق گورکھ پوری، پروفیسر احمد علی اور سجاد ظہیر سے ملاقاتیں ہوتیں تو ان سے اچھی اچھی کتابوں کے نام پوچھتا اور وہ لائبریری سے لا کر پڑھتا۔ لارنس، جوائس،

موپاساں اور چیخوف کے افسانے اسی دور میں پڑھے۔ پھر داستان کی طرف توجہ ہوئی تو باغ و بہار، فسانۂ عجائب اور داستان امیر حمزہ پڑھ ڈالیں۔

میں ایم اے اُردو میں یونیورسٹی میں اول آیا تھا۔ ڈاکٹر حفیظ سیّد کچھ عرصہ کے لیے یورپ گئے ہوئے تھے۔ چنانچہ اُن کی جگہ عارضی طور پر میرا تقرر ہو گیا۔ اس طرح ایم اے کے بعد مجھے چھ مہینے کے لیے الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں کام کرنے کا موقع ملا مگر یہ ملازمت عارضی تھی۔ جب وہ واپس آ گئے تو میں کانپور واپس چلا آیا۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا میں نے 1934ء میں ایم اے کیا تو کامیاب طلباء میں میری پہلی پوزیشن تھی۔ مجھے دو سال کے لیے وظیفہ مل گیا اور میں نے ''اردو شاعری پر مقامی اثرات'' کے عنوان پر ریسرچ شروع کر دی لیکن انہی دنوں والد صاحب اور والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے گھر کی ساری ذمہ داریاں میرے سر آ پڑیں اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالہ کے لیے جس یکسوئی کی ضرورت تھی وہ ختم ہو گئی۔

اب مجھے ایسے کاموں کی تلاش ہوئی جن میں آمدنی کا ایک پہلو بھی ہو۔ آمدنی کے خیال سے کچھ تو میں نے ترجمہ کا کام کیا اور کچھ درسی کتابیں لکھیں۔ بعض درسی کتابیں منظور بھی ہوئیں اور یہ ''انڈین پریس'' اور الٰہ آباد کے رام نرائن لعل نے شائع کیں۔ اسی زمانے میں' میں نے ایچ۔ جی۔ ویلز کی کتاب ''اے شارٹ ہسٹری آف دی ورلڈ'' کا ترجمہ بھی ''انڈین پریس'' کے لیے کیا تھا جو اب نایاب ہے۔ الٰہ آباد کے قیام کے دوران میں' میں رسالہ ''بچوں کی دنیا'' کی ادارت بھی کرتا رہا۔ اسے پیارے لال شاکر ایڈٹ کرتے تھے۔ اتفاق سے وہ

بیمار ہو گئے تو ادارت میرے سپرد کر دی گئی۔ اسی طرح رسالہ ''اسکاؤٹ'' کی ادارت بھی میرے سپرد تھی۔ قبل ازیں یونیورسٹی کے رسالہ ''نیساں'' کے ایڈیٹوریل بورڈ کا بھی رکن رہ چکا تھا۔

اُن ہی دنوں خواجہ غلام السیدین سے ملاقات ہوئی جو اس وقت ٹریننگ کالج علی گڑھ کے پرنسپل تھے۔ اُنہوں نے مشورہ دیا کہ اگر میں بی۔ ٹی کرلوں تو بہتر ہوگا۔ لہٰذا میں علی گڑھ چلا آیا اور بی۔ ٹی میں داخلہ لے لیا۔ یہاں بڑا اچھا ماحول ملا۔ استاد بھی بعض بہت اچھے تھے۔ اُن میں خواجہ غلام السیدین۔ چوہدری عبدالغفور ایم۔ ایس۔ سی جو پاکستان میں کسی کالج کے پرنسپل رہے اور محمد بشیر صاحب قابل ذکر ہیں۔ ان وسیع العلم اساتذہ کے خیالات نے ذہن اور مزاج پر نئے نئے رنگ چڑھائے۔ یہ محمد بشیر صاحب وہی ہیں جنہوں نے سب سے پہلے روسی زبان سے بلاواسطہ چیخوف اور دوسرے افسانہ نگاروں کے تراجم اُردو میں کیے تھے اور جنہیں لوگوں نے بہت پسند کیا تھا۔ حلقہ احباب میں رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، اختر انصاری، معین احسن جذبی اور خواجہ منظور حسین وغیرہ سے پہلے سے مراسم تھے۔ یہ سب علی گڑھ میں تھے۔ اس لیے پڑھنا لکھنا بھی جاری رہا اور ادبی ذوق کی تسکین بھی ہوتی رہی۔ بہرحال جب سالانہ امتحان ہوا اور نتیجہ نکلا تو میں تھیوری اور پریکٹیکل دونوں پرچوں میں فرسٹ ڈویژن لے کر کامیاب ہوا، لیکن چونکہ میرا شروع ہی سے ارادہ کسی کالج یا یونیورسٹی میں پڑھانے کا تھا اس لیے میں نے اب تک نہ بی۔ ٹی کی ڈگری یونیورسٹی سے لی ہے اور نہ اس کی ضرورت ہی پیش آئی ہے۔ اپنے نام کے ساتھ بھی میں بی۔ ٹی نہیں لکھتا، کسی اور

نے لکھ دیا تو لکھ دیا، میں نے کبھی نہیں لکھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں بی۔ ٹی کو بُرا یا حقیر سمجھتا ہوں بلکہ بس ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اسی زمانے کی ایک اور بات کا بھی ذکر کردوں کہ بی۔ ٹی میں ایک پرچہ اختصاصی مضمون کا بھی تھا جس میں طالب علم کو تخصص کرنا پڑتا تھا۔ غلام السیدین صاحب کے مشورے سے میں نے اُردو میں تخصص کیا اور ''انشاء کی تعلیم'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا جو سیدین صاحب کو بہت پسند آیا اور اسے مکتبہ جامعہ ملیہ نے کتابی شکل میں چھاپا۔

ٹریننگ کالج سے بی۔ٹی کرنے کے بعد میں واپس الٰہ آباد چلا آیا۔

اب پھر وہی بے روزگاری کا چکر تھا۔ کئی ماہ بعد غلام السیدین صاحب کا ایک خط ملا کہ جامعہ ملیہ میں اُردو کے اُستاد کی ایک جگہ خالی ہے، اگر تم پسند کرو تو چلے آؤ۔ میں نے دوسرے دن ہی بوریا بستر لپیٹا اور دہلی کا ٹکٹ کٹا لیا۔ ذاکر حسین صاحب یورپ جاتے وقت کہہ گئے تھے کہ اس جگہ کے لیے وقار عظیم سے پوچھا جائے۔ اگر وہ راضی ہوں تو اُنہیں بلا لیا جائے۔ اس طرح میں جامعہ ملیہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی وجہ سے گیا۔ وہ شیخ الجامعہ تھے۔ میں وہاں اُردو پڑھانے لگا۔

یادش بخیر دلی اسٹیشن پر اُتر کر سیدھا مجیب صاحب کے یہاں گیا۔

باتوں ہی باتوں میں وہ جامعہ کے بارے میں کہنے لگے کہ یہاں مجھے بہت تکلیف اٹھانی پڑے گی، تنخواہ بھی کم ملے گی اور وہ بھی بے وقت۔ میں نے کہا: ''جناب اب تو گھر سے نکل پڑا ہوں جو کچھ بیتے گی اسے جان نزار پر سہوں گا۔'' اُن دنوں جامعہ ملیہ میں پروفیسرز کو ذیل کے حساب سے تنخواہ ملتی تھی:

ڈاکٹر ذاکر حسین	اسّی روپے
ڈاکٹر عابد حسین	اسّی روپے
مجیب صاحب	ساٹھ روپے

میری تنخواہ بھی اُنہوں نے ساٹھ روپے مقرر کی لیکن کہا کہ اس میں سے دو تہائی ملا کرے گی۔ یعنی چالیس روپے۔ میں نے یہ پیش کش قبول کر لی۔ اتنے میں دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا مجیب صاحب نے پوچھا کہ شادی ہو گئی ہے۔ میں نے کہا: ''جی ہاں ابھی چند ہی ماہ ہوئے ہیں۔'' بولے کہ پھر تو تمہیں مکان کی بھی ضرورت ہوگی کیوں کہ بیاہا ہوا شخص بیوی کے بغیر دل لگا کر کام نہیں کر سکتا۔ میں نے لاکھ کہا کہ اُنہیں بعد میں لے آؤں گا مگر اُنہوں نے ایک نہ سُنی اور کہنے لگے: ''چلیے مکان تلاش کرتے ہیں اور پھر آ کر کھانا کھائیں گے۔'' وہ قرول باغ میں رہتے تھے وہاں تین مکان خالی تھے:

سب سے اچھے مکان کا کرایہ	چالیس روپے
دوسرے کا	پچیس روپے
اور تیسرے کا	پندرہ روپے

میں نے پچیس روپے والا مکان چن لیا۔ کہنے لگے کہ نہیں چالیس روپے والا مکان مناسب رہے گا، کیوں کہ جائے رہائش کا بھی انسان کی تخلیقی قوتوں پر بڑا اثر پڑتا ہے میں نے عرض کیا کہ اگر چالیس روپے مکان کا کرایہ دے دیا تو مہینہ بھر کھاؤں گا کہاں سے۔ بولے کہ: ''اس کی فکر نہ کرو، مکان میں تالا ڈالو، کھانا کھاؤ اور پھر بیوی کو لینے آگرہ چلے جاؤ۔'' بیوی اس زمانے میں آگرہ میں تھیں۔ بعد میں

معلوم ہوا کہ جامعہ ملیہ سے تصنیف و تالیف کا اس قدر کام مل جاتا تھا کہ مہینہ بخوبی گزر جاتا تھا۔

جامعہ ملیہ میں میں پانچ برس رہا۔ 1938ء سے 1942ء تک یہ پانچ برس میری زندگی میں ایک طرح سے خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہاں میں نے ایک خاص قسم کی تربیت حاصل کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں کوئی کام ایسا نہ تھا جسے کرنے میں عار نظر آئے یا جو ایک پروفیسر کے شایان شان نہ ہو۔ اکثر اوقات ہم طلباء کے ساتھ مل کر خود اُن کے ڈیسک وغیرہ صاف کرتے' بعض اوقات مالی پریشانیاں بھی تنگ کرتیں مگر کیا مجال جو ماتھے پر ذرا بھی شکن آئے۔

ایک واقعہ ہے۔ گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ بعض مالی مشکلات کی وجہ سے ہمیں تنخواہیں نہ مل سکیں جس کے باعث ان چھٹیوں میں کہیں آنے جانے کا پروگرام نہ بن سکا۔ ایک دن میں اپنے مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ادھر آ نکلے، وہ بھی قریب ہی رہتے تھے۔ اُن کے ہمراہ جامعہ کے رجسٹرار اور اکاؤنٹنٹ حافظ فیاض احمد بھی تھے۔ ذاکر صاحب نے آتے ہی پوچھا: ''کیوں وقار صاحب چھٹیوں میں سیر ویر کو نہیں گئے؟'' اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا حافظ صاحب بول اٹھے: ''یہ ہماری وجہ سے نہیں جا سکے۔'' ان کا مطلب تھا کہ ہم نے تنخواہ نہیں دی' جاتے کس طرح۔ میں نے دیکھا کہ ذاکر صاحب کے چہرے پر ایک عجیب کرب کی لہر دوڑ گئی مگر وہ بدستور مسکراتے رہے اور تھوڑی دیر بعد گھر واپس چلے گئے۔ بہ مشکل پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ ان کا ملازم ایک لفافہ لیئے ہوئے آیا۔ میں نے کھولا تو اس میں سو روپے کا نوٹ تھا بعد میں معلوم ہوا کہ

ڈاکٹر یوسف حسین پرووائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی، دہلی میں اپنا ایک مکان بنا رہے تھے اور وہ ہر ماہ ذاکر صاحب کو چار پانچ سو روپے بھیجا کرتے تھے کیوں کہ وہ مکان ذاکر صاحب کی زیرِ نگرانی بن رہا تھا۔ ابھی ابھی اُن کا منی آرڈر آیا تھا جس میں سے وقتی طور پر ''خیانت'' کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے سو روپیہ مجھے بھجوا دیا۔

جامعہ ملیہ میں بی اے تک کلاسیں تھیں۔ ویسے اس کے تین حصے تھے ابتدائی، ثانوی اور کالج۔ میرا تقرر ثانوی میں ہوا مگر ایک سال بعد مجھے ایک دو کلاسیں کالج میں بھی دی جانے لگیں۔ جامعہ ملیہ میں جانے کے تھوڑی ہی مدت بعد میں وہاں کے اساتذہ میں سے پروفیسر مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین سے بہت قریب آ گیا۔ اس قربت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے یہاں بھی، اُن کے ساتھ، ادبی کام کا موقع ملا۔ جامعہ ملیہ میں دو طرح کے کام ہوتے تھے۔ ایک تو اچھی کتابوں کے ترجمے اور دوسرے درسی کتابوں کی تیاری۔ میں نے دونوں میں مدد دی۔ مثال کے طور پر گاندھی جی کی سوانح عمری ''تلاشِ حق'' کے کچھ حصے میرے ترجمہ کیے ہوئے ہیں۔ اسی طرح جواہر لال کی آٹو بیاگرافی اور

(Glimpses of the world History)

کے بعض حصوں کا ترجمہ میں نے کیا ہے۔ ترجمہ کا کام جس مجلس کے سپرد تھا اُس کے سارے کام پر آخری نظر خود ڈاکٹر عابد حسین ڈالتے تھے۔ اُنھوں نے میرا کیا ہوا ترجمہ دیکھا تو اتنا پسند آیا کہ اُنھوں نے منیجر مکتبہ' حامد علی خان سے فرمایا کہ اُن سے زیادہ کام لیا جائے۔ جامعہ جتنے تراجم کراتا تھا، اُن پر نام کسی کا نہ ہوتا تھا، بس

جامعہ کا نام لکھا جاتا تھا۔

جامعہ کی تعلیم کا پہلا امتیازی وصف یہ تھا کہ یہاں تعلیم کو محض کتابوں کی تعلیم نہیں سمجھا جاتا تھا، بلکہ تعلیم کا مقصد بچے کی پوری شخصیت کو اُبھارنا اور نمایاں کرنا تھا۔ اس کے لیے کئی طرح کے احساسات کی ضرورت تھی۔ ان سب کو اُجاگر کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر بچے میں جذبۂ خدمت کو اُبھارا جاتا اور اُسے یہ بتایا جاتا کہ وہ ہر ایک کی خدمت کو اپنا مسلک بنائے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ چھوٹی سے چھوٹی جماعت کے طالب علم سے لے کر بڑی سے بڑی جماعت کا کوئی طالب علم بھی کام کرنے کو اپنے لیے عار نہیں خیال کرتا تھا اور وہ جھاڑو دینے اور منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کرنے کو یکساں درجہ کی خدمت سمجھنے لگتا تھا۔ جامعہ کا دوسرا امتیاز یہ تھا کہ طلباء کے اندر سیاسی شعور پیدا کرتا تھا، اس کی اساس دین پر تھی لیکن عام قومی اداروں کی مانند اس پر سیاسی رنگ غالب نہیں تھا۔

بچوں میں احساسِ خدمت اُبھارنے اور ان کے اندر دینی اساس کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے عملاً جامعہ کے تینوں درجوں یعنی ابتدائی، ثانوی اور کالج میں جتنا انتظامی کام ہوتا تھا اپنی اپنی سطح کے لحاظ سے بچے خود کرتے تھے۔ ''ابتدائی'' میں بچے خود ہی کھانا پکواتے تھے اور وہی اپنے دوسرے ساتھیوں کو کھلاتے بھی تھے۔ اسی طرح جامعہ میں ایک دکان بھی تھی۔ اس کا سارا انتظام، سامان خریدنا، چیزیں بیچنا اور حساب رکھنا وغیرہ بچے کرتے تھے۔ کسی کام کا اُنھیں کوئی معاوضہ نہ ملتا تھا بلکہ یہ سارے کام رضاکارانہ ہوتے تھے۔ اسی طرح کمروں کی دیکھ بھال اور صفائی، دھوبی کو دھونے کے لیے چادریں دینا اور ان کا

حساب رکھنا، یہ سب کام بچے ہی کرتے تھے۔ اُستاد ان میں سے کسی کام میں کوئی مداخلت نہ کرتے تھے۔ اگر کسی طالب علم کا کام اطمینان بخش نہ ہوتا تو تین چار طلبا خود آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ بٹاتے اور اس میں کسی قسم کا تکلف محسوس نہ کرتے اور نہ کوئی یہ سمجھتا کہ میں نے کام زیادہ کیا ہے اور دوسروں نے کم۔ اس طرح بچوں کو زیادہ سے زیادہ سب کی خاطر کام کرنے کا موقع دیا جاتا تھا تاکہ ان میں اپنی ذات سے بلند ہو کر دوسروں کی خاطر ایثار اور اُن کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو۔

اسی طرح وہ اخبار پابندی سے پڑھتے تھے۔ جس سے اُن میں معاشرتی واقفیت پیدا ہوتی۔ سارے بچے ہاسٹل میں رہتے تھے اور علی الصبح فجر کی نماز پڑھتے اور اس کے بعد درس قرآن ہوا کرتا تھا، جس میں سب شریک ہوتے۔ پھر ان کی نصابی کتابیں ایسی ہوتی تھیں جو صحیح طریق زندگی کی طرف اُن کی رہ نمائی کرتی تھیں۔ لباس سادہ ہوتا تھا مگر ستھرا اور صاف۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے اپنا کام کرنے پر زور دیا جاتا تھا، خواہ وہ کپڑوں پر استری کرنے کا کام ہو یا جوتوں پر پالش کرنے کا۔ جامعہ کے اور عام اداروں کے فارغ التحصیل طلبہ میں نمایاں فرق اب بھی ہے، جب جامعہ کا کوئی طالب علم مل جائے، تو بین طور پر محسوس ہوتا ہے۔ دراصل جامعہ ملیہ کے طالب علم چوں کہ خود اپنے اُستادوں کو اسی طرح زندگی بسر کرتے دیکھتے تھے، اس لیے ان پر بڑا اثر ہوتا تھا۔ اُستادوں میں سے کسی کی تنخواہ سو روپے ماہوار سے زائد نہ تھی۔ خود ذاکر صاحب اسی روپے لیتے تھے۔ اُن کا شعار سادہ زندگی تھا۔ ایک دن پروفیسر مجیب، طلبا کو کسی ڈرامہ کی ریہرسل کروا رہے تھے کہ اتنے میں گھر سے اُن کا کھانا آ گیا۔ مجھ سے کہا کہ

ناشتہ دان کھولو، کھولا تو آلو اور گوبھی کی ترکاری تھی۔ کہنے لگے کہ اس ترکاری کو روٹی میں لپیٹ کر سینڈوچ کی مانند اُنہیں دے دوں۔ اب حالت یہ تھی کہ ایک ہاتھ سے کام بھی کرتے جا رہے تھے اور دوسرے ہاتھ سے بچوں کی طرح کھانا کھاتے جاتے تھے۔

1935ء تک میری دو کتابیں ‘‘افسانہ نگاری’’ اور ‘‘ہمارے افسانے’’ چھپ چکی تھیں۔ پھر ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو نئے ادیبوں سے تعارف ہوا۔ لہٰذا ان کی چیزیں پڑھنے کا موقع ملا۔ سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، عصمت چغتائی کے افسانے پڑھے اور ن۔م۔ راشد، میرا جی، فیض احمد فیض، جذبی، مجاز، اختر الایمان وغیرہ کی جدید شاعری پڑھی۔ 1939ء میں دہلی کے قیام کے دوران میں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے تازہ مطبوعات پر تبصرہ کرنے کا فرض میرے سپرد تھا۔ اس طرح کم و بیش ہر نئی کتاب سے تعارف لازمی تھا۔ مجھے اردو افسانہ نگاروں میں کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی نے زیادہ متاثر کیا۔ اُردو میں تاریخ کے موضوع پر جو کتاب ہاتھ آئی پڑھی۔ اردو انگریزی میں رسول اکرم کی سیرت پر جتنی کتابیں دستیاب ہو سکیں حاصل کر کے پڑھیں۔

1942ء یا اس کے لگ بھگ دہلی میں پولی ٹیکنیک کے نام سے تعلیم و دستکاری کا ایک نیا ادارہ قائم ہوا۔ ان دنوں ایجوکیشنل ایڈ وائزر سرجان سارجنٹ صاحب تھے جن کے ذاکر حسین صاحب سے نہایت قریبی اور گہرے تعلقات تھے۔ اُنھوں نے ذاکر صاحب سے خواہش ظاہر کی کہ انھیں اُردو کا

کوئی اچھا استاد دیا جائے۔ ذاکر صاحب کو مجھ پر اتنا اعتماد تھا کہ مجھ سے پوچھے بغیر اُن سے میرے متعلق وعدہ کر لیا اور مجھے بلا کر کہا کہ میں نہیں چاہتا کہ تم یہاں جامعہ ملیہ میں رہ کر مزید پریشانیوں کا شکار بنے رہو۔ تمہارے لیے وہاں چلے جانا بہتر ہوگا۔

اس طرح ذاکر صاحب کے کہنے پر میں نے جامعہ کو الوداع کہا اور اُن ہی کے کہنے پر 1942ء سے 1946ء تک پولی ٹیکنیک میں رہا۔ پھر وہاں سے 1946ء میں حکومت کے پرچے ''آج کل'' دہلی کا مدیر ہو کر چلا آیا۔ اُس زمانے میں اُستادوں کے جو گریڈ تھے تنخواہوں کے وہ اچھے نہیں تھے۔ تو جو تنخواہ مجھے پولی ٹیکنیک میں مل رہی تھی ''آج کل'' کے لیے اُس سے تین گنی تنخواہ کی پیشکش ہوئی۔ وہ ہوا یہ کہ ''آج کل'' میں میرے ایک دوست اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے اُنہیں اس شرط پر ترقی مل رہی تھی کہ وہ اپنا کوئی بدل دیں۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا۔ میں نے کہا: ''میں سرکاری ملازم ہوں درخواست نہیں دے سکتا۔'' تو انہوں نے جواب دیا: ''کوئی حرج نہیں' آپ درخواست نہ دیں' صرف انٹرویو دے دیں۔ لے لیے جائیں تو استعفیٰ دے کر یہاں آ جائیے گا۔۔ چنانچہ یہی ہوا۔ خدا کا کرم ہے کہ مجھے ساری زندگی میں نوکری کے لیے کبھی درخواست نہیں دینا پڑی بلکہ ہمیشہ خود بخود راستے نکل آئے۔ انٹرویو ہوا' اُس میں مجھے لے لیا گیا۔ اور تنخواہ میں سمجھئے کہ وہاں اگر ڈیڑھ سو دیتے تھے تو یہاں ساڑھے چار سو۔ یہ ایسا نمایاں فرق تھا کہ میں نے کچھ نہیں سوچا اور میں ''آج کل'' میں آ گیا۔'' اس تمام عرصے میں میرا مطالعہ خاصا محدود رہا کیوں کہ بے پناہ مصروفیت کی وجہ سے اتنا وقت نہیں ملتا تھا

کہ زیادہ مطالعہ جاری رکھ سکتا۔ البتہ ادیبوں اور شاعروں سے اتنے گہرے تعلقات تھے کہ چاہتا بھی تو ادب سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا تھا۔ احمد شاہ بخاری پطرس نے ایک مجلس قائم کر رکھی تھی جس میں تاثیر، مجید ملک، چراغ حسن حسرت، حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض، حمید احمد خان، حامد علی خان، کیپٹن عبدالواحد، ممتاز حسن، اے۔ ڈی اظہر اور ریڈیو والے کرشن چندر، منٹو، میرا جی شرکت کرتے تھے۔ اس مجلس میں کوئی شخص مضمون پڑھتا تھا اور پھر اس پر بحث ہوتی تھی دوسرا گروپ شاہد احمد دہلوی، رازق الخیری وغیرہ کا تھا جو اپنے جلسے الگ کرتے تھے۔ ان میں فضل حق قریشی، انصار ناصری، مرزا محمد سعید وغیرہ شرکت کرتے تھے۔ جب ترقی پسند تحریک نے زور پکڑا تو ترقی پسندوں کے الگ جلسے ہونے لگے۔ میرا ان سب حلقوں سے تعلق تھا اس لیے مطالعہ کا رشتہ ختم نہ ہو سکا۔

ابھی ''آج کل'' ہی میں تھا کہ تقسیم ہو گئی۔ سارے سرکاری ملازمین سے پوچھا گیا کہ وہ ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان جانا چاہتے ہیں۔ اس پر ''آج کل'' کے سارے عملے کے ساتھ میں نے بھی پاکستان کے حق میں رائے دی۔ جتنے مسلمان سرکاری ملازموں کو میں جانتا تھا ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے ہنسی خوشی یہ نہ کہا ہو کہ میں پاکستان جاؤں گا۔ پاکستان آنے والوں میں ہزاروں ملازم ایسے تھے جن کے رشتے دار' گھر بار' زمین' جائیداد سب چیزیں ہندوستان میں تھیں لیکن انہوں نے اپنی ہر چیز پاکستان کے نام پر قربان کی اور اس بہت بڑے اور بہت اہم سفر کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

حکومت کی طرف سے یہ انتظام تھا کہ جو سرکاری ملازم پاکستان آ رہے ہیں' ان

کے لیے اسپیشل گاڑیاں چلائی جائیں تاکہ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آرام سے کراچی یا اپنی متعینہ منزل پر پہنچ جائیں.... جس گاڑی میں مجھے اور میرے بیوی بچوں کو دہلی سے روانہ ہونا تھا‘ وہ 9- اگست 1947ء کو دہلی کے اسٹیشن سے چلی۔ بہت سے دوست اور رشتہ دار ہمیں رخصت کرنے کے لیے اسٹیشن آئے تھے۔ ان میں ہر طرح کے لوگ تھے ‘مرد‘ عورتیں‘ بچے اور سب کا یہ حال تھا کہ آنکھ میں آنسو تھے‘ کوئی زاروقطار رو رہا تھا۔ کوئی دل مضبوط کر کے انہیں آنکھوں میں روکے ہوئے تھا۔

اور ہم پاکستان آنے والے‘ اپنے اپنے دلوں میں یہ سمجھ رہے تھے کہ ان روتے بلبلاتے عزیزوں کو یہاں چھوڑ کر‘ ہم آزادی کی سرزمین میں جا رہے ہیں جہاں ہر طرف سچائی اور ایمان کی حکومت ہوگی۔ ہر آنے والا یہ سوچ رہا تھا کہ پاکستان کو اس کی خدمت کی ضرورت ہے اور یہ خدمت اسے اپنے تن‘ من‘ دھن کی بازی لگا کر انجام دینی ہے۔ گاڑی کوئی گیارہ بجے دہلی کے اسٹیشن سے روانہ ہوئی۔ دیر تک دہلی کی عمارتیں‘ وہاں کی سڑکیں‘ گلیاں‘ باغ اور پارک نظر آتے رہے اور نہ جانے کیوں یوں محسوس ہوا کہ یہ چیزیں اب ہماری نہیں ہیں۔

گاڑی دن بھر چلتی اور مختلف اسٹیشنوں پر رکتی اور پھر چلتی ہوئی رات کو آٹھ بجے کے قریب بھٹنڈے کے اسٹیشن پر پہنچی۔ بھٹنڈے میں مسلم لیگ کے رضاکاروں نے پرجوش نعروں سے گاڑی کا استقبال کیا اور پاکستان جانے والے اجنبی مسافروں سے یوں ملے جیسے وہ ان کے رشتہ دار ہیں۔ گاڑی آدھ گھنٹے کے بعد وہاں سے روانہ ہوئی تو ان رضاکاروں کے چہروں کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ خود تو پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں لیکن ان کے دل پاکستان جانے والی گاڑی کے ساتھ ساتھ ہیں۔ غیروں کی سرزمین میں رہ کر

Mir Zaheer Abass Rustmani

انہیں اپنے ملک، اپنی سرزمین اور اپنے اصل وطن پاکستان کا خیال بے چین کر رہا ہے۔

گاڑی اسٹیشن سے نکلتے ہی جیسے اندھیرے میں ڈوب گئی۔ ہر طرف بھیانک تاریکی اور سنسان سناٹا اور اس میں ہوا کی تیزی کی طرح فراٹے بھرتی ہوئی ریل۔ نو (۹) بجنے والے تھے، سب سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں نے کھڑکی میں سے تاریک، سنسان رات اور اس رات کی ویرانی کو دور کرنے کی کوشش کرنے والے ننھے ننھے ستاروں پر ایک نظر ڈالی اور کھڑکی سے سر اندر کر لیا۔ ریل تیزی سے دوڑ رہی تھی کہ ایک دم یوں محسوس ہوا جیسے زلزلہ..... بہت زور کا زلزلہ آ گیا ہو اور کسی بہت بڑی طاقت نے ریل کے سارے جسم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہو۔ ڈبے میں رکھی ہوئی ہر چیز جگہ سے بے جگہ ہو گئی۔ بکس، بستر، مشین، لوٹا، صراحی سب چیزیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ بچے، گھبرا کر اٹھ بیٹھے، بڑوں نے انہیں سینے سے لگایا اور ایکا ایکی ایک بہت بڑا جھٹکا لے کر یہ طوفان رک گیا اس کے رکتے ہی ہر طرف سے عورتوں اور بچوں کی چیخ پکار، توپ کے گولوں کی دھائیں دھائیں اور اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعرے۔

میں نے بمشکل اپنے حواس کو درست کیا تو پہلی بات یہ دیکھی کہ جس ڈبے میں بیٹھا تھا، اس میں بالکل اندھیرا تھا۔ باہر کے اندھیرے نے کمرے کو اور بھی تاریک بنا دیا تھا۔ میں نے آہستہ سے پیر اٹھا کر ایک قدم بڑھایا تو فرش پر پڑی ٹارچ سے ٹھوکر لگی۔ ٹارچ اٹھا کر جلائی تو ڈبے کا منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ اس کی ایک طرف کی کھڑکیاں آسمان کے رخ تھیں اور دوسری طرف کی، زمین کی طرف۔

چھوٹے بچے سمیت جس کی عمر سات (7) ہفتے کی تھی، دوسرے بچے میری بیوی کی گود میں تھے۔ وہ قرآن شریف کی آیتیں پڑھ پڑھ کر ان پر دم کر رہی تھیں۔ گولا باری

Mir Zaheer Abass Rustmani

اب بھی ہو رہی تھی اور اللہ اکبر کے نعروں میں ملی جلی چیخ پکار کی آوازیں، جنگل کے اس سناٹے میں کئی ہزار عورتوں اور بچوں کی آوازیں معلوم ہو رہی تھیں۔

بہت سے آدمی میرے ڈبے کے سامنے آ کر رکے اور باہر سے آوازیں آنے لگیں: ''اوپر کی کھڑکی سے باہر نکل آئیے۔'' میں نے بچوں کو آسمان کی طرف اٹھی ہوئی کھڑکی میں سے باہر نکالا۔ باہر سے انہیں کوئی سہارا دے کر نیچے بٹھا تا رہا۔ میں کود کر باہر نکلا، بیوی کو اپنے کندھے کا سہارا دے کر نیچے اتارا۔ باہر جا کر دیکھا تو ہر طرف آدمیوں کا ہجوم تھا۔ ہماری گاڑی کے محافظ بلوچ سپاہی جنگل کی طرف گولیاں چلا رہے تھے اور کسی کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ آخر ہوا کیا ہے؟

تھوڑی دیر کے بعد ایک ایک کر کے ساری باتیں سامنے آئیں۔ معلوم ہوا کہ پاکستان کے کچھ دشمنوں نے ریل کی پٹری پر بم رکھ دیئے تھے کہ جب ہماری گاڑی ادھر سے گزرے تو بم پھٹ جائیں اور پوری گاڑی تباہ ہو جائے، لیکن چار بموں میں سے صرف ایک پھٹا، اور اس وقت پھٹا جب انجن بموں کے اوپر سے گزر چکا تھا۔ انجن تو صحیح سلامت نکل گیا لیکن اس کے پیچھے کے تین ڈبوں کو نقصان پہنچا۔ ایک ٹوٹ پھوٹ کر ایسا ہو گیا جیسے کسی نے دیا سلائی کا خالی بکس مٹھی میں لے کر کچل ڈالا ہو۔ دوسرے ڈبے کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ پہیے ایک طرف جا پڑے اوپر کا حصہ پٹڑی سے کئی گز کے فاصلے پر دوسری طرف۔ تیسرا ڈبہ اس طرح الٹا کہ اس کی ایک طرف کی کھڑکیاں آسمان کی طرف اٹھ گئیں اور دوسری طرف کی زمین سے جا لگیں۔

اس جنگل بیابان میں ستاروں اور دو چار ٹارچوں کی دھیمی روشنی کے سوا ہر طرف اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں زخمیوں کو دوسرے ڈبوں میں پہنچایا گیا۔ ایک خاتون کا

Mir Zaheer Abass Rustmani

انتقال ہو گیا تھا ان کی لاش اٹھا کر رکھی گئی اور وقت اس انتظار اور دھڑکے میں کٹنے لگا کہ اب دشمنوں کی کوئی فوج حملہ کر کے ان نہتے مسلمانوں کو قتل کر دے گی۔ لیکن بلوچ سپاہیوں کی چھوٹی توپوں سے نکلی ہوئی گولیوں اور اللہ اکبر کے نعروں نے دشمن کی ہمت چھین لی۔ اور ہم نے وہ رات جوں توں کر کے گزار لی۔

پٹری ٹوٹ گئی تھی اور راستہ بند تھا' اس لیے آگے جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ لیکن کوئی بارہ گھنٹے کے بعد دوسری طرف سے ایک ریل گاڑی آئی۔ ہماری گاڑی کے مسافر اس میں جا کر بیٹھے اور پھر اپنا سفر شروع کیا۔

یہ سفر اس علاقے میں تھا جو پاکستان کے حصے میں آیا تھا۔ ان حصوں میں ہماری گاڑی کے حادثے کی خبر پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ اس لیے ہماری گاڑی جس اسٹیشن پر پہنچتی وہاں ہزاروں آدمی جو آس پاس کے گاؤں میں رہتے تھے' اس گاڑی کے خیر مقدم کے لیے موجود ہوتے اور اپنی اپنی سمجھ اور توفیق کے مطابق ضرورت کی چیزیں لے کر آتے۔ ایک اسٹیشن پر چنے کی دال اور روٹی پکی رکھی تھی۔ ایک جگہ چائے کا انتظام تھا۔ سمہ سٹہ کے اسٹیشن پر نواب صاحب بہاولپور کی طرف سے اچھی خاصی دعوت کا انتظام کیا گیا تھا۔

مرد دوڑ کر ڈبوں میں بیٹھے ہوئے مسافروں کو ان کی ضرورت کی چیزیں دیتے اور عورتیں ان کا ہاتھ بٹاتیں۔ وہ کبھی کبھی ڈبوں کے سامنے چپکی آ کر کھڑی ہو جاتیں لیکن ان کی خاموشی میں ہمیشہ ایک داستان چھپی نظر آتی تھی۔ ان کی خاموش نگاہیں برابر یہ پوچھتی معلوم ہوتی تھیں کہ ''کہو! تم پر کیا بیتی؟'' اور میرا دل برابر یہ خاموش جواب دے رہا تھا کہ جب تک وہ بے غرض محبت زندہ ہے' جس کا تم نے ثبوت دیا ہے' انسان ہر دکھ درد سے آزاد ہے۔

ایک چھوٹا سا اسٹیشن آیا تو میں نے دیکھا کہ اسٹیشن کے باہر بنے ہوئے ایک کنویں پر ایک ادھیڑ عمر کی عورت لب جھپ پانی بھر رہی ہے۔ اس نے تیزی سے پیتل کا گگرا کھینچ کر باہر نکالا اور اسے کولبے پر رکھ کر اندر آ گئی۔ گگرا اس نے لا کر ہمارے ڈبے کے سامنے رکھ دیا۔ جن کے پاس لوٹے تھے انہوں نے لوٹے پانی سے بھر لیے۔ ایک صاحب کے پاس اتفاق سے کوئی برتن نہیں تھا۔ عورت نے دیکھا کہ اس بیچارے کو پانی چاہیے لیکن اس کے پاس کوئی برتن نہیں ہے۔ ریل چلنے والی تھی۔ اس نے تیزی سے اپنا آدھا بھرا ہوا گگرا ڈبے میں رکھ دیا۔

گاڑی چل دی اور وہ ادھیڑ عمر عورت جس کے بدن پر کپڑے بھی ثابت نہ تھے، اپنا بھاری پیتل کا گگرا یوں ایک پیاسے کو دے کر سمجھ رہی تھی کہ اس نے کوئی سلطنت فتح کر لی ہے۔ اس کے جھریوں پڑے چہرے کی مسکراہٹ مجھے ہمیشہ یاد رہے گی کہ انسان کے لیے ایثار اور قربانی کا ایک ناقابل فراموش سبق ہے۔

کراچی آ کر میں نے حکومتِ پاکستان کی طرف سے ''ماہِ نو'' نکالا۔ جنوری 1950 تک اس کا ایڈیٹر رہا۔

کراچی میں میری صحت اچھی نہیں رہتی تھی۔ وہاں رہ کر مجھے سانس کی تکلیف ہو گئی جس کا اثر کچھ کچھ اب تک باقی ہے۔ روزانہ سات آٹھ گھنٹے دفتری کام میں کھپانے پڑتے تھے۔ جس کی وجہ سے لکھنے پڑھنے کا کام بالکل ختم ہو کر رہ گیا۔ اس لیے میں کراچی سے نکلنے کی فکر میں تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے میرے نام ایک خط پہنچا اور اُردو کے شعبہ میں بطور اُستاد لینے کی پیش کش ہوئی۔ چنانچہ فروری 1950 میں یہاں آ گیا۔ جب مجھے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے

شعبہ اُردو سے وابستہ ہونے کا شرف حاصل ہوا تو اسے میں نے زندگی کا ایک اہم واقعہ سمجھا۔ بلاشبہ یہ واقعہ آگے چل کر کئی حیثیتوں سے اہم ثابت ہوا۔ فروری 1950ء سے اپنی سبکدوشی یعنی ستمبر 1970ء تک کے تقریباً اکیس سال کی مدت میرے لیے اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ اِس مدت کا ایک ایک لمحہ کاموں میں مصروف رہنے اور دوسروں کو کاموں میں مصروف رکھنے کی مسرت اور سرخوشی میں بسر ہوا۔

جس زمانے میں رسالہ ''نقوش'' پر بعض پابندیاں تھیں طفیل صاحب کے کہنے پر اعزازی طور پر میں نے ''نقوش'' کی ادارت قبول کر لی۔

یونیورسٹی میں یہاں میرے سپرد ''فکشن'' اور ''اقبالیات'' کے پرچے تھے اس لیے زیادہ کوشش یہی رہتی کہ اُنھیں چیزوں کا مطالعہ کیا جائے جو طلبہ کے لیے مفید ثابت ہو سکیں۔ چنانچہ ان موضوعات پر نئی پرانی سب چیزیں نظر سے گزرتی رہیں۔ مضامین بھی زیادہ تر انھی موضوعات پر لکھے۔ اُردو ادب اوڑھنا بچھونا بن چکی ہے۔ نئی نئی کتابیں آتی رہتی ہیں اور ان کا مطالعہ جاری رہتا ہے۔ فارسی زبان سے بھی دل چسپی ہے۔ سعدی کی گلستان تو میرے سرہانے رکھی رہتی ہے۔ جب بھی اسے پڑھتا ہوں بڑا لطف آتا ہے ''دیوان حافظ'' بھی اکثر زیرِ مطالعہ رہتا ہے۔

طنز و مزاح نگاروں میں میں نے عظیم بیگ چغتائی کو سب سے پہلے پڑھا پھر ملا رموزی اور مرزا فرحت اللہ بیگ کو شوق سے پڑھا لیکن عظیم بیگ سے زیادہ دلچسپی محسوس کی۔ البتہ ایک نئی طرح کی طنز جو انگریزی کے اثر سے اُردو میں آئی اس میں رشید احمد صدیقی اور پطرس اور آگے چل کر شفیق الرحمن، کنہیا لعل کپور کو پڑھا۔ شوکت تھانوی اور نئے لکھنے والوں میں مشتاق یوسفی کو اچھی طرح پڑھا۔

مزاح نگاروں میں شوکت تھانوی پہلے شخص تھے جن سے میری ملاقات ہوئی۔ ان کی ''سودیشی ریل'' اس زمانے میں بے حد مشہور تھی۔

میں اسلوب میں محمد حسین آزاد سے جتنا متاثر ہوا ہوں اتنا کسی اور سے نہیں۔ شروع شروع میں ان کی تقلید بھی کی لیکن بعد میں اسے ترک کر دیا پھر مولانا شبلی نعمانی اور مولوی عبدالحق کا انداز بیان پسند آیا اور ان کا ملا جلا انداز اختیار کیا۔

غیر ملکی ادب میں ڈکنز، موپساں، چیخوف، آسکر وائلڈ، ڈی۔ ایچ۔ لارنس، جیمز جوائس، ورجینا وولف، فالکنر اور آرڈس ہکسلے نے بہت متاثر کیا۔ دراصل مختلف ادوار میں مختلف لوگ پسند رہے۔ شروع شروع میں جب میں بی۔ اے میں تھا، انگریزی شاعری میں نہ معلوم اس کی وجہ کیا تھی؟ رومانی شعرا مثلاً کیٹس، شیلے، ورڈز ورتھ وغیرہ بہت پسند تھے۔ ان کی پوری کی پوری نظمیں زبانی یاد تھیں پھر اور آگے بڑھے تو ملٹن زیادہ بڑا معلوم ہونے لگا۔ گوئٹے کے بعض تراجم پڑھے تو ان سے بھی زیادہ اثر لیا۔ اسی طرح روس کے بعض ادیبوں مثلاً ٹالسٹائی، چیخوف کا مطالعہ کر کے ہمیشہ ایک خاص طرح کی خوشی محسوس ہوتی تھی۔ گورکی کو بھی پڑھا اور پسند کیا ترینوف کو بھی مگر چیخوف کے مقابلے میں کم، جن دنوں مجھے رومانک دور کے انگریزی شعراء پسند تھے اس دور میں موپساں کو بھی پڑھتا تھا اور لطف لیتا تھا مگر بعد میں زیادہ توجہ افسانوی ادب کی طرف ہوگئی۔ اسی طرح اردو میں میرامن' نذیر احمد' آزاد، حالی، پریم چند، مجنوں گورکھپوری، رشید احمد صدیقی، مولوی عبدالحق، انتظار حسین، اشفاق احمد اور جیلانی بانو پسند ہیں۔ ان کے علاوہ جو اچھی کتاب ہاتھ لگ جائے خواہ وہ کسی مصنف کی ہو۔ اور پھر سچی بات یہ ہے کہ مطالعے کے لیے اب وقت ہی کم

ملتا ہے!

رہا مطالعۂ کتاب کا انداز۔ اگر کتاب اپنی ہے پھر تو اس پر پنسل سے نشان لگاتا رہتا ہوں اور پڑھتے وقت جو کوئی بات ذہن میں آتی ہے وہ حاشیے پر لکھ بھی دیتا ہوں۔ البتہ دوسری کتابوں پر صرف نشانات پنسل سے لگا دیتا ہوں، اور بعد میں ان کے نوٹس بنا لیتا ہوں۔ میری ذاتی لائبریری میں کوئی دو ہزار کے قریب کتابیں ہیں جو مختلف موضوعات پر ہیں مثلاً شاعری، فکشن، تنقید، تاریخ اور اسلامیات وغیرہ۔ فسادات میں دلی میں میری بہت سی کتابیں ضائع ہوئیں۔ شبلی، آزاد کی کتابوں کے پہلے ایڈیشن اسی طرح برباد ہوئے۔

کتابیں مستعار دینے کے بارے میں میرا تجربہ بڑا تلخ ہے۔ اگر کوئی شخص یا طالب علم کتاب مانگے تو انکار نہیں بن پڑتا۔ بعض کتاب دے جاتے ہیں بعض بھول جاتے ہیں۔ آج کل میں کتاب مستعار لے جانے والے کا نام نوٹ کر لیتا ہوں اور بعد میں اسے یاد دہانی کرا دیتا ہوں۔ بعض رسالوں کے نمبر خصوصاً ''زمانہ'' کا پریم چند نمبر کسی کو دیا تو اس نے واپس نہیں کیا اس کا بہت افسوس ہے، اسی طرح اور بہت سی کتابیں ضائع ہوئیں۔

پرچوں میں رسالہ ''کارواں'' (مدیران: تاثیر، تاج، مجید ملک) کا انداز مجھے بے حد پسند تھا اور جی چاہتا ہے کہ کاش اس طرز کا پرچہ اب بھی کوئی نکلے۔ اس کے صرف دو شمارے نکلے تھے اور پھر بند ہو گیا۔ ہر دور میں رسائل کا انداز بدلتا رہتا ہے جس میں قاری کے ذوق کو بڑا دخل ہے ہمارے زیادہ تر رسائل اس قسم کے ہیں کہ وہ قاری کے ذوق کی تربیت کرنے کے بجائے اس کی تسکین کرتے ہیں۔

ایک چیز مسلمہ ہے اور وہ یہ کہ اب کوئی ایسا پرچہ نہیں نکلتا جس کا لوگوں کو انتظار ہو۔ جیسے ایک زمانے میں ''ادب لطیف'' اور ''ساقی'' وغیرہ ہوا کرتے تھے۔ خاص نمبروں میں بحیثیت مجموعی جو نمبر ''نگار'' اور ''نقوش'' نے نکالے ہیں وہ اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

میں اپنے بچوں کو اسی طرح کی تعلیم دینے کی کوشش کر رہا ہوں جس طرح میرے والد صاحب نے ہم بہن بھائیوں کی تربیت کی تھی۔ گھر میں ہر قسم کا رسالہ آتا ہے۔ ان کے لیے بچوں کا اچھے سے اچھا رسالہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ گھر میں بعض اوقات شعر و سخن کی محفلیں جمتی ہیں میں ان میں اپنے بچوں کو اُٹھنے بیٹھنے کا موقع دیتا ہوں تاکہ وہ اس ماحول سے فائدہ اُٹھا سکیں۔

عام تعلیم کے ساتھ بچوں میں ادبی ذوق ہونا چاہیے۔ ادب اور تہذیب میں گہرا تعلق ہے۔ ادب کے مطالعے سے بچوں میں ایک طرح کی شائستگی پیدا ہوتی ہے۔ اگر استاد اچھا ہو، گھر کا ماحول بہتر ہو تو اس سے بچے میں اچھے بُرے کا امتیاز پیدا ہوتا ہے اور طبیعت میں توازن اور ٹھہراؤ آ جاتا ہے، جس کے بغیر بچہ کسی قسم کی تعلیم سے استفادہ نہیں کر سکتا جو اس کی زندگی کی کامیابیوں کے لیے بہت ضروری ہے۔

خالص صحافت سے میرا کبھی تعلق نہیں رہا۔ ماہ ناموں کی ادارت کی جو ایک طرح کا ادبی کام ہے۔ میں سمجھتا ہوں، ادیب کے لیے کسی نہ کسی نظریۂ حیات کا قائل ہونا ضروری ہے۔ نظریہ نہ ہو، تو نہ ان کے ادب میں خلوص پیدا ہوتا ہے اور نہ جوش و جذبہ۔ ادب کی پیدائش کے لیے شرط تو بس ایک ہے کہ آدمی نظریے کی

صداقت پر سچے دل سے ایمان رکھتا ہو اور پورے خلوص سے محسوس کرے کہ انسانیت کی فلاح اور بھلائی اسی کی پابندی پر منحصر ہے۔ لیکن سب ادیبوں سے یہ توقع کرنا کہ اُن کا نظریہ ایک سا ہوگا اول تو ان کی انفرادیت اور شخصی احساس کی نفی کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ آج کل ہر ادیب کا بین الاقوامی حالات سے متاثر ہونا ناگزیر سا ہے میرے نزدیک ادیب کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ خود اپنی نظر سے زندگی کا قریب سے مشاہدہ کرے۔ خود سوچنے کی عادت ڈالے، پھر اگر اس کا کوئی نظریہ ہوگا جس کی جڑیں اس کے دل و دماغ میں پیوستہ ہوں تو وہ جو ادب پیدا کرے گا وہ مفید بھی ہوگا اور مؤثر بھی۔

میرے خیال میں ادب میں جمود کا لفظ استعمال کرتے وقت لوگوں کے پیش نظر دو باتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ نئی چیزوں کی تخلیق کم ہو رہی ہے اور دوسرے یہ کہ ادیب نے سوچنا کم کر دیا ہے۔ مگر میرے نزدیک دونوں پہلوؤں سے یہ بات غلط ہے۔ تخلیقات میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور ادیب نے سوچنا بند نہیں کیا بلکہ سارے ادیب ایک طرح سے سوچ بھی نہیں رہے۔ یہ اس بات کی سب سے بڑی علامت ہے کہ ہمارے ادب میں کوئی جمود نہیں ہے۔ یہ محض ایک نعرہ ہے۔ ادیب جس طرح دیکھتا اور چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور جس طرح سوچتا ہے اسی طرح آزادی سے اسے پیش بھی کر رہا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ آج کل ہمارے ہاں کی ادبی تخلیقات کچھ بہت زیادہ جان دار نہیں ہیں۔ اس کی اصل وجہ وہ معاشی دباؤ ہے جو ہر شخص اونچے طبقے سے لے کر نیچے کے طبقے تک محسوس کر رہا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ادیب کو جس ذہنی یکسوئی کی

ضرورت ہے، وہ اس سے محروم ہے اور اس کے اندر فکر کی وہ گہرائی نہیں آسکی جو اچھے ادیب کے لیے مطلوب ہے۔ اس لحاظ سے ہمارے معاشرے کا یہ عالم ہے کہ آج بھی کوئی شخص ادب کو پیشہ کے طور پر اپنا کر اطمینان و فراغت سے زندگی نہیں بسر کر سکتا۔

سیاسی نظریات اور تحریکات کے مطالعے کا تو مجھے موقع ملتا رہا مگر عملاً میں نے کسی سیاسی تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ جامعہ ملیہ میں جب میں تھا تو وہاں کانگریسی نقطۂ نظر رکھنے والے اساتذہ بھی تھے اور مسلم لیگی بھی مگر ان میں آپس میں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا تھا۔ اس باہمی رواداری کی جڑیں اسلامی روایات میں پیوست تھیں۔

ہمارا رہنے سہنے کا اور سوچنے کا اپنا انداز ہے۔ جس مقصد کے لیے ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا وہ مقصد یہ تھا کہ ہمیں اسلامی طرز فکر کے مطابق زندگی بسر کرنے کا موقع ملے۔ اسی طرح اردو زبان کے تحفظ کا جذبہ بھی تحریک پاکستان کے پیچھے کارفرما تھا کیوں کہ یہ زبان ہمارے تہذیبی ماضی کی سب سے بڑی امین اور سرمایہ دار ہے۔ ہندوستان میں ان دونوں کو خطرہ تھا چنانچہ ان کے تحفظ کے لیے ہم نے ایک الگ وطن کا تقاضا کیا۔

جب پاکستان نیا نیا بنا تھا تو سرکاری ملازمین میں بڑا جوش و خروش تھا اور انھوں نے شروع شروع میں تو ایسے جذبے سے کام کیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر عمل، جہاد کے جوش سے کر رہے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ حالات میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ اچھے لوگوں نے دیکھا کہ غلط راستے پر چلنے والے پھل پھول رہے ہیں تو اچھی قدروں پر سے ان کا بھروسہ اٹھ گیا لوگوں کو قائداعظم اور قائد ملت کے خلوص پر بھروسہ تھا یہ بات بعد میں نہ رہی۔

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

بھائی صاحب

پروفیسر سید اقبال عظیم

''ایسے ہوا کرتے ہیں وقار عظیم صاحب؟''

اپنے ایک شوخ اور بے تکلف دوست کا یہ جملہ مجھے آج تک یاد ہے، جو بھائی صاحب کو پہلے پہل دیکھ کر بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔ یہ بات آج سے اٹھارہ برس[1] پہلے کی ہے، جب بھائی صاحب الٰہ آباد یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر تھے۔ اور ہم سب بھائی بہن لکھنؤ میں رہا کرتے تھے۔ حسبِ معمول وہ ہمیں دیکھنے دو روز کے لیے لکھنؤ آئے تھے، دوپہر کو باہر کے کمرے میں سو رہے تھے کہ میرا یہ دوست آ گیا اور انہیں سوتا دیکھ کر مجھ سے پوچھنے لگا: ''کون صاحب ہیں؟'' میں نے جواب دیا: ''بھائی صاحب۔'' میرے اس جواب پر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کبھی حیرت سے مجھے دیکھتا، کبھی اُنہیں اور جب استعجاب کی یہ کیفیت گزر گئی تو مایوسی کی ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ اس کے منہ سے از خود یہ جملہ نکل پڑا: ''ایسے ہوا کرتے ہیں وقار عظیم صاحب؟''

اور اس میں شبہ نہیں کہ ایک شخص، جو بھائی صاحب کے متعلق سب کچھ جانتا ہو۔ ان کے ادبی مقام کو پہچانتا ہو، اور دل سے اُن کی قدر کرتا ہو، جب پہلے پہل

---

[1] یہ مضمون پہلے پہل 1954ء میں ''نقوش'' کے ''شخصیات نمبر'' میں شائع ہوا۔

اُنہیں دیکھے گا تو اسے کسی نہ کسی حد تک مایوسی ضرور ہوگی۔ اس لیے کہ دراز قد، تناسب اعضاء، اور اچھے ہاتھ پیروں کے باوجود، بے حد دبلا پتلا بدن، کشادہ پیشانی، اور ذہین آنکھوں کے باوجود بے آب و تاب اور جھریوں دار چہرہ، اور بھرپور علم وصلاحیت کے باوجود رفتار و گفتار میں انتہائی درجہ کی سادگی اور عجز ایسی چیزیں ہیں جو ''ہیرو ورشپ'' کے جذبے کو کسی طرح سیر نہیں کرسکتیں۔ خاص طور سے ایسی صورت میں کہ اُن جسمانی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے لباس کا تکلف و طمطراق بھی ضروری نہ سمجھا گیا ہو!

چنانچہ بھائی صاحب نے سوٹ کبھی نہیں پہنا۔ اس وقت بھی نہیں جب پی سی ایس کے انٹرویو کے وقت دنیا بھر نے اُنہیں سمجھایا۔ اس وقت بھی نہیں، جب شادی کے بعد بدلے ہوئے ماحول کے تقاضوں کے پیش نظر اُنہیں سوٹ کے فوائد سے بہ اصرار آگاہ کیا گیا۔ شیروانی، علی گڑھ کٹ پاجامہ اور اکہرے کالر کی قمیض ہمیشہ سے اُن کا لباس ہے۔ جس میں موسم سرما صرف مفلر کا اضافہ کر دیتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ سوٹ اور سوٹ پہننے والوں سے یا فیشن پرستوں سے اُنہیں نفرت ہے۔ بس ایک وضع ہے جو قائم ہے، ضد کو اس میں کہیں سے دخل نہیں۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ شیروانی پر ہیٹ، وہ بھی پہنتے ہیں، اور اب کم و بیش دس برس سے ''کلین شیوڈ'' بھی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ دونوں چیزیں فیشن نوازوں کی راہ سے نہ ہوں صرف ضرورتاً ہوں۔ یعنی پہلی چیز سخت دھوپ سے بچنے کے لیے اور دوسری وقت کی کفایت اور سہولت کی خاطر۔

لیکن صرف سوٹ نہ پہننے سے لباس کی سادگی پوری طرح ثابت نہیں

ہوتی۔ اس لیے کہ شیروانی اور قمیض پاجامہ میں تکلف و اہتمام کی بڑی گنجائش ہے۔ اس موقع پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ جہاں تک کپڑوں کے صاف ستھرے ہونے کا سوال ہے، بھائی صاحب محتاط ضرور ہیں، لیکن اس کے آگے ان کا معاملہ درویشوں جیسا ہے۔ شیروانی کا کپڑا کس قسم کا ہے، کس وضع، قیمت اور رنگ کا ہے، شیروانی کیسی سلی ہے، ان چیزوں سے انہیں علاقہ نہیں۔

وہ خوب سمجھتے ہیں کہ دن کو پہنے جانے والے کپڑے رات کو پہن کر سونا مناسب نہیں۔ لیکن وہ کیا کریں کہ ''سلیپنگ سوٹ'' کا تصور انہیں گوارا نہیں۔ تن زیب کا کرتہ، جالی دار بنیان، ریشمی قمیض، ازار بند، موزہ یا رومال، عطر، سینٹ، کریم، پاؤڈر، فاؤنٹین پن، اس قسم کی چیزیں ہیں جو نفاست پسندی کی دلیل سہی، لیکن ان کے لیے بے فائدہ اور غیر ضروری ہیں۔ قلم کی تو خیر مجبوری ہے۔ اس کے بغیر کام نہیں چلتا، لیکن یہ کسی طرح ضروری نہیں کہ جب گھر سے باہر نکلا جائے تو قلم کو شیروانی کی جیب میں لگا کر بھی نکلا جائے، یہی حال گھڑی کا بھی ہوتا ہے، جب کبھی ان کے حصے میں آ جاتی ہے۔

یہ سب کچھ ہے لیکن ایک پڑھا لکھا انسان کہیں سرراہ ان سے ملاقات کر لے یا اطمینان سے گھر جا کر ان سے باتیں کر لے اور ان کی شخصیت اس کے ذہن پر اپنے گہرے نقوش نہ چھوڑ جائے اور وہ قلب کی گہرائی سے ان کا احترام کرنے پر مجبور نہ ہو جائے، ناممکن۔ بلکہ احترام کا یہ جذبہ بعض صورتوں میں اس سرحد تک پہنچے گا جہاں سے مرعوب ہو جانے کی منزل شروع ہوتی ہے۔

میری اور بھائی صاحب کی عمر میں صرف ساڑھے تین برس کا فرق ہے۔

لیکن جہاں تک احساس بزرگی وخوردی کا سوال ہے عمروں کے اس فرق کو میں نے ہمیشہ اس سے کئی گنا زیادہ سمجھا ہے اور ہمیشہ ان سے مرعوب رہا ہوں، حالانکہ مرعوب ہونا میری افتادِ طبیعت کے خلاف ہے۔ چند دیرینہ احباب کو میں نے ہمیشہ کے لیئے چھوڑ دیا ہے۔ بعض اعزّا سے قطع تعلق کر بیٹھا ہوں، اور اکثر اپنے افسرانِ اعلیٰ سے بھی برسرِ پیکار رہا ہوں، صرف اس لیے کہ انہوں نے زندگی کے بعض معاملات میں مجھے مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بھائی صاحب سے میں مرعوب تھا اور مرعوب ہوں (اور یہ بات کچھ صرف میرے ہی ساتھ نہیں) یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجیے کہ سنجیدہ مزاجی، ضبط وتحمل اور وسعت نظری کے پیشِ نظر جو عمر ان کی آج ہے، میرے نزدیک ان کی وہی عمر آج سے بیس برس پہلے بھی تھی۔

جن چیزوں نے مجھے اور ان کے جاننے والوں کو ہمیشہ متاثر ہونے پر مجبور کیا ہے وہ ان کی ادبی صلاحیتوں کی عظمت اور کردار کا وقار ہے۔ ان کی ادبی حیثیت سے بحث مقصود نہیں اور اگر ان کے کردار کے متعلق یہ کہہ کر بات ختم کردوں کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے، بددیانتی سے کام نہیں لیتے، کریم النفس ہیں، رواوار ہیں، خلیق ہیں، سیر چشم ہیں، متوکل مزاج ہیں، انکسار پسند ہیں، اور وہ سب کچھ ہیں جو ایک شریف النفس اور بلند فطرت انسان کو ہونا چاہیے تو میرا یہ بیان توجہ سے نہ سُنا جائے گا۔ اس لیے کہ ایک مداح کو اپنے ممدوح کے متعلق اسی قسم کی باتیں کہنا چاہئیں۔ اس لیے اصرار کے ساتھ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ جب میں کہتا ہوں کہ جھوٹ نہیں بولتے اور بددیانت نہیں ہیں تو میرا مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کا اُنہیں سرے سے سلیقہ ہی نہیں ہے۔

نجی زندگی میں اور دوست احباب کی بے تکلف محفل میں ہم میں سے کون ہے جو کبھی کبھی از راہِ تفنن جھوٹ نہ بولتا ہو لیکن بھائی صاحب کو اس قسم کا جھوٹ بھی بولنا نہیں آتا۔ اگر وہ کبھی اس قسم کی کوشش کرنا بھی چاہیں تو آسانی سے پکڑے جائیں گے۔ اس لیے کہ زمانہ سازی' سیاست، کتر بیونت اور حیلہ جوئی نہ کبھی اُن کے بس کی چیزیں تھیں نہ اب ہیں۔ جس کا جی چاہے اُنہیں دھوکا دے جائے۔ کبھی بے خبری میں، کبھی جان بوجھ کر دھوکا کھا لیں گے، اور بعد میں اُنہیں اس کا پچھتاوا بھی نہ ہوگا۔ تحمل اور رواداری کا یہ عالم ہے کہ ہر مزاج کا آدمی ان سے خوش اور ہر مزاج کے آدمی سے وہ خوش۔ ممکن ہے کہ کبھی کسی سے وہ خفا بھی ہو جائیں، لیکن اس خفگی میں نہ شدت ہوگی، نہ تنفر۔ چنانچہ ساری زندگی اُنہوں نے فریب کھایا ہے، اور ایسا کھایا ہے کہ قدم قدم پر اُنہیں اپنی زندگی کی راہیں بدلنا پڑی ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے اُنہیں فریب دیا، آج بھی ان سے وہ متنفر نہیں ہیں۔ بلکہ جب کبھی موقع ہوتا ہے زبان و قلم دونوں سے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہیں، اور دل سے ان کی قدر کرتے ہیں۔ اس بات کو ذرا اور وضاحت سے بیان کرتا، لیکن وضاحت میں کچھ نام لینا پڑیں گے، اور نام گنوانے سے نزاکتیں پیدا ہوں گی۔ اس لیے ان کی خانگی زندگی کی دو ایک چھوٹی چھوٹی باتیں بتاتا ہوں، جن سے اُن کے کردار کا یہ رُخ سمجھ میں آ جائے گا۔

ہماری دوسری والدہ صاحبہ گو ہماری سگی خالہ تھیں، تاہم عملاً سوتیلی ماں تھیں۔ جیسے جیسے ماشاءاللہ ہمارے نئے بھائی بہنوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، فطری طور پر گھر میں تصادم کے امکانات پیدا ہوتے گئے۔ کبھی ہمیں والدہ صاحبہ

سے اور کبھی والدہ صاحبہ کو ہم سے شکایات رہنے لگیں اور یہ شکایات اکثر کشیدگی میں بھی تبدیل ہوئیں لیکن اس وقت بھی بھائی صاحب کے نزدیک گویا گھر کی فضا پہلے کی طرح خوشگوار تھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ والدہ صاحبہ کی Good Books میں تھے بلکہ وہ اُنہیں اپنا ''کماؤ بیٹا'' اور اللہ میاں کی گائے کے ناموں سے یاد کرتی تھیں اور ان کی صورت دیکھ کر باغ باغ ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ انتقال کے وقت بھائی صاحب کے نام کا وظیفہ ان کی زبان پر تھا اور برابر اصرار تھا کہ انہیں فوراً الٰہ آباد سے بلایا جائے۔ بھائی صاحب آئے اور ہمہ وقت اس طرح ان کی تیمارداری کی کہ کھانا، پینا سب کچھ چھوٹ گیا۔ بھائی صاحب ہی کے زانو پر والدہ صاحبہ نے دم توڑا۔

اپنی پہلی تصنیف بھائی صاحب نے والدہ صاحبہ ہی کے نام منسوب کی ہے، اور اس انتساب کے الفاظ بتاتے ہیں کہ انہیں ان سے کس درجہ محبت تھی۔ کوئی اپنی سگی ماں سے بھی ایسی محبت کیا کرے گا! کچھ والدہ صاحبہ ہی پر منحصر نہیں، بھائی بہن، دیگر اعزا، احباب، ہم جماعت، اساتذہ، سب سے ہمیشہ بھائی صاحب کا رویہ یہی رہا کہ انہوں نے دوسروں کی خوشنودی کو اپنی سہولت پر ترجیح دی ہے اور یہی وہ چیز ہے، جو انہیں ہر دل عزیز بناتی ہے حتیٰ کہ خود والد صاحب کو میں نے ان سے جیسی احتیاط اور احترام سے گفتگو کرتے دیکھا ہے کوئی باپ اپنی اولاد سے اس طرح بات نہیں کرتا۔ بس بھائی صاحب کے پورے ماحول کو ایک بڑا سا کنبہ سمجھ لیجیے اور انہیں اس کنبہ کا ایک فرد اور اُن کے کردار کو اس ماحول پر پھیلا دیجیے، بات سمجھ میں آ جائے گی۔

بھائی صاحب کی تعلیم ایک پنڈت جی کے مدرسے سے شروع ہوئی، جہاں ٹاٹ کی پٹیوں پر بیٹھ کر کھریا کی بنی ہوئی سفید روشنائی اور سرکنڈے کے قلم سے تختی پر لکھا جاتا تھا۔ لیکن اللہ جانے پنڈت جی نے انہیں کون سا گر سکھا دیا تھا کہ ایک دم سے ان کا داخلہ پانچویں درجے میں ہوا، اور پھر ہمیشہ صف اول کے طلبا میں شمار ہوتے رہے۔ یہ پنڈت جی ہی کی تعلیم کا اثر تھا کہ حساب اور ہندی جیسے مضامین میں بھی جو مسلمان طلباء کو راس نہیں آتے، بھائی صاحب ہمیشہ غیر معمولی طور پر نمایاں رہے، اور اپنے درجے پر حاوی۔ یہ بات بڑھ کر یہاں تک پہنچی کہ ان کا کمرہ اُن کے دوسرے ہم جماعتوں کے لیے ایک مکتب بن گیا۔ جہاں بھائی صاحب کو معلمی کے فرائض انجام دینا پڑتے تھے۔ امتحانات کے زمانے میں رات رات بھر پڑھائی ہوتی تھی اور اس حد تک ہوتی تھی کہ جب اپنی لالٹین کا تیل ختم ہو جاتا تو میونسپلٹی کی سڑک والی لالٹین اٹھ کر وہاں چلی آتی اور اپنا کام ختم کر کے صبح کو اپنی جگہ واپس چلی جاتی۔ لیکن ان دنوں میں بھی وہ پڑھتے کم تھے پڑھاتے زیادہ تھے اور جب امتحان کا نتیجہ سامنے آتا تو وہ فرق پھر بھی قائم رہتا جو معلم اور متعلمین میں قائم رہنا چاہیے!

یہ عجیب اتفاق ہے کہ تعلیم و ملازمت کے سلسلے میں بھائی صاحب کو ہند و پاک کے پانچ مشہور تعلیمی مرکزوں سے وابستگی کا موقع ملا ہے اور اس راہ میں ہر قدم پر انہیں ایسے اساتذہ، ہم جماعت اور احباب ملتے گئے، جن میں سے بیشتر ادبی دنیا میں اپنا اپنا الگ مقام رکھتے ہیں۔ چنانچہ جوبلی کالج لکھنؤ میں علی عباس حسینی اور افسر میرٹھی۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں مسعود حسن رضوی۔ الہٰ آباد یونیورسٹی میں ڈاکٹر اعجاز حسین اور احتشام حسین۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں غلام السیدین اور

رشید احمد صدیقی اور جامعہ ملیہ دہلی میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر عابد حسین ان سے اس قدر قریب رہے کہ اُن کے ادبی شعور کی تشکیل و ارتقا سے ان سب کو کسی نہ کسی طرح منسلک کیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ بتا دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ مجھے وہ دن یاد ہے جب بھائی صاحب نے ایک ادیب کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ یہ بات 1932ء کی ہے، جب گرمیوں کی تعطیل میں ہم دونوں والدین کے پاس دیہات گئے تھے، اور چھٹیوں میں وقت گزاری کے لیے کچھ کتابیں ہمارے ساتھ تھیں، جن میں پریم چند کے افسانے بھی تھے۔ بھائی صاحب نے پریم چند کے تمام افسانے پڑھ ڈالے، اور پھر ایک روز دیکھا کہ نیم کے پیڑ کے نیچے بیٹھے افسانہ لکھ رہے ہیں۔ دوسرے ہی دن یہ افسانہ کہیں چلا گیا اور کچھ دنوں بعد شائع ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک دو افسانے اور لکھے اور بس۔ ان افسانوں کا مزاج قطعاً پریم چند جیسا تھا۔ کچھ عرصے بعد میں نے انہیں پریم چند کے علاوہ علی عباس حسینی، پطرس اور رشید احمد صدیقی کی تعریف کرتے ہوئے سُنا ہے، اور اس کے بعد نیاز فتح پوری، عبدالماجد دریا آبادی اور افادی الہدی کا بھی مداح پایا ہے۔ پرانے نثاروں میں مولانا محمد حسین آزاد اور میر امن دہلوی سے زیادہ کسی اور کا ذکر میں نے اُن کی زبان سے نہیں سُنا، یوں پڑھتے وہ سب کچھ تھے اور توجہ سے پڑھتے تھے۔

شعر گوئی کا شوق بھائی صاحب کو کبھی نہ تھا، بلکہ مجھے بھی ہمیشہ اس ''تضیع اوقات'' سے روکتے رہے ہیں۔ لیکن ان کا مذاق شعری معتبر اور رواداری کے باوجود سخت گیر ہے، جب کہ موزونیِ طبع یقیناً قدرت کی طرف سے ان کے حصے

میں آئی ہے۔ چنانچہ کبھی یوں بھی ہوا ہے کہ نصابی کتاب مرتب کی جا رہی ہے، کسی خاص موضوع پر بچوں کے لیے ایک نظم کی ضرورت ہے، جو نہیں ملتی۔ اُسی وقت قلم برداشتہ پوری نظم لکھ دی ہے، اور اچھی خاصی لکھی۔ کسی شعر یا شاعر کی برائی عام طور پر وہ بلا ضرورت کبھی نہیں کرتے، لیکن شعر پسند بھی انہیں مشکل سے آتا ہے۔

قدیم شعراء میں سے ہر ایک کا وہ احترام کرتے ہیں۔ لیکن تاثر کے لحاظ سے میر، علمیت کے لحاظ سے غالب اور نہ معلوم کس لحاظ سے نظیر اکبر آبادی کو وہ بہت مؤقر جانتے تھے، اور زمانہ حال کے شعراء میں حسرت، فانی اور اصغر کے قائل تھے۔

لیکن شعر کی پسندیدگی میں شہرت کو وہ کبھی بنیاد نہیں بناتے۔ چنانچہ ماجد اؔ آبادی، جگت موہن رواں اور آل رضا لکھنوی کے درجنوں اشعار انہیں کسی زمانے میں یاد تھے، جو مزے لے لے کر دوسروں کو بھی سناتے تھے۔ اقبال کا ذکر اس سلسلے میں ضروری نہیں، کہ اُن کا معاملہ ہی الگ ہے۔ اگر بھائی صاحب بھی اُن کی عظمت کے قائل تھے اور ہیں، تو عجب نہیں۔

خاص طور سے ان دنوں ہماری زندگی کی رفتار اس قدر تیز اور ہمارے دماغ اس درجہ مصروف ہیں کہ ہمیں پیچھے مُڑ کر دیکھنے کی فرصت نہیں۔ حالانکہ ہماری موجودہ زندگی کی ساری رونق اگر غور سے دیکھیے تو ہمارے ماضی کے دم سے ہے۔ یہی سبب ہے کہ بھائی صاحب کے ان رجحانات کا ذکر ضروری سمجھا گیا، جن کا تعلق بالکل ابتدائی زندگی سے ہے۔ اُن کی مدد سے ممکن ہے کہ ان کے موجودہ رجحانات کا تجزیہ کرنے میں آسانی ہو۔ اس لیے کہ بہر حال ان کی شخصیت کا نمایاں ترین پہلو

CS CamScanner

ان کا ادبی شعور ہے۔

سب سے بعد میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ طبیعت کی اس بزرگی اور شدید علمی انہماک کے باوجود بھائی صاحب کے مزاج میں خشکی یا جمود نہیں ہے بلکہ شگفتگی اور لچک ہے، اور اپنے ماحول سے مصالحت کرنا بھی جانتے ہیں۔ چنانچہ جہاں انہوں نے اس شدت سے نمازیں پڑھی ہیں کہ کڑکڑاتے جاڑوں میں منہ اندھیرے محلے والوں کو ایک ایک کر کے فجر کی نماز کے لیے جگایا ہے اور مسجد میں خود آذانیں دی ہیں، وہاں تفریح طبع کے لیے تاش اور کیرم کھیلنے اور کثرت سے سینما دیکھنے کو بھی روا رکھا ہے۔ بوائے اسکاؤٹنگ میں دل چسپی سے حصہ لیا ہے اور بے شمار انگریزی ناول پڑھے ہیں۔ شکار کا تو انہیں مدتوں شوق رہا ہے اور بندوق کے نشانہ کی بھی اس حد تک مشق کی ہے کہ ہوائی بندوق سے اسی بندوق کے دوسرے چھرے کو مسجد کی منڈیر پر رکھ کر پے بہ پے کامیاب نشانہ لگایا ہے۔

گھوڑے کی سواری میں وہ کبھی اتنے مشاق تھے کہ منہ زور سے منہ زور گھوڑا ان کے زانو کے نیچے جا کر ایسا ہو جاتا تھا جیسے ہمارے آپ کے لیے سائیکل۔ موسیقی کا بھی انہیں ذوق ہے، اور ایک زمانہ میں خود بھی اتنے اچھے ترنم سے شعر پڑھتے تھے کہ آج اس کا تصور دشوار ہے۔ کھانا پکانا بھی وہ بہت اچھا جانتے ہیں، اور کبھی کبھی اس میدان میں ان کا اور بھابھی صاحبہ کا مقابلہ بھی ہو گیا ہے۔ اگر بھابھی صاحبہ کے خفا ہو جانے کا ڈر نہ ہوتا تو یہ بھی بتا دیتا کہ ان مقابلوں میں کبھی کبھی میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے۔ ضرورت پڑ جائے تو انہیں مشین سے اپنا پاجامہ خود سی لینے میں بھی کسی کا سہارا نہیں ڈھونڈنا پڑتا۔ اسی طرح سفر کے اہتمام، تقریبات کے

انتظام، گھر کی صفائی اور آرائش، بچوں کی پرورش اور تیمارداری میں بھی انہیں خاص ملکہ حاصل ہے۔ گویا ایک ادیب کی حیثیت سے وہ کسی وقت بھی اپنے ماحول سے فرار کی کوشش نہیں کرتے۔ بلکہ ان کی زندگی کے تمام شعبے پوری طرح ایک دوسرے میں حل ہیں۔

نہ بھائی صاحب کا کوئی اسٹڈی روم الگ ہے، نہ لائبریری۔ نہ ادبی مشاغل کے لیے کسی وقت کا تعین، بلکہ ادب اور ادب کے تمام لوازمات اُن کی گرہستی میں شامل ہیں۔ شور وغل، بچوں کی چیخ و پکار ان کے کام میں کبھی مخل نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ ادبی کاموں کو وہ اپنے لیے بوجھ نہیں بناتے۔ زندگی کے ہنگامے بھی جاری، ادبی مشاغل بھی جاری۔ چنانچہ یوں بھی ہوا ہے کہ کسی مضمون کا عنوان کاغذ پر لکھا جا چکا ہے اور بھابھی صاحبہ نے کھانے کا نوٹس دے دیا ہے۔ اتنے میں کہ کھانا نکلے اور دسترخوان پر چنا جائے فل اسکیپ کا آدھا صفحہ لکھا جا چکا جب کھانا لگ گیا تو جملہ جس جگہ ہے، اسے اسی جگہ چھوڑ کر اور مضمون سے بالکل بے تعلق ہو کر ہنسی خوشی کھانا کھایا گیا اور شام کو تفریح کے لیے نکلنے سے پہلے مضمون ختم۔ یہ ان مضامین کا حال ہے جن سے بھائی صاحب بحیثیت ادیب پہچانے جاتے ہیں۔

بالکل یہی حال ان کے مطالعے کا بھی ہے۔ ہر تازہ سے تازہ تصنیف ان کی نظر سے ضرور گزرے گی۔ لیکن یوں کہ ریڈیو کے پاس بیٹھے ہیں، خبریں بھی سُن رہے ہیں، اور کتاب بھی پڑھ رہے ہیں۔ بچہ گود میں ہے، اسے بہلا بھی رہے ہیں اور مطالعہ بھی جاری ہے۔ چنانچہ کتاب پڑھتے وقت انہیں نوٹس لیتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا، جو کچھ بھی پڑھا ہے، دماغ میں محفوظ ہے کہ جیسے ابھی ابھی کتاب پڑھ کر

اٹھے ہوں۔ بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ آپ اُن سے گفتگو کریں گے تو شاید آپ کو یہ بھی اندازہ نہ ہو کہ وہ گفتگو کے موضوع پر پوری طرح حاوی ہیں۔ لیکن جب قلم لے کر بیٹھیں گے تو سارا ضروری مواد ہاتھ باندھ کر اُن کے سامنے آ کھڑا ہوگا اور وہ دریا کی روانی کے ساتھ بغیر کہیں رُکے لکھتے چلے جائیں گے، اور جو کچھ لکھیں گے بغیر کسی خاص ترمیم و تنسیخ کے ڈاک کے حوالے کر دیں گے۔ چنانچہ اگر ان کا کوئی مضمون کہیں راہ میں گُم ہو جائے تو اس کی نقل بھی نہ ملے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایسی صورت میں کسی شدید ضرورت کے تحت اگر وہ اسی مضمون کو دوبارہ لکھنے بیٹھیں تو کم و بیش وہی چیز پھر سامنے آ جائے جو کبھی پہلے آئی تھی۔

سُننے والوں کو حیرت ہوگی کہ قلم کی اس دریا دلی کے باوجود ایک معاملے میں بھائی صاحب بہت کوتاہ قلم ہیں، یعنی خط لکھنے میں۔ جس کی شکایت ان کے دوستوں اور عزیزوں کو مستقل ہے، لیکن مجھے شکایت کی بھی اجازت نہیں۔ اس لیے کہ میرے اور اُن کے درمیان معاہدہ ہے کہ جب تک خیریت رہے گی خطوط نہ لکھے جائیں گے۔ شروع شروع میں جب کبھی اُن کا خط آتا تو اسے کھولتے ڈر لگتا تھا، لیکن شکر ہے اب کبھی کبھی اتنی مدت گزر جاتی ہے کہ خیریت کی صورت میں بھی ایک آدھ خط آ جاتا ہے۔ حالانکہ اس قسم کا طویل خط بھی دس بارہ سطروں سے زیادہ نہیں ہوتا۔

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

واؤ۔ وقار عظیم

شوکت تھانوی

بچو! یہ وقار عظیم ہیں۔ جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو یہ تم کو پڑھائیں گے۔ جلدی جلدی پڑھو تاکہ اسکول سے کالج میں پہنچو اور وقار عظیم تم کو پڑھائیں۔ سُنا ہے کہ ان کا پڑھایا ہوا لکھنے بھی لگتا ہے۔

بچو! یہ وہی وقار عظیم ہیں جو پہلے رسالہ نقوش کے ایڈیٹر تھے اور اب بھی رسالہ نقوش سے ان کو ویسی ہی محبت ہے۔ محبت تو خیر ان کی عادت بن گئی ہے۔ سب ہی سے محبت کر لیتے ہیں۔ اور یہ محبت اس لئے جڑ پکڑ لیتی ہے کہ لڑنا، دشمنی کرنا اور دشمن بنانا اُن کو آتا ہی نہیں۔ کالج میں پروفیسر ہیں مگر اداؤں میں طالب علمانہ ہیں۔ زندگی بھر میں صرف دو شوق پیدا ہوئے، پڑھنے کا شوق اور پھر پڑھا ہوا اُگلنے کے لئے لکھنے کا شوق۔

دھان پان۔ جسم بھی کچھ عجیب کلک نما پایا ہے۔ ہر وقت ہنسنے والی آنکھیں اور ان آنکھوں میں اپنے مخاطب کے لئے محبت کی چمک۔ ہوا کا تیز جھونکا آجائے تو یہ نقاد اُڑ جائے، مگر کسی ادبی بحث میں حصہ لے تو معلوم ہو کہ یہ وقار عظیم نہیں بلکہ ایک کوہ وقار ہے جو اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ بحث بھی مسکرا مسکرا کر فرمائیں گے۔ مدِ مقابل معلوم نہیں دلائل سے پس پا ہوتا ہے یا اس تبسم سے بہرحال پسپا ہوتا ضرور ہے اور اس کی پسپائی یا اپنی فتح کا بھی آپ کی صحت پر کوئی نمایاں اثر نہیں ہوتا۔ کسی پر تنقید کریں گے تو وہ

اس طرح خوش ہوگا گویا یہ نقاد اس کو داد دے رہا ہے۔ بیداد گر ہو تو ایسا۔

وقار عظیم یقیناً خوبصورت آدمی نہیں ہیں مگر ان میں حسن یقینی طور پر ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ حُسن بیاں نہ ہو سکے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بحیثیتِ مجموعی ان میں بلا کی دلکشی ہے۔ اب خواہ یہ دلکشی ان کی اُس شرافت کی ہو جو ہر وقت ان پر طاری رہتی ہے یا اُس انکسار کی جس کو باقی رکھنے کے لئے غالباً وہ دانستہ اپنی صحت خراب رکھتے ہیں۔

بچو! ان کا نام نہ بھولنا و۔ وقار عظیم

'' کچھ نقاد ہیں جو نہ زیادہ
مغرب زدہ ہیں، نہ اشتراکی اور نہ
مارکسی نظریے سے مغلوب، انہوں نے
مغرب کے اثر میں آکر مشرقی اصول
اور تنقید کو ترک نہیں کیا۔ ان کی
تنقید میں توازن اور اعتدال
ہے، انتہا پسندی نہیں، وقار عظیم
اسی قسم کے نقاد میں ..... ''

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

مشفق اُستاد، مخلص دوست

صوفی تبسم

ادبی دنیا میں سید وقار عظیم کی عظمت سے سبھی آشنا ہیں، وہ انشا پرداز بھی تھے، سخن شناس بھی، ادیب اور نقاد بھی۔ اور اُنہوں نے داستان سے افسانے تک کی کٹھن راہوں کا سفر بھی کیا تھا اور ایسے نقش قدم چھوڑ گئے کہ آئندہ آنے والوں کی رہبری و رہنمائی کی صورتیں واضح ہو گئیں۔ لیکن میری نظر ہمیشہ ان کی ذات گرامی کے دو پہلوؤں پر پڑتی رہی۔ وہ یہ کہ آپ ایک عظیم مشفق اُستاد تھے اور عظیم مخلص دوست۔

میرا ان کا تعارف بھی انہی دنوں ہوا جب انہوں نے درس و تدریس میں قدم رکھا اور آغاز ہی میں اتنی شہرت حاصل کر لی کہ میں لاہور سے چل کر جامعہ ملیہ دہلی میں ان سے جا کر ملا اور یہیں سے ہماری دوستی کا آغاز ہوا۔ لیکن دوستی بڑی مادہ زود گیر ہے۔ کبھی ایک نگاہِ غلط انداز سے اور کبھی لطف آمیز آواز سے بھڑک اٹھتی ہے۔ لیکن اس زبانہ شمع کو روشن رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے لئے ہمراہ موافق کی ضرورت پڑتی ہے۔ اشتراک کار اور اشتراکِ ذوق بھی لازم ہوتے ہیں۔

وقار عظیم صاحب اور خاکسار اکثر ملتے رہے اور ایک دوسرے کے

قریب تر ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ پاکستان بننے کے بعد ہم اُردو ایم اے کی تدریس میں ایک دوسرے کے رفیق کار بن گئے۔

کام سبھی کرتے ہیں اور خلوص سے کرتے ہیں۔ لیکن پروفیسر صاحب اپنا کام بڑی لگن اور تندہی سے کرتے تھے۔ میں تیز رفتار مزدور کی طرح کام کرنے کا عادی ہوں۔ لیکن ان کی نرم رفتاری مجھے بہت پسند آتی تھی۔ اس میں ایک خاص طرح کا لگاؤ اور چاؤ اور انہماک ہوتا تھا۔ اور میں اس سے بہت متاثر ہوتا تھا۔ مجھے اکثر یوں محسوس ہوتا کہ میں کچھ بے پرواہ سا انسان ہوں، اپنے فرائض سے غافل سا' میں ایم اے کی تدریس کے علاوہ اپنے کالج میں گھنٹوں کام کرتا اور ادبی مشاغل میں مصروف رہتا اور تھک جاتا۔ لیکن پروفیسر صاحب کو ہمیشہ شگفتہ اور تروتازہ پاتا۔ جیسے انہوں نے دن بھر ہاتھ نہ ہلایا ہو۔ یہ ان کے دھیمے مزاج، اور نرم اندازِ کار کا نتیجہ تھا۔ ان کے کام میں باقاعدگی تھی۔ جو ان کی طبیعتِ ثانیہ بن گئی تھی۔

یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد ان کے ادبی مشاغل بڑھ گئے اور وہ بہت سے تعلیمی، ثقافتی اور ادبی اداروں سے منسلک ہو گئے۔ جن میں سے بعض میں مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ ان میں سے دفتری زبان کا کام بھی تھا۔

میں اس ادارے کا سب سے پرانا رکن تھا۔ لیکن اس کی ازسرِ نو تشکیل کے بعد میں نے بعض وجوہات کی بناء پر اس سے عدم تعاون اختیار کر لیا۔ لیکن پروفیسر صاحب اپنے مخصوص انداز میں اکساتے رہے۔ یہاں تک کہ میں آمادہ

ہوگیا۔ غیر موافق حالات میں کام کرنے کی وجہ محض ان کی رفاقت تھی۔

ایسا وقت بھی آیا کہ ہم بلا ناغہ ملتے، ایک ساتھ گھر سے چلتے اور ایک ساتھ واپس آتے۔ میں گاڑی میں بیٹھ کر ہر روز 9 بجے صبح ان کے یہاں پہنچتا۔ گاڑی کے رُکنے کی آواز پر وہ فوراً باہر آ جاتے، ہاں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ خود باہر آ کر بڑے پیار سے کہتے، صوفی صاحب ایک منٹ کو اندر تشریف لے آیئے اندر جا کر دیکھتا کہ اُن کا کوئی پرانا شاگرد، وقت مقرر کر کے ان سے استفادہ کے لئے آیا تھا اب وہ جانے کو ہے۔ اور پروفیسر صاحب کھڑے کھڑے اسے آخری ہدایات دے رہے ہیں۔

اس ساری محنت اور اعانت میں کسی طرح کی مالی منفعت شامل نہیں ہوتی تھی۔ اپنے پرانے فارغ التحصیل ہونہار مگر بے کار طلبہ سے ان کا رابطہ بدستور قائم رہتا تھا۔ مجھے کبھی کسی آسامی کے لئے کسی موزوں اُمیدوار کی ضرورت لاحق ہوئی اور پروفیسر صاحب سے تذکرہ کیا تو اُنہوں نے فی الفور کسی نہ کسی ایسے حاجت مند کو میرے پاس بھیج دیا۔

میں بہت تیز مزاج اور وہ انتہائی بردبار تھے۔ میں کبھی اپنے ہم کاروں کی کوتاہیوں یا نا اہلیوں کا شکوہ کرتا تو وہ خاموشی اور سکون سے سُنتے رہتے، مگر اس طرح کہ میرا آدھا غصہ دُور ہو جاتا۔ اور جب موقع پاتے تو کہتے: ''کیا کیا جائے صوفی صاحب نالائقی کا کیا علاج اور اگر کوئی جان بوجھ کے اپنے فرائضِ منصبی سے اغماض کرے تو ہم اپنے فرائض کو کیسے فراموش کر سکتے ہیں۔'' میں سُن کر اس لئے خاموش ہو جاتا کہ ایسے نا اہل اور بیکار لوگوں کا کام وہ خود ہی سرانجام دیتے رہتے تھے۔

میں اپنی مصروفیتوں کے باعث یونیورسٹی کے پرچوں سے تنگ آ گیا تھا۔ ہر سال یونیورسٹی سے درخواست کرتا کہ مجھے اس کام سے سبکدوش کر دیا جائے لیکن وہ نہیں مانتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ پرچوں کے دیکھنے میں تاخیر ہو جاتی۔ اور محنت کے پیسے چھن جاتے۔ میں اکثر اس بات کا شکوہ پروفیسر صاحب سے کرتا۔ اور وہ سُن کر میری ہاں میں ہاں ملاتے اور کہتے: ''بڑے نالائق ہیں، انہیں معاملے کی نوعیت کو سمجھ لینا چاہیے۔''

لیکن جب پرچے آ جاتے اور میں غصے میں آتا تو فرماتے: ''آخر وہ بے چارے بھی کیا کریں، یہ کام کس کے سپرد کریں۔ مجھے دیکھئے، مریض ہونے کے باوجود یہ کام کر لیتا ہوں۔'' ایک دن میں نے چپکے سے ان کے کان میں کہا:

''پروفیسر صاحب! میری انتہائی کوشش کے باوجود دو سو پرچے پھر آ گئے۔''

وہ یہ سُن کر ہنس دیے۔ میں اپنی شکایت کو خاموشی سے پی گیا۔

واپس گھر آتے ہوئے کہنے لگے: ''میں صبح دیر میں اُٹھنے کا عادی ہوں۔ لیکن صبح چائے کی پیالی پی کر پہلے بیس پرچے ہر روز جانچ کر پھر کوئی اور کام کرتا ہوں، آپ تو ماشاء اللہ سحر خیز ہیں اور روزانہ سیر بھی کرتے ہیں۔ اگر آپ سحر خرامی سے لوٹنے پر حقے کا کش لگانے کے ساتھ ساتھ دس پرچے بھی دیکھ لیں تو یہ کام ختم ہو جائے۔''

میں نے اس تجویز پر عمل کیا۔ دو سو پرچے پندرہ دن میں ختم ہو گئے۔

اس اثنا میں، میں نے ان سے اس باقاعدگی کا بالکل تذکرہ نہیں کیا تھا۔ جب میں کامیاب ہو گیا تو انہیں خوشخبری سُنائی۔ سُن کر شاباش دی۔

میں نے عرض کیا: ''پروفیسر صاحب! واقعی آپ مشین ہیں۔''

بولے: ''انسان، مشین ہی تو ہے، مشین نہ بنے تو کیا کرے۔''

کہنے کو انہوں نے اپنے کو مشین کہہ دیا لیکن وہ ایسی مشین تھے۔ جس میں بے جان پرزوں کی جگہ خلوصِ قلب کی گرمجوشیاں تھیں۔ مروت اور ہمدردی کا جذبہ کارفرما تھا۔

مجھے یاد ہے کہ جب کبھی شام کو کسی میٹنگ سے واپس آتے تو فرماتے۔ '''صوفی صاحب! اگر زحمت نہ ہو تو دس منٹ کے لئے ایک جگہ ہوتے چلیں؟'' میں کہتا: ''ضرور۔'' فرماتے: ''بات یہ ہے وہاں ایک شاگرد ہے۔ ان کی بچی سخت بیمار ہے یا بتاتے کہ آپ فلاں آدمی کو جانتے ہیں ان کی بہن کل سے بڑی خطرناک حالت میں ہے۔''

اکثر ایسا ہوتا کہ جہاں ہم جاتے، وہاں میرا کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور نکل آتا اور مجھے ان کی وساطت سے خود تیارداری کا موقع مل جاتا۔ مجھے دل ہی دل میں اپنی بے خبری پر حیرت ہوتی۔ سوچتا نہ جانے پروفیسر صاحب کو اتنی جلدی خبریں کیسے مل جاتی ہیں۔

دوستی فقط' باہم مل کر خوش گپیاں کرنے یا بے تکلف مہمان داریوں اور باہمی سیر و تفریح کا نام نہیں۔ دلی لگاؤ مفید مشورے اور بروقت مناسب نصیحت اور رہنمائی بھی ہے۔ میری بعض علمی اور ادبی کاوشوں اور بالخصوص' امیر خسرو کی سو غزلوں کے منظوم ترجمے میں جو خاموش رہنمائی کی اور داد دی، اس کی کیفیت میرا دل ہی جانتا ہے، خاص کر راتوں کو میرے ساتھ پریس میں ہی بیٹھ کر جس وقت

نظری اور کاوش سے انہوں نے پروف پڑھے اور ساتھ ساتھ مشورے بھی دیتے گئے۔ اور سب کچھ جس اہتمام، خوش اسلوبی سے کیا وہ میں عمر بھر نہیں بھلا سکتا۔

وہ میرے بڑے محسن، مشفق اور عظیم دوست تھے۔ خدا کی رحمتیں ان پر نازل ہوں۔

وقار عظیم تاریخ تنقید میں ایک طرح سے حالی اور ترقی پسند نقادوں کے درمیان برزخ کا کام دیتے ہیں۔ ان کا انداز بے شک کلاسیکی تھا اور وہ حالی سے متاثر بھی تھے لیکن ان میں حالی کی مقصدیت اور اصلاح کی خواہش کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ اسی طرح وہ ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر ہوئے بلکہ کچھ زمانہ ان کے ہمراہ بھی چلے لیکن وہ کبھی اُنکی تخریبی تنقید اور انقلابی روش سے اتفاق نہ کر سکے۔ انہوں نے دونوں کی افراط و تفریط سے دامن بچایا اور اپنی انفرادیت کا سکہ منوایا۔

افسانے کی تنقید میں ان کا نام اتنا نمایاں ہے کہ شاید ہی کوئی نقاد ان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ اگرچہ اور بہت اصحاب نے بھی افسانے کی تاریخ و تنقید پر لکھا ہے مثلاً احتشام حسین اور احسن فاروقی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی ان کا پلہ سب پر بھاری ہے۔

مالک رام

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

ایک فردِ یگانہ

ڈاکٹر سید عبداللہ

پروفیسر سید وقار عظیم صاحب پچیس تیس برس تک میرے رفیق کار رہے۔ اس عرصہ میں میں نے جو اوصاف اور خوبیاں دیکھیں۔ ایک شریف انسان، ایک اچھے اُستاد، ایک اچھے منتظم، ایک اچھے نقاد اور ایک باصلاحیت فرد کی حیثیت سے وقار عظیم صاحب کے بارے میں میں مختصراً اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں جن بے شمار ادبا شعرا اور دوسرے لوگوں سے ملاقات کی ہے ان میں سید وقار عظیم کو ایک فرد یگانہ پایا ہے۔

پروفیسر سید وقار عظیم مجلسی اور تعلیمی سرگرمیوں میں نہایت انہماک سے حصہ لینے والے شخص تھے۔ آخری کام جو اُنہوں نے کیا اور غالباً اس کا ان کی صحت پر بہت بُرا اثر پڑا۔ وہ مجلس زبان دفتری کی لغات کی ترتیب کا کام تھا جو میں کہہ سکتا ہوں کہ صرف اُنہوں نے ہی کیا اگرچہ ہم چار پانچ لوگ اور بھی اس کے رُکن تھے۔

بحیثیت دوست کے میں نے پروفیسر سید وقار عظیم کو بڑا رازدار اور رازداں پایا۔ زندگی میں میں نے جس چیز کے بارے میں ان پر اعتماد کیا، اُنہیں اُس میں پورا اُترتا دیکھا۔ وہ سچ مچ اپنے نام کی مناسبت سے ایک باوقار آدمی بھی تھے اور ایک عظیم آدمی بھی!

پروفیسر سید وقار عظیم، حق مغفرت کرے بڑی خوبیوں کے مالک عمدہ اوصاف کے جامع تھے بطور ادیب اور نقاد اور منتظم ان کے بارے میں کچھ کہنا اس موقع پر ذرا بے محل ہوگا کہ یہ

موضوع ذرا تفصیل چاہتا ہے۔ میں چند باتیں شخصی حوالے سے کہنا چاہتا ہوں کیونکہ وہ کم و بیش بیس تیس سال میرے رفیق، دوست اور رازداں و ندیم رہے ہیں۔ انہوں نے ہر موقع پر یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ ایک سچے اور قابل اعتماد دوست ہیں اور یہ سچائی دوستی اس قدر مستحکم تھی کہ وہ اس کی خاطر ایسی ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لیتے تھے جو عام طور پر اور عام حوصلے والے شخص کے لیے ناممکن ہوتی تھیں۔

میں اس سلسلے میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ایک یوم تاسیس پر ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ جلسے سے چوبیس گھنٹے پہلے صدر نامزد نے کسی سرکاری مجبوری کی بنا پر صدارت سے معذوری کا اظہار کر دیا۔ بڑی مشکل سے ایک نئے صدر نے رات کے نو بجے رضامندی کا اظہار کیا لیکن شرط یہ لگا دی کہ خطبہ لکھا لکھایا صبح دس بجے تک انہیں مل جائے اور پھر چھپ بھی جائے۔ اب یہ کام کون کرے۔ میں گوناگوں مصروفیات میں دبا ہوا تھا۔ بہت پریشان ہوا۔ سید وقار عظیم صاحب سامنے تشریف رکھتے تھے انہوں نے تسلی دی کہ خطبہ لکھا بھی جائے گا اور جناب صدر کی منظوری کے بعد چھپ بھی جائے گا۔ صبح آٹھ بجے جب میں کالج پہنچا تو سید وقار عظیم صاحب مجھ سے پہلے خطبہ ہاتھ میں تھامے موجود تھے۔ ہر بات موزوں اور ہر نکتہ صدر نامزد کی طبع اور ہمارے مقاصد کے مطابق پھر جلسے سے پہلے پہلے چھپ کر بھی آ گیا۔ معلوم ہوا کہ سید وقار عظیم صاحب رات کئی گھنٹے لکھتے رہے اور معمولی سے آرام کے بعد کالج آئے۔ پھر تازہ دم معلوم ہوتے تھے۔ آنکھوں میں وہی ذہانت، باتوں میں وہی حوصلہ افزا ٹھہراؤ تھا۔ یہ واقعہ محض بطور نمونہ ہے۔

سید وقار عظیم کا تعاون اتنا ہمہ گیر اور پرخلوص ہوتا تھا کہ یک جان و دو قالب کی پرانی کہانی بالکل سچ ثابت معلوم ہوتی تھی۔ سید صاحب مشفق استاد تھے۔ لیکچر محنت سے تیار کرتے تھے اور پھر دھیمے انداز سے نرم رفتار سے بولتے تھے تاکہ کوتاہ قلم طالب علم بھی لکھ سکے۔ افسانوی ادب کی تنقید ان کا خاص موضوع تھا۔ سب نقادوں کی رائے ہے کہ سید وقار عظیم

افسانوی ادب کے منصف مزاج نقاد تھے۔ مگر میری ہی طرح وہ کس تخلیق کار کی حوصلہ شکنی نہ کرتے تھے۔ کمزور ناولوں اور افسانوں میں سے بھی کچھ اچھے پہلو ڈھونڈ نکال لیتے تھے۔ ان کے ذمے پنجاب یونیورسٹی میں اقبالیات کا درس بھی تھا اور اس موضوع پر ایک کتاب "اقبال۔ شاعر اور فلسفی" بھی لکھی۔ اقبالیات سے متعلق ان کی کتاب اچھی کتابوں میں سے ہے۔

وہ ایک بلند پایہ ادیب' ایک صاحبِ علم اُستاد اور وضعدار انسان تھے۔

* * *

> لاہور کے اکابر اساتذہ میں سے اچھی خاصی تعداد کو دور یا قریب سے دیکھا ہے۔ ان میں سے کتنے ہی لوگ ملے جن کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ اُن کو اُستاد نہ ہونا چاہیے تھا۔
>
> لیکن سید وقار عظیم کو دیکھ کر اور جان کر دل نے گواہی دی کہ ان کو اُستاد ہی ہونا چاہیے تھا بلکہ دل میں تمنا سی ہوئی کہ اے کاش باضابطہ طالب علم بن کر ان سے استفادہ کیا جا سکتا! حق یہ ہے کہ اگر سید وقار عظیم جیسے بہت سے ادیب اور اساتذہ ادب اور تعلیم کے دائروں میں انسان گری کی خدمت انجام دیں تو قوم کی کایا پلٹ سکتی ہے۔
>
> نعیم صدیقی

* * *

(ایک تاثر)

احسان دانش

جب بھی گلزار شرافت پہ نکھار آئے گا
اشک بھر آئیں گے اور ذکر وقار آئے گا
وہ تیری بات میں نرمی تیرے لہجے کی مٹھاس
کس طرح قلب عزیزاں کو قرار آئے گا
جس نے دیکھی ہے تیری شام کی علمی تقسیم
اب وہ شب کون سی محفل میں گزار آئے گا
تجھ سا اُستاد کہاں آج زمانے کو نصیب
تجھ سا کب دوسرا افسانہ نگار آئے گا
تیرے مرنے سے کئی لوگ ہیں جینے سے خفا
یوں خفا، جیسے سکوں زیر فرار آئے گا
تیری آواز کو اب کون سُنے گا دانش
لاکھ تو شہر خموشاں میں پکار آئے گا

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

وقار صاحب

ڈاکٹر جمیل جالبی

ہمارے اسکول میں دو مقابلے ہر سال ہوتے۔ ایک مقابلۂ افسانہ نگاری اور ایک مقابلۂ بیت بازی۔ میٹرک میں آیا تو مقابلے کے لیے میں نے بھی افسانہ لکھا۔ مولوی صاحب نے اسے دیکھا، اصلاح دی اور کہا اچھا لکھا ہے۔ لیکن تم کچھ افسانہ نگاری کے بارے میں بھی پڑھ لو تا کہ معلوم ہو جائے کہ جدید افسانے کی کیا خصوصیات ہیں اور اس میں کن کن باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے، ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ اسکول کی لائبریری میں دو کتابیں اس موضوع پر موجود ہیں۔ ایک کا نام ''فن افسانہ نگاری'' ہے اور دوسری کا نام ''ہمارے افسانے'' ہے۔ یہ کتابیں لائبریری سے نکلوائیں تو ایک بات سے میں خاص طور پر متاثر ہوا کہ ان دونوں کتابوں کے مصنف ایک ہی تھے اور ان کا نام تھا وقار عظیم۔ وقار عظیم سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔ یہ 1942ء کی بات ہے۔

کتابیں پڑھیں تو بہت سی باتیں نئی معلوم ہوئیں۔ کچھ سمجھ میں آئیں۔ کچھ نہیں آئیں۔ لیکن ان کتابوں کو پڑھنے کے بعد یہ ضرور ہوا کہ ہم خود کو بہت عالم و فاضل سمجھنے لگے۔ لڑکپن میں آدمی کا یہی رویہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی کم علمی کو علم کی انتہا سمجھ کر دوسروں پر جتاتا ہے اور پتلا خون، جوش سے معمور، اپنی ذات کا

طرح طرح سے اظہار کرتا ہے۔ بہت سے انگریزی الفاظ بھی میں نے اُنہی کتابوں سے سیکھے تھے۔ مثلاً الیگری، آرٹسٹک ٹرتھ، کلائمیکس، یونیٹی آف امپریشن وغیرہ۔ ایڈگر ایلن پو کے نام سے بھی میں انہیں کتابوں سے واقف ہوا تھا۔ جدید افسانے پر بات ہوتی، یا میں خود چھیڑتا تو بحث کے دوران سند ہمیشہ وقار عظیم کی کتابوں سے لاتا۔ مجھے یاد ہے کہ اس ضد بحث میں یہ کتابیں میرے بہت سے ہم جماعتوں نے پڑھی تھیں۔ کالج پہنچے تو ادب کا چسکا اور بڑھا۔ بڑی لائبریری، آزاد فضاء، اچھے اُستاد۔ رسالے کتابیں اوڑھنا بچھونا بن گئے۔ رسالوں میں وقار عظیم صاحب کی تحریر نظر آتی تو اسے بڑے شوق سے پڑھتا۔ آج کل، ساقی، ادیب وغیرہ اس زمانے کے مقبول رسالے تھے اور ان میں وقار صاحب کی تحریریں اکثر نظر آتیں۔ پھر وقار صاحب کی ایک اور کتاب پڑھی۔ ''نیا افسانہ'' اس کے مطالعے سے وقار صاحب کی عظمت کا سکہ دل پر اور بیٹھ گیا اور اشتیاق پیدا ہوا کہ اب کے دلی گئے تو وہاں دو آدمیوں سے ضرور ملیں گے۔ ایک ساقی کے ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی سے اور دوسرے وقار عظیم صاحب سے۔ دلّی گئے تو حلیم شریف کھا کر اور چند کتابیں خرید کر واپس آ گئے۔ ایک تو وہاں کوئی تعارف کرانے والا نہ ملا اور جو تھا بھی وہ دلی میں نہیں تھا۔ جیسے گئے ویسے آ گئے۔

یونہی وقت گزرتا گیا۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی اور آزادی کا نعرہ فضا میں گونجنے لگا۔ مسلم لیگ و کانگریس، ہندو مسلمان۔ بھارت پاکستان۔ ہندو مسلم فسادات نے ہولناک صورت اختیار کر لی اور سارے برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آزادی آئی اور دو ملک۔ پاکستان اور بھارت وجود میں آ گئے۔

CS CamScanner

جو جہاں تھا وہاں نہ رہا۔ سارا ہندوستان اُجڑا تو کراچی شہر بسا۔ برصغیر کے بڑے بڑے ادیب اور نامور شخصیتیں یہاں آ کر جمع ہو گئیں۔ کس کس کا نام لیں گے۔ سبھی تو تھے۔ وہ بھی جن کا نام سُنا تھا اور دیکھنے کی آرزو تھی۔ اور وہ بھی جن کا نام نہ سُنا تھا اور نہ دیکھنے کی آرزو تھی۔ شاہد صاحب سے بھی یہیں ملاقات ہوئی۔ وقار عظیم صاحب بھی یہیں ملے۔ صمد شاہین اور ممتاز شیریں بھی یہیں ملے، مولوی عبدالحق، اختر حسین رائے پوری، قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی، ن م راشد، غلام عباس، قرۃ العین حیدر، علامہ شبیر احمد عثمانی، سید سلیمان ندوی اور بہت سے دوسرے مشاہیر سے بھی یہیں ملاقات ہوئی۔ اس زمانے میں وقار عظیم صاحب ’’ماہِ نو‘‘ کے ایڈیٹر تھے اور ’’ماہِ نو‘‘ اُردو زبان و ادب کا ایک کثیر الاشاعت ماہنامہ تھا۔ اچھا مواد، اچھی طباعت، خوب پڑھا جاتا تھا، یہ ’’ماہِ نو‘‘ کے عروج کا زمانہ تھا۔ وقار عظیم صاحب نے اس سرکاری پرچے کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ ایک دن دفتر گیا تو معلوم ہوا کہ وقار صاحب بیمار ہیں۔ میں اور ڈاکٹر صمد شاہین گھر گئے تو وہ پلنگ پر دراز تھے۔ بہت کمزور نظر آئے۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود بڑے تپاک سے ملے۔ ان کے چہرے کی مسکراہٹ اسی طرح بیدار تھی۔ ان کے اخلاق کی روشنی اسی طرح ان کے سارے وجود سے پھوٹ رہی تھی۔ ان کے مزاج کی نفاست، باتوں کی حلاوت، طبیعت کی انکساری، نفس کی شرافت اور ان کی وضع داری اسی طرح زندہ و باقی تھی۔ ان کی خوبی یہ تھی کہ جب وہ اپنے چھوٹے یا کم مرتبہ لوگوں سے بات کرتے تو چھوٹوں کو اپنے چھوٹے پن کا احساس نہ ہوتا بلکہ ان سے مل کر ان کے اندر ایک نیا اعتماد جنم لیتا۔

میں اس زمانے میں طالب علم تھا۔ کتابیں پڑھنا اور اہل علم و ادب کی صحبت سے فیض یاب ہونا میرا واحد مشغلہ تھا۔ اس عرصے میں وقار عظیم صاحب سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ دفتر میں بھی اور گھر پر بھی۔ اکیلے بھی اور شاہد احمد دہلوی کے ساتھ بھی۔ لیکن میں نے انہیں ہمیشہ خلیق اور روادار پایا۔ انہماک کے ساتھ کام میں لگے ہوتے۔ لیکن مسکراہٹ اور وضع داری میں فرق نہ آتا۔

دمے کی وجہ سے ان کی صحت خراب ہوگئی اور وہ اکثر بیمار رہنے لگے۔ ڈاکٹروں اور دوستوں کے مشوروں کے بعد اُنہوں نے طے کیا کہ کراچی چھوڑ کر لاہور چلے جائیں۔ ایک دن ملاقات ہوئی تو کہنے لگے کہ لاہور جا رہا ہوں۔ اورینٹل کالج میں تقرر ہوگیا ہے۔

پھر وہ چلے گئے اور ایسے گئے کہ وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اور آج وہیں کی مٹی میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ لیکن کراچی سے چلے جانے کے باوجود ان کی وضع داری اسی طرح قائم رہی۔ جب بھی کراچی آتے تو ضرور ملتے۔ دنیا بھر کی باتیں ہوتیں۔ گھنٹوں یونہی گزر جاتے۔ ہمیشہ اپنے داماد محبوب علی صاحب کے ہاں ٹھہرتے۔ جیسے نیر چہیتی، ویسے ہی داماد چہیتے، اور ان دونوں سے زیادہ ان کے بچے چہیتے۔ میں نے بیٹی داماد کے ہاں اُنہیں ہمیشہ خوش و مطمئن پایا۔ آخری بار ان سے ملاقات شاہد خان صاحب کے گھر پر ہوئی۔ وقار صاحب ترقی اُردو بورڈ کی میٹنگ میں آئے تھے۔ وقت کم تھا۔ فون کیا۔ میں گیا۔ گھنٹہ بھر بیٹھا۔ گھر کی، باہر کی، لاہور کی، کراچی کی، ادب کی، ادیبوں کی۔ تحریروں کی، کتابوں کی باتیں ہوئیں۔ پھر وہ ایر پورٹ چلے گئے اور میں گھر آ گیا۔ چند دنوں بعد محبوب علی صاحب نے

اطلاع دی کہ بھائی صاحب (وقار عظیم صاحب کو وہ یونہی پکارتے تھے) سخت بیمار ہیں، ہسپتال میں داخل ہیں۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ جسم کا سارا خون نکال کر نیا خون دیا جائے گا۔ وہ گھبرائے ہوئے تھے۔ میں بھی گھبرا گیا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وقار صاحب اچانک یوں اور اتنے بیمار ہو جائیں گے۔ میں نے دوسرے دن، پھر تیسرے دن ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ مسلسل بے ہوش ہیں۔ دوائیں تھک گئی ہیں۔ ڈاکٹر مجبور ہو گئے ہیں۔ دعا کی ضرورت ہے۔ پھر سُنا کہ وقار صاحب وفات پا گئے ہیں۔ جلدی جلدی کئی دوستوں کو فون کیا۔ لاہور ٹیلی فون کیا تو اس خبر کی تصدیق ہو گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب جو وقار صاحب کے بارے میں سوچتا ہوں تو ان کی شرافت کے نقوش دل و دماغ پر اور گہرے ہو جاتے ہیں۔ بہت سی یادیں ہیں جو بادل کی طرح ماضی کے افق سے اُبھر رہی ہیں۔ ڈھاکہ میں پاکستان کے سارے ادیب جمع تھے۔ وقار صاحب، شاہد احمد دہلوی اور میں ایک ساتھ تھے۔ ہم دن بھر بازاروں میں گھومتے۔ ڈاب پیتے، کیلے اور اناس کھاتے۔ تھک جاتے تو کسی ہوٹل میں چائے پیتے۔ زور زور سے ہنستے۔ فقرے بازی کرتے۔ ایک دوسرے کو نئے نئے لطیفے سُناتے۔ اور شام گئے ہوٹل واپس آ جاتے۔ ایک دن بازار گئے۔ ہم سب نے کچھ نہ کچھ خریدا۔ میں نے دوکان دار کو سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔ اُس نے کہا اگر کھلا ہو تو دے دیجیے۔ وقار صاحب نے ساڑھے چھ روپے نکال کر دے دیئے۔ بات آئی گئی ہوئی۔ میں یہ رقم اُنہیں واپس کرنا بھول گیا۔ کراچی آیا تو خیال آیا۔ میں نے پوسٹل پے آرڈر بنوایا اور رجسٹری سے اُنہیں لاہور بھیج دیا۔ فوراً ان کا خط

آیا۔ لکھا تھا: ''بھائی میں ایسا گیا گزرا بھی نہیں کہ یہ رقم آپ سے واپس لوں۔'' میں نے لکھا کہ شیخ سعدی نے گلستان میں جو رئیس کا واقعہ لکھا ہے اس میں یہ بات بتائی ہے کہ مروت اور معاملہ کو الگ الگ رکھو۔ آپ نے جو رقم دوکان دار کو میری طرف سے دی تھی وہ معاملہ تھا۔ اب جو آپ یہ رقم نہیں لے رہے ہیں تو یہ مروت ہے۔ لیکن میں معاملے کو مروت کے ساتھ، شیخ سعدی کی نصیحت کے مطابق خلط ملط نہیں کرنا چاہتا۔ اگر آپ ساڑھے چھ روپے نہیں لیں گے تو شیخ سعدی بھی بُرا مانیں گے اور میں بھی۔ اس بات سے بہت محظوظ ہوئے اور جواب میں بہت اچھا محبت بھرا خط لکھا۔

وقار صاحب کی سب سے بڑی خوبی ان کی انسانیت تھی۔ وہ مثبت رویے کے انسان تھے۔ اس لیے اختلافی امور میں ان کے دوست احباب اور عزیز و اقارب ان سے ہی رجوع کرتے اور وہ بڑی خوش اسلوبی سے گتھیوں کو سلجھا دیتے۔ وہ نرم دل، نرم خو، نرم مزاج آدمی تھے۔ دوسروں کی تکلیف ان کی اپنی تکلیف بن جاتی تھی اس لیے دوسروں کے لیے بھی وہ ویسے ہی بھاگ دوڑ کرتے جیسے اپنے لیے کرتے۔

طالب علموں میں بھی وہ اسی لیے ہر دل عزیز تھے۔ ایک تو اچھے قابل اُستاد، خوب پڑھ کر دل سے پڑھاتے، پھر طلبہ سے باپ جیسی شفقت برتتے۔ ان کی رہنمائی کرتے، ان کی مدد کرتے۔ ان سے محبت کرتے۔ جن طلبہ نے ان کی نگرانی میں کام کیا ہے اور اپنے مقالے اور پی ایچ ڈی کے تھیسس لکھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وقار صاحب نے ان مقالوں کی تیاری میں خود کتنی محنت کی ہے۔ محنت ان کی زندگی کی کامیابی کا جوہر تھا۔ مستقل مزاجی نے اس میں رنگ بھرے تھے۔ وہ جس

کام پر لگتے اسے نہایت ذمہ داری، تن دہی اور توجہ سے انجام تک پہنچاتے۔ اسی لیے جو کام بھی اُنہوں نے شروع کیا اسے پورا کیا۔ امتیاز علی تاج کی وفات کے بعد اُنہوں نے وہ سارے ڈرامے مرتب کیے جنہیں تاج صاحب اپنی بے وقت موت کی وجہ سے ادھورے چھوڑ گئے تھے۔ کئی سال سے دفتر میں اُردو اصطلاحات پر کام کر رہے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ وفات سے چند ہفتے پہلے یہ کام نہ صرف مکمل ہو گیا۔ بلکہ چھپ کر بھی سامنے آ گیا۔ میں اس کام کو وقار عظیم صاحب کا ایک عظیم کارنامہ سمجھتا ہوں۔

''فن افسانہ نگاری'' وقار عظیم صاحب کی پہلی تصنیف ہے جو غالباً 1934، 1935ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کو اُنہوں نے اپنی والدہ صاحبہ کے نام معنون کیا تھا جن کا انتقال غالباً اُسی زمانے میں ہوا تھا۔ اُنہوں نے لکھا تھا کہ ''اب آنسوؤں کے چند قطروں اور درد کی کچھ ٹیسوں کے ساتھ اپنی اس ناچیز تصنیف کو اپنی والدہ کی روح کے نام معنون کرتا ہوں جو بہشت کے ہر گوشے میں دوسری خواتین کو یہ حقیر تحفہ دکھا دکھا کر کہیں گی کہ یہ میرے بچے کی پہلی تصنیف ہے۔'' اس کے فوراً بعد اُن کی دوسری تصنیف ''ہمارے افسانے'' شائع ہوئی۔ ان دونوں کتابوں سے ان کی شہرت پھیل گئی۔ 1946ء میں ''نیا افسانہ'' کے نام سے ان کی تیسری تصنیف شائع ہوئی جس نے ان کی شہرت کو چار چاند لگا دیے۔

وقار صاحب نے شروع ہی سے افسانے کو اپنا موضوع بنایا تھا اور آخر دم تک وہ اس موضوع پر لکھتے رہے۔ ان کی دوسری دو اور تصانیف ''ہماری داستانیں'' اور ''داستان سے افسانے تک'' پاکستان میں شائع ہوئیں۔

وہ اُردو کے واحد نقاد ہیں جنہوں نے ساری توجہ قدیم و جدید فکشن پر صرف کی۔ ان کے علاوہ انہوں نے مختلف موضوعات پر مضامین بھی لکھے۔ امانت کی ''اندر سبھا'' کو مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا۔ اقبال ان کا محبوب شاعر تھا۔ ان کی تصنیف ''اقبال شاعر اور فلسفی'' ابھی چند سال پہلے شائع ہوئی تھی۔ ان کے علاوہ ان کے بہت سے مضامین ہیں۔ جو مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہیں۔

وقار صاحب ایک سلجھے ہوئے ذہن کے مالک تھے۔ یہی خوبی ان کی تحریر میں نظر آتی ہے۔ انہیں باوقار و سنجیدہ انداز میں اپنی بات کہنے اور پڑھنے والوں تک پہنچانے کا ڈھنگ آتا تھا۔ اسی لیے ان کی تحریریں ہر قسم کے الجھاؤ اور ابہام سے پاک ہیں۔ وہ الفاظ کے بے جا صرف سے اجتناب کرتے تھے۔ جو بات کہتے کم سے کم لفظوں میں صفائی اور وضاحت کے ساتھ کہتے۔ اگر اختلاف بھی کرتے تو لہجے میں تلخی نہ آتی۔ وہ تو دوستوں کے لیے بھی محبت تھے اور دشمنوں کے لیے بھی۔ صلح جوئی ان کا ایمان تھا۔ شرافت و انسانیت ان کا دین تھا۔ ان کی تحریریں اسی وجہ سے دل آزاری اور نفرت کی دھول سے پاک ہیں۔

افسانہ، داستان اور فکشن پر اُردو میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں وقار صاحب کی تحریریں سب سے ممتاز و منفرد ہیں۔ وقار صاحب اُردو کے وہ نقاد ہیں جنہوں نے اُردو افسانہ اور فکشن کو ایک باوقار اور سنجیدہ صنفِ ادب بنانے میں اہم اور بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اب وقار صاحب ہم میں نہیں ہیں۔ لیکن اُن کی یاد اُن کے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کے دلوں کو ہمیشہ گرماتی رہے گی، اور اُن کی تحریریں آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ بنی رہیں گی۔

CS CamScanner

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

روشنی کا مینار

ڈاکٹر عبادت بریلوی

پروفیسر سیّد وقار عظیم ایک عظیم انسان، ایک شفیق استاد، ایک مخلص دوست، ایک نامور ادیب، ایک منفرد نقاد اور ایک صاحب طرز انشاء پرداز تھے۔ اُن کی ساری زندگی درس و تدریس اور علم و ادب کی آبیاری میں گذری۔ تقریباً نصف صدی تک وہ علمی ادبی کاموں میں مصروف رہے اور اپنی شگفتہ و شاداب تحریروں سے رنگ و نور کے دریا بہاتے رہے۔

میں جوبلی کالج لکھنؤ سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کر کے جب فرسٹ ایئر میں گیا تو اُن سے میرا غائبانہ تعارف ہوا۔ اُن کے چھوٹے بھائی سیّد معراج عظیم مرحوم اُس زمانے میں میرے ساتھ پڑھتے تھے اور ہر وقت میرا اُن کا ساتھ رہتا تھا۔ ایک دن وہ اپنے ساتھ ایک نئی شائع شدہ کتاب لائے جس کا نام تھا ''افسانہ نگاری'' اور اس کے مصنف تھے سیّد وقار عظیم!

انہوں نے مجھے یہ کتاب دکھائی اور کہا کہ'' یہ کتاب میرے بڑے بھائی سیّد وقار عظیم صاحب نے لکھی ہے اور الٰہ آباد میں چھپی ہے۔ وقار بھائی آج کل الٰہ آباد ہی میں رہتے ہیں۔ الٰہ آباد یونیورسٹی سے انہوں نے فرسٹ ڈویژن میں ایم۔ اے اُردو کیا ہے۔ انٹرمیڈیٹ انہوں نے ہمارے جوبلی کالج ہی سے کیا تھا۔ اور وہ

یہاں کے اچھے طالب علموں میں شمار ہوتے تھے۔ ہمارے اُستاد حامد اللہ افسر صاحب کے وہ بھی شاگرد رہ چکے ہیں۔ آج کل الہ آباد میں اُن کا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں گزرتا ہے۔"

میں نے اُن سے کتاب لے کر دیکھی، اور دو تین دن کے لئے اس کو گھر لے گیا۔ شروع سے آخر تک اس کو پڑھا۔ معلومات میں اضافہ ہوا، اور لطف آیا۔ افسانہ نگاری کے فن سے شناسائی بھی ہوئی، اور اس فن کو سمجھنے کا شعور بھی میرے اندر بیدار ہوا، اور وقار صاحب کی عظمت کے نقوش بھی میرے دل پر ثبت ہوئے۔

یہ وقار صاحب سے میرا غائبانہ تعارف تھا۔

معراج دو سال میرے ساتھ رہے۔ ہم لوگوں نے ایک ہی سال انٹرمیڈیٹ کا امتحان دیا، اور پاس ہو کر یونیورسٹی میں چلے گئے۔ لیکن معراج عظیم اسی زمانے میں ٹی بی کے موذی مرض میں مبتلا ہوئے اور بالآخر اُن کا انتقال ہو گیا۔ آج بھی اُن کی معصوم شخصیت کی تصویر میری آنکھوں میں سمائی ہوئی ہے۔

میں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو وہاں یہ خبر سُنی کہ وقار عظیم صاحب لیکچرار کی حیثیت سے یونیورسٹی میں آنے والے ہیں۔ اُن کا تقرر ہو چکا ہے۔ لیکن ابھی اُن کے لکھنؤ آنے میں کچھ وقت اور لگے گا۔ پھر دو تین مہینے گذرنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ وقار عظیم صاحب کا تقرر کسی وجہ سے نہ ہو سکا، اور اب اُن کی جگہ سید احتشام حسین صاحب یونیورسٹی میں اُردو کے اُستاد کی حیثیت سے آنے والے ہیں۔ اُن کا باقاعدہ طور پر تقرر ہو چکا ہے۔ چنانچہ احتشام حسین صاحب آ گئے۔ انہوں نے پڑھانا شروع کر دیا۔ ہم لوگوں کو وقار صاحب سے استفادے کا موقعہ نہ مل سکا۔ چند مہینے کے بعد یہ خبر ملی کہ انہیں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ملازمت مل گئی

ہے، اور انہوں نے وہاں پڑھانا شروع کر دیا ہے۔

اس عرصے میں، میں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے اُردو میں بی اے آنرز اور ایم۔ اے کیا، اور پھر مجھے اینگلو عربک کالج دہلی میں اُردو کے لیکچرار کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ چنانچہ میری ملاقات وقار صاحب سے دِلّی ہی میں ہوئی۔ جامعہ ملیہ میں چند سال گزارنے کے بعد وہ دہلی پولی ٹیکنیک میں اُردو کے اُستاد کی حیثیت سے آ گئے تھے۔ یہ کالج کشمیری دروازے کے باہر تھا۔

ایک دن پولی ٹیکنیک میں کوئی ادبی جلسہ تھا۔ اس جلسے میں شرکت کی دعوت مجھے بھی دی گئی تھی۔ میں وقت سے کچھ پہلے ہی پولی ٹیکنیک پہنچ گیا۔ وقار صاحب جلسے کے انتظامات میں مصروف نظر آئے۔ میں پچھلی نشست پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ چند لمحے بھی نہیں گزرے تھے کہ وہ میرے پاس آئے اور کہا:

''اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو میرے خیال میں آپ عبادت صاحب ہیں؟''

میں نے کہا: ''جی ہاں! آپ سے ملنے اور دوسرے ادیبوں کو دیکھنے کی خواہش مجھے اس جلسے میں کھینچ لائی ہے۔'' وہ بڑی شفقت اور محبت سے کہنے لگے:

''بہت اچھا ہوا کہ آپ آ گئے۔ آپ سے ملنے اور باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا۔''

میں نے کہا: ''آپ کی نوازش ہے۔ آپ سے غائبانہ ملاقات تو کئی سال قبل ہو چکی تھی۔ معراج عظیم نے آپ کا تفصیلی تعارف کروایا تھا۔ آپ کی کتاب بھی مجھے پڑھنے کے لئے دی تھی۔ آپ کے مضامین بھی رسالوں میں پڑھے تھے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ آج آپ سے نیاز حاصل ہو گیا۔''

پھر انہوں نے پوچھا: ''اینگلو عربک کالج میں آپ کا دل لگ گیا؟''

میں نے کہا: ''ابھی تو میں نیا نیا یہاں آیا ہوں۔ زندگی میں پہلی دفعہ لکھنؤ کو چھوڑا ہے۔ دلّی لکھنؤ سے مختلف شہر ہے۔ شروع شروع میں تو طبیعت گھبرائی لیکن اب دل لگ گیا ہے۔ کالج کا ماحول اچھا ہے۔ رفقائے کار محبت سے ملتے ہیں۔ طالب علم بڑے ہی مہذب اور شائستہ ہیں۔ پڑھنے لکھنے کا ماحول بھی ہے۔ اس لئے میرا دل لگ گیا ہے۔''

کہنے لگے: ''اچھا ہوا۔ آپ کو یہاں ادبی کام کرنے کا اچھا موقعہ ملے گا۔''

پھر کہا: ''آپ بیٹھیے۔ جلسہ شروع ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے۔ میں چند منٹ کی اجازت چاہتا ہوں۔ کسی کو بھیج کر پان منگوالوں۔ بیگم کی فرمائش ہے۔ کہیں بھول نہ جاؤں۔''

میں نے کہا: ''آپ مصروف رہیے۔ میں وقت سے ذرا پہلے آ گیا ہوں۔''

کہنے لگے: ''بس، اب لوگ آتے ہی ہوں گے۔ اچھا ہوا کہ آپ جلسہ شروع ہونے سے قبل آ گئے۔ لوگوں سے ملاقاتیں ہو جائیں گی۔''

چند منٹ گذرے تھے کہ پروفیسر حمید احمد خان صاحب، ڈاکٹر تاثیر، فیض صاحب، حفیظ جالندھری اور بخاری صاحب آ گئے اور میں ان سے باتیں کرنے لگا۔

وقار صاحب سے پہلی ہی ملاقات میں میں اُن کی محبت، شفقت، ذہانت

CS CamScanner

اور تہذیب و شائستگی سے بہت متاثر ہوا۔ جلسہ شروع ہونے سے قبل، اور اس کے بعد انہوں نے مجھ سے دیر تک باتیں کیں۔ ادیبوں سے میرا تعارف کروایا، اور یہ کہہ کر مجھے رخصت کیا کہ ''میں تیمار پور میں رہتا ہوں۔ کسی روز گھر پر آیئے تا کہ ذرا تفصیلی ملاقات ہو۔ کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بے تکلفی سے بتایئے۔''

اس طرح کبھی پولی ٹیکنیک میں کبھی اُن کی جائے قیام پر اور کبھی حمیدہ سلطان صاحبہ کے ہاں سری رام روڈ پر اُن سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ دِلّی کے دوران قیام میں اُن کی وجہ سے مجھے ڈھارس رہی۔ ایک بزرگ مجھے مل گیا، اور یہ میرے لئے دِلّی کے سے اجنبی شہر میں بہت بڑا سہارا تھا۔

کچھ عرصے بعد وقار عظیم صاحب رسالہ ''آج کل'' کے ایڈیٹر ہو گئے، اور علی پور روڈ پر حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات کے دفتر میں باقاعدگی سے بیٹھنے لگے۔ یہاں تقریباً ہر دوسرے تیسرے روز اُن سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ میں یونیورسٹی میں ایم۔ اے کی کلاس کو لیکچر دے کر واپسی پر اُن کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ کر اینگلو عربک کالج واپس آتا تھا۔

اور پھر پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا۔ وقار صاحب پاکستان جانے کی تیاری کرنے لگے، اور اُن ریلوں میں سے ایک میں مع اپنے خاندان اور عملے کے کراچی چلے گئے جو پاکستان کی وفاقی حکومت کے ملازمین کو لے کر نئی دِلّی کے اسٹیشن سے روانہ ہوتی تھیں۔ جب وقار صاحب روانہ ہوئے ہیں تو میں نئی دِلّی کے اسٹیشن پر موجود تھا۔ میں نے انہیں خدا حافظ کہا، اور وہ ناسازگار حالات کے باوجود خیریت سے کراچی پہنچ گئے جہاں سے انہوں نے کئی سال تک ''ماہِ نو'' نکالا۔

میں مجبوراً تقسیم ہند کے موقعہ پر برپا ہونے والے آشوب قیامت کو برداشت کرنے کے لئے کچھ عرصے دلّی ہی میں رہا جب آگ اور خون کے دریاؤں کو تیر کر لاہور پہنچا تو وقار صاحب اس وقت ''ماہِ نو'' کی ملازمت کو چھوڑ کر اُستاد کی حیثیت سے اورینٹل کالج لاہور میں آ گئے تھے۔ یہاں اُن کے ساتھ مجھے تقریباً ربع صدی تک کام کرنے کا موقع ملا۔ اور اس طرح اُن کی دلکش شخصیت کے بے شمار پہلو میری آنکھوں کے سامنے آئے۔

دِلّی سے جب میں لاہور پہنچا، اور پہلے دن اورینٹل کالج میں گیا تو وقار صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ اس زمانے میں کالج کی دوسری منزل پر اس کمرے میں بیٹھتے تھے جس میں تقسیم ہند سے قبل ڈاکٹر لکشمن سروپ بیٹھتے اور کام کرتے تھے۔ اُن کی لائبریری بھی اسی کمرے میں تھی۔ ڈاکٹر عبداللہ سے مل کر میں اوپر پہنچا، اور اُن کے کمرے میں گیا تو دیکھا کہ وہ کتابوں اور کاغذوں میں گھرے ہوئے بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور بڑی خندہ پیشانی سے ملے۔ مجھے گلے لگایا اور بڑی محبت سے اپنے پاس بٹھایا۔ حال احوال پوچھا، اور کہنے لگے: ''آپ کے آنے کا علم ہو گیا تھا، اور میں بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ شکر ہے کہ آپ بخیریت لاہور پہنچ گئے۔''

میں نے کہا: ''نہ جانے یہاں پہنچنے کے لئے کیا کیا جتن کئے ہیں۔ آفر تو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے سال بھر ہوا مل گیا تھا۔ لیکن دلّی سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ مولانا آزاد، ڈاکٹر ذاکر صاحب اور پروفیسر مرزا محمود بیگ صاحب، اینگلو عربک کالج کے مفاد کے پیش نظر مجھے وہاں

نمایاں نظر آتا تھا اس میں میدانوں میں بہتے ہوئے دریا کی سی روانی تھی۔ اس میں ایک ساحرانہ انداز تھا جو پڑھنے والے کے حواس پر چھا جاتا تھا، اور اس میں اُس کو ایک ایسی لذت ملتی تھی جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے وقار صاحب کی شگفتہ و شاداب تحریروں سے بہت کچھ سیکھا، اور انہوں نے جو راستہ بنایا تھا، اس پر حتی الامکان چلنے کی کوشش کی۔ یہ اور بات ہے کہ میری تحریروں میں عشر عشیر بھی وہ بات پیدا نہ ہو سکی جس سے اُن کی تحریر پہچانی جاتی ہے، یعنی شگفتگی اور شادابی اور الفاظ کو نگینوں کی طرح جڑنے والی کیفیت جو نثر کو بھی شاعری کے قالب میں ڈھال دیتی ہے۔

وقار صاحب بہت بڑے محقق، نقاد اور ادیب تھے۔ انہوں نے اُردو داستانوں پر تحقیق کی، اور تقریبا تمام اہم داستانوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا۔ اس لحاظ سے اُن کی کتاب ''ہماری داستانیں'' تحقیق و تنقید کا ایک شاہکار ہے۔ انہوں نے افسانے پر تحقیقی اور تنقیدی کام کیا، اور اس اعتبار سے اُن کی کتابیں فنِ افسانہ نگاری، ہمارے افسانے اور داستان سے افسانے تک' فن افسانہ نویسی پر اصولی اور عملی تنقید کی ایسی کتابیں ہیں جو منفرد حیثیت رکھتی ہیں، اور جن سے افسانے سے دلچسپی رکھنے والے ہمیشہ استفادہ کرتے رہیں گے۔ انہوں نے قدیم و جدید اُردو شعراء پر ایسے مقالات لکھے ہیں جن سے اُردو شاعری کی مزاج دانی کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ انہوں نے فورٹ ولیم کالج کے مصنفین پر اعلے درجے کا تحقیقی کام کیا ہے جو اُردو ادب میں ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے ریڈیو پر بے شمار تقریریں کی ہیں، تبصرے لکھے ہیں، فیچر تحریر

CS CamScanner

کے زمانے میں جو کاری زخم لگے تھے، اُن پر کسی نے مرہم رکھ دیا ہے، اور وہ زخم مندمل ہونا شروع ہو گئے ہیں۔

اب میں زیادہ وقت وقار صاحب ہی کے ساتھ اُن کے کمرے میں گذارتا تھا۔ یہاں ڈاکٹر محمد باقر اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب اور شہر کے کچھ دوسرے ادیب بھی آجاتے تھے۔ اُن کی باتوں میں اچھا وقت گزر جاتا تھا۔ وقار صاحب کی میز پر کاغذات بکھرے رہتے تھے، چائے کا دور چلتا رہتا تھا، باتیں ہوتی رہتی تھیں اور وقار صاحب اپنے کاموں میں مصروف رہتے تھے، کبھی کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں، کبھی کوئی رسالہ اُن کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس کے مطالعے میں مصروف ہیں۔ کبھی کچھ لکھ رہے ہیں، کبھی کوئی طالب علم آگیا تو اُس کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ غرض وقار صاحب کے کام کبھی رُکتے نہیں تھے۔ میں نے ایسی یکسوئی کسی اور شخص میں نہیں دیکھی۔

وقار صاحب نے اسی زمانے میں نیا مکان ممن آباد میں لے لیا تھا، اور اس کو بڑے سلیقے سے سجایا تھا۔ اُن کے مکان پر بھی ملنے والوں کے آنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ میں بھی اکثر شام کو اُن کے پاس چلا جاتا تھا۔ وقار صاحب گھر پر آنے والوں سے بڑی خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ اطلاع ملتے ہی فوراً باہر آجاتے تھے۔ مصافحہ کرتے اور گلے لگاتے تھے، اور آنے والوں کا پُرتپاک استقبال کر کے ڈرائنگ روم میں لے جاتے تھے جہاں وقار صاحب کے ساتھ، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ڈرائنگ روم کی ہر چیز اُن کا خیر مقدم کر رہی ہے۔ وقار صاحب نے اپنے اس کمرے کو اس طرح سجایا تھا کہ اس کی ہر چیز یہاں آنے والوں کو دعوتِ نظارہ دیتی

تھی، اوران لوگوں کے لئے وقار صاحب کی دلکش و دلآویز شخصیت سے ملاقات اور اُن کے اس کمرے کی ہر چیز کا حسن و جمال ایک عجب طرح کا تفریحی تجربہ ہوتا تھا۔ وقار صاحب بڑی محبت سے انہیں بٹھاتے تھے۔ اُن سے دیر تک دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ پھر چائے منگواتے تھے۔ اس کا دور چلتا تھا۔ چائے کے ساتھ مزے دار کھانے کی چیزیں بھی ہوتی تھیں۔ پھر چاندی کا خاصدان آجاتا تھا۔ جس میں لکھنوی انداز کی پان کی گلوریاں ملنے والوں کو پیش کی جاتی تھیں۔ یہ لوگ ان پانوں سے شوق کرتے تھے، اور اپنے آپ کو سرخرو محسوس کرتے تھے۔

وقار صاحب کا مکان ایسا کچھ زیادہ کشادہ نہیں تھا لیکن اس مکان میں نہایت خوبصورت لان تھا۔ اور اس لان میں دو تین نہایت حسین درخت تھے۔ برآمدے میں چند کرسیاں پڑی رہتی تھیں، اور چھوٹی سی گول میز پر تازہ پھولوں کا ایک گلدستہ رکھا رہتا تھا۔ ڈرائنگ روم میں دو صوفے اور ایک تخت مشرق و مغرب کے امتزاج کا احساس دلاتا تھا۔ تخت پر گاؤ تکیے ضرور ہوتے تھے۔ اور رنگ رنگ کے خوبصورت قالین فرش پر اپنی بہار دکھاتے تھے۔ صفائی کا یہ عالم تھا کہ ہر چیز چمکتی ہوئی نظر آتی تھی۔

مجھے تو اکثر وہ اپنے مطالعے کے کمرے میں بُلا لیتے تھے۔ وہاں ایک تخت تھا جس پر وقار صاحب بیٹھ کر کام کرتے تھے اور چاروں طرف کتابوں کی الماریاں تھیں۔ کاغذات اور فائلیں تخت پر بکھری رہتی تھیں، اور وقار صاحب باتیں بھی کرتے جاتے تھے، اور کام بھی جاری رہتا تھا۔ اُن کے بچے بھی آجاتے تھے، کوئی اُن کے پاس بیٹھتا تھا۔ کوئی میری گود میں آجاتا تھا، کوئی وقار صاحب کو گود میں بیٹھنے

کی کوشش کرتا تھا۔ وقار صاحب اُن کی طرف بھی متوجہ ہوتے تھے۔ لیکن اس عالم میں بھی اُن کا کام نہیں رُکتا تھا۔ قلم چلتا رہتا تھا۔

میں نے ایک دن اُن سے پوچھا: ''بچوں اور ملاقاتیوں کی وجہ سے آپ کا دھیان تو نہیں بٹتا؟''

کہنے لگے: ''اب اس کی عادت سی ہوگئی ہے۔ آدمی کو عادت ہو جائے تو پھر کوئی چیز اس کے کام میں رُکاوٹ پیدا نہیں کرتی۔ میں اسی طرح کام کرتا رہتا ہوں۔ بلکہ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ سنجیدہ کام میں بچے اور ملنے والے سہارا بنتے ہیں۔ ان کی وجہ سے کسل دور ہو جاتا ہے۔ تھکن ختم ہو جاتی ہے، اور کام کچھ دیر رُکنے اور دم لینے کے بعد رواں دواں ہو جاتا ہے۔''

میں نے کسی اور لکھنے والے کو اس طرح کام کرتے ہوئے نہیں دیکھا جس طرح وقار صاحب کرتے تھے۔ اُن کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں ہوتا تھا۔ وہ ان تھک کام کرنے والے تھے۔ اُن کے اندر قدرت نے ہر حال میں لکھتے رہنے کی عجیب وغریب صلاحیت پیدا کر دی تھی، اور وقار صاحب اس سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھاتے تھے۔ انہوں نے گذشتہ نصف صدی میں ہزار ہا صفحات لکھے اور اُن کی ان تحریروں سے اُردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا۔

پروفیسر وقار عظیم صاحب ایک صاحب طرز انشاء پرداز تھے۔ اُن کی تحریر میں بڑی ہی شگفتگی اور شادابی تھی۔ وہ الفاظ کو نگینوں کی طرح جڑنے میں مہارت رکھتے تھے۔ اور اس طرح گل وگلزار کھلانے اور رنگ ونور کے دریا بہانے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ اُن کی تحریر نہایت سادہ اور پُرکار تھی اس میں ایک تہذیب کا عکس

CS CamScanner

کیے ہیں جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے، اِن تحریروں سے اسلامیان ہند کی سیاست، معاشرت، تہذیب اور ادب وشعر کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔

غرض وقار صاحب بہت بڑے لکھنے والے تھے، اُنھوں نے اپنی تحریروں سے اُردو زبان وادب کے ان گنت پہلوؤں کی جس طرح نقاب کشائی کی ہے، اور ادبی روایت کے خلاؤں کو جس طرح پُر کیا ہے، اُس میں اُن کا کوئی ثانی نہیں۔ ایک محقق، نقاد، ادیب اور انشاء پرداز کی حیثیت سے اُن کا نام اُردو کی ادبی تاریخ کے افق پر ہمیشہ ہمیشہ ایک درخشندہ ستارے کی طرح جگمگا تا رہے گا۔

وقار صاحب محقق، نقاد اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم انسان بھی تھے۔ انسان دوستی اُن کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اُن کی ادبی مصروفیات کبھی اُن کی اِن راہوں میں حائل نہیں ہوئیں وہ ایک نرم دل انسان، ایک ذمہ دار شوہر، ایک محبت کرنے والے باپ، ایک شفیق اُستاد، ایک مخلص دوست اور ایک ایسے بزرگ تھے جن کی حیثیت صحیح معنوں میں ایک شجر سایہ دار کی تھی۔

وہ ہر ایک کا دل ہاتھ میں لیتے تھے۔ کسی کو تکلیف اور پریشانی میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لوگوں کی مدد کرنے میں اُن کا جواب نہیں تھا۔ لوگوں سے پوچھتے رہتے تھے کہ کوئی ضرورت مند آپ کی نظر میں ہے؟ جس ضرورت مند کا علم ہو جاتا، اُس کی مختلف طریقوں سے مدد کرتے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ پڑھنے لکھنے والوں کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔ کسی کی مالی امداد کر دی، کسی کو نوکری دلا دی، کسی کو

کاروبار کروا دیا، کسی کو کوئی کام آپڑا تو اُس کی سفارش کر دی۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی جب خود اُن کی آمدنی ایسی کچھ زیادہ نہیں تھی، وہ اپنے ساتھیوں کی اس طرح مدد کرتے تھے کہ اُس کو کوئی علمی کام دلا دیتے تھے جس سے اس کی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی، اور جب وہ برسرِ روزگار ہو گئے، اور جب اُن کی آمدنی خاصی ہوگئی تو وہ اس کا اچھا خاصا حصہ ایسے لوگوں پر صرف کر دیتے تھے جو کوئی علمی ادبی کام کرنا چاہتے تھے۔

ایک دن مجھ سے کہنے لگے: ''عبادت صاحب! میرے پاس کچھ پیسے ہیں۔ کوئی ایسا آدمی تلاش کیجیے جو صحیح معنوں میں ضرورت مند ہو۔''

میں نے کہا: ''میرے پاس تو صرف طالب علم ہیں جن کو مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔'' نام بتایا تو وہ رقم اس کو بُلا کر دے دی۔ شرط یہ لگائی کہ وہ محنت سے کام کرے اور اچھا نتیجہ دکھائے۔ ہر سال خدا جانے کتنے طالب علموں کی وہ مدد کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بعض طالب علموں کی وہ فیسیں دیتے تھے۔ ضروری کتابیں اور کاپیاں اُن کے لئے خرید کر بھجواتے تھے۔ تھیسز ٹائپ ہوتے تھے تو اس کی اُجرت وہ ادا کرتے تھے۔ غرض وقار صاحب کی وجہ سے کسی کا کام رُکتا نہیں تھا۔

اور پھر طالب علموں کو زندگی میں سیٹل Settle کرنے کے لئے بھی وہ نہ جانے کیا کیا جتن کرتے تھے۔ لڑکیوں کے لئے رشتے تک تلاش کرتے تھے۔

ایک دن مجھ سے کہنے لگے: ''شام کو میرے ساتھ چلئے۔ ایک مسئلہ آپڑا ہے۔ آپ میرے ساتھ ہوں تو اچھا ہے۔'' میں شام کو اُن کے ہاں پہنچا۔

کہنے لگے: ''ایک شاگرد لڑکی کے گھر جانا ہے۔ اُس کی شادی کا مسئلہ

ہے۔ اُس کے ماں باپ صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہم سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔''

میں اُن کے ساتھ ہولیا۔ اور ہم لوگ اُن کی موٹر میں کوئی گھنٹہ بھر سفر کر کے اُس لڑکی کے گھر پہنچے۔ اُس کے والدین ہمارے منتظر تھے۔ وقار صاحب نے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ وہاں صرف کیا، اور اپنی صائب رائے کچھ اس طرح دی کہ اُس کے ماں باپ مان گئے۔ انہوں نے ہماری تجویز کو قبول کر لیا، اور اس طرح وہ مسئلہ بخیر وخوبی حل ہو گیا۔

ایک دن مجھ سے کہنے لگے: ''آج ایک عجب واقعہ ہوا۔ آپ کی اور میری ایک شاگرد لڑکی میرے پاس آئی اور اُس نے زار و قطار رونا شروع کیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو اُس نے ایک خط نکال کر مجھے دیا، یہ خط ایک معمر شخص کا تھا، لیکن اُس نے یہ لکھا تھا کہ تم بہت خوبصورت ہو، تمہارے بال بالکل ریشم کی طرح ہیں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہارا پرستار ہوں۔''

میں نے از راہ تفنن کہا: ''ہم لوگ اس معاملے میں کیا کر سکتے ہیں، یہ تو دل کا معاملہ ہے۔''

وقار صاحب کہنے لگے: ''بات تو صحیح ہے۔ لیکن یہ لڑکی بہت پریشان ہے۔ اس معاملے کو کسی طرح ختم ہونا چاہیے۔''

میں چُپ رہا۔

دو تین دن کے بعد وقار صاحب نے کہا: ''شام کو اس لڑکی کے گھر جانا ہے۔ اس کو تسلی دینا ہے۔ اُس کو ماں باپ کو بھی سمجھانا ہے۔ ان دو تین دنوں میں

کچھ اور واقعات بھی رونما ہوئے ہیں۔ کیا آپ شام کو میرے ساتھ چلیں گے؟“

میں نے کہا: ”میں حاضر ہوں۔“

شام کو میں وقار صاحب کے ہاں پہنچا، اور ہم لوگ اس لڑکی کے گھر گئے۔ اس لڑکی کو تسلی دی۔ اُس کے ماں باپ کو بھی اعتماد میں لیا، اُن کو بھی سمجھایا، اور وقار صاحب کے تدبّر نے اس بیماری کے لئے ایک ایسا علاج تجویز کیا جس سے اُس معمر شخص کا نشہ ہرن ہوگیا۔

یہ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں، لیکن وقار صاحب اِن باتوں کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ وہ اپنے ہر طالب علم کے ذاتی معاملات و مسائل تک کو حل کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر طالب علم انہیں اپنا مُربی، رہنما اور باپ خیال کرتا تھا، اور اُن کی شفقت اور محبت کے سائے میں اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتا تھا۔

واقعی وقار صاحب صحیح معنوں میں ایک ایسے عظیم اُستاد تھے جو اپنے طالب علموں کی شخصیت اور کردار کو بنانا اور سنوارنا اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے۔

وقار صاحب بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔ اُن کا ہر لیکچر علم کا ایک خزانہ ہوتا تھا، جس کو وہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے میں طالب علموں کے سینوں میں اُتار دیتے تھے، اور انہیں اس کے بعد اس خاص موضوع کے بارے میں کسی کتاب کو پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی تھی۔ وقار صاحب بڑی محنت سے اپنا ہر لیکچر تیار کرتے تھے، اور ضروری حوالوں کے ساتھ اپنے خیالات طالب علموں تک پہنچاتے تھے۔ انہوں نے تقریباً پچیس سال تک اورینٹل کالج میں علامہ اقبال اور اُردو ناول اور افسانے پر بلا مبالغہ ہزاروں کی تعداد میں لیکچر دیئے اور علم و ادب کے ایسے دریا بہائے جن

CS CamScanner

سے آج بھی طالب علم اپنے علمی کھیتوں کی آبیاری کرتے ہیں۔ اقبال، اُردو فکشن اور اُردو نثر پر جو گراں قدر مقالات انہوں نے لکھے ہیں اور جو کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکے ہیں، اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے بڑے عالم اور کیسے عظیم اُستاد تھے۔

ادب وقار صاحب کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ شب و روز وہ ادبی کاموں میں مصروف رہتے تھے لیکن گھریلو زندگی کو چلانے میں بھی وہ بڑی باقاعدگی سے اپنا کردار ادا کرتے تھے۔ اپنی بیگم صاحبہ اور بچوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ بیگم کی طبیعت کبھی ناساز ہوتی تو وہ باورچی خانے تک کو سنبھال لیتے تھے۔ گھر کی دیکھ بھال میں پوری طرح حصہ لیتے تھے۔ صبح کو جب وہ گھر سے نکلتے تو اُن کے ساتھ گھریلو کاموں کی ایک فہرست ہوتی تھی۔ جس میں بیگم کے لئے پان، پھل اور مٹھائی اور بچوں کے لئے کتابیں، کاپیاں، کپڑے اور کھلونے تک خریدنے کی تفصیل درج ہوتی تھی۔ اپنی منصبی مصروفیات سے فارغ ہو کر وہ بازار جاتے تھے، اور صبح کو بنائی ہوئی فہرست کے مطابق سارے کام کر کے لدے پھندے دوپہر کو گھر پہنچتے تھے۔ سب گھر والوں کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ پھر تھوڑی دیر آرام کرتے تھے۔ چار بجے چائے کی ایک پیالی پی کر اپنا علمی کام شروع کر دیتے تھے۔ مغرب کے وقت تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ سہ پہر کو ملنے والے بھی آ جاتے تھے۔ اُن سے باتیں کرتے اور اُن کے مسائل بھی حل کرتے تھے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو وقار صاحب کی زندگی نظم و ضبط سے بھرپور اور بڑی ہی باقاعدہ تھی۔ وہ مشین کی طرح کام کرتے تھے۔ میں نے کبھی اُن کو

CS CamScanner

بیکار بیٹھے ہوئے نہیں دیکھا۔

پروفیسر وقار عظیم صاحب ایک عظیم تہذیبی روایت کے علم بردار اور بڑے ہی مہذب اور شائستہ انسان تھے۔ ان کا اخلاق بہت بلند تھا۔ وضع داری اُن کی شخصیت کا زیور تھی۔ انہوں نے زندگی بھر اپنی وضع نہیں بدلی۔ کبھی مغربی لباس نہیں پہنا۔ ہمیشہ علی گڑھ کٹ کی شیروانی اور پاجامے میں نظر آئے، اور شیروانی کے بٹن گرمیوں میں بھی بند رکھتے تھے۔ اُن کی اس وضع میں کبھی فرق نہیں آیا۔ وہ بڑے ہی باذوق انسان تھے، اور حسن و جمال کی مشرقی روایت گویا اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس کا اثر اُن کے لباس میں بھی نظر آتا تھا، اور اُن کے گھر میں بھی۔ وہ زیادہ تر تخت یا فرش پر بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ مغربی انداز میں میز کرسی پر بیٹھ کر کام نہیں کرتے تھے۔ مہمان نوازی میں اُن کا جواب نہیں تھا۔ کوئی اجنبی بھی اُن کے پاس آتا تو اُس کی بھی چائے سے تواضع کی جاتی تھی۔ اپنے بچوں کی انہوں نے ایسی تربیت کی تھی کہ وہ تہذیبی اعتبار سے اُن کا نقش ثانی معلوم ہوتے تھے۔ آج تک وہ سب کے سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔

وقار صاحب کی شخصیت ایک چشمۂ شیریں تھی۔ اسی وجہ سے ہر مزاج اور عمر کے لوگ اُن کے گرد جمع رہتے تھے۔ وہ اِن میں سے ہر ایک سے نہایت تپاک سے ملتے تھے، اور جو ضرورت مند اُن کے پاس آتے تھے، اُن کی ضروریات پوری کر دیتے تھے۔ کوئی اُن کے پاس سے مایوس اور ناکام واپس نہیں جاتا تھا۔ ادیبوں اور شاعروں کا تو اُن کے ہاں جمگھٹا رہتا تھا، اور وہ اِن سب کی مختلف طریقوں سے ہمت افزائی کرتے تھے۔ ادب و شعر کی محفلیں اُن کا روزانہ کا معمول تھا۔ اُن کا گھر ادب و شعر کا مرکز تھا۔ کبھی

مشاعرہ ہو رہا ہے، کبھی کوئی مضمون پڑھا جا رہا ہے، کبھی افسانے کی محفل منعقد کی جا رہی ہے، کبھی ادبی مسائل پر گفتگو ہو رہی ہے۔ وقار صاحب ہمیشہ اس میں پیش پیش رہتے تھے۔ یہی اُن کی تفریح تھی۔

ہم سب کے لئے وقار صاحب ایک شفیق بزرگ، ایک مخلص دوست، ایک عظیم رہنما، ایک بے مثال مدبّر اور ایک بے نظیر استاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ اُن کے ہوتے ہوئے ہم لوگوں کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہم پر سایہ کئے ہوئے ہیں، اور ہم سب اُن کی عظیم شخصیت کے سائے میں محفوظ و مسرور ہیں۔

انہیں روشنی کا ایک مینار اور ایک شجر سایہ دار کہا جائے تو بے جا نہیں!

* * *

لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس کر کے الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے لیے وہ آئے۔ وہ ذہین ہونے کے علاوہ محنتی بھی تھے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ کام کرنے لگے ہیں تو مسلسل بارہ گھنٹے تک اپنی جگہ سے اُٹھے نہیں۔ حسب اُمید وقار عظیم صاحب نے ایم۔ اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔

وقار صاحب متعدد کتابیں لکھ کر نمایاں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اُن سے یہی اُمید تھی خدا کا شکر ہے کہ پوری ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین[1]

---

[1] ڈاکٹر اعجاز حسین الٰہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے سربراہ رہے۔ "مختصر تاریخ ادب اُردو ان کی مشہور تصنیف ہے۔ وقار عظیم صاحب ان کے شاگرد تھے۔

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

ملاقاتیں

انتظار حسین

ادیبوں میں شیروانی تو بس اب ایک ہی جسم پر باقی رہ گئی ہے۔ کم از کم لاہور کی حد تک، جس طرح بعض ادیب سائیکل سے شروع ہوئے تھے اور اب کار میں بیٹھتے ہیں۔ اسی طرح کتنے ہی ادیب شیروانی سے شروع ہوئے تھے اور اب سوٹ میں ملبوس نظر آتے ہیں مگر پروفیسر سید وقار عظیم ایک وضعداری کے ساتھ شیروانی سے نبھائے جا رہے ہیں اور شیروانی بھی اس چھریرے بدن سے ایسی مانوس ہوئی ہے کہ اس رکھ رکھاؤ والی شخصیت کا حصہ بن گئی ہے۔

یہی شیروانی والی وضعداری اس بزرگ کی تنقید میں بھی نظر آتی ہے۔ جو رکھ رکھاؤ چلن میں ہے، وہی تحریر میں بھی ہے۔ وقار صاحب کی تنقید سے کبھی کسی آبگینے کو ٹھیس نہیں لگی۔ ایسے بھی تو نقاد ہوتے ہیں کہ تیر چلاتے اور نشتر لگاتے چلتے ہیں، مگر وقار صاحب تنقید کیا لکھتے ہیں پھول بکھیرتے ہیں۔

وقار صاحب اُردو کے نقادوں میں سب سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ وہ فکشن کے اکلوتے نقاد ہیں۔ ممتاز شیریں نے بھی یہ راہ اختیار کی تھی مگر پہلے وہ خاموش ہوئیں، پھر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

میرا یہ جاننے کو جی چاہا کہ آخر وقار صاحب نے یہ راہ کیوں پکڑی۔ ہمارے ہاں

CS CamScanner

تو نقاد ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ شاعری پر تنقید لکھے۔ وقار صاحب نے بتایا کہ الٰہ آباد یونیورسٹی میں ایک اُستاد تھے۔ دیپ صاحب جنہیں فکشن سے بہت شغف تھا۔ انہوں نے مجھے فکشن کے بارے میں کتابیں پڑھنے کو دیں۔ وہاں سے مجھے فکشن پر لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ سیدھی سادی وجہ تو یہی ہوئی مگر لگتا ہے کہ اصل معاملہ اور ہے۔ بات یہ ہے کہ وقار صاحب نے جب آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا تو اپنے ہر بزرگ کو شاعر پایا۔ والد صاحب بھی شاعر، نانا بھی شاعر، ماموں جان بھی شاعر، نانا کا تخلص ادیب، ایک ماموں کا تخلص طبیب، دوسرے ماموں کا تخلص لبیب، نانا کو تاریخ گوئی کا چسکا تھا، ماموں جان ایسے شعر لکھتے تھے:

مہندی لاکر بھی نہ دی اور سُنائیں لاکھوں
رنگ آیا میری آنکھوں میں حنا سے پہلے

سوچئے کہ جب گھر کا گھر شاعر ہو تو نقاد بننے کی کیا تک رہ جاتی ہے۔ لڑائی گھر سے تو شروع نہیں کی جا سکتی۔ عافیت اسی میں دیکھی کہ افسانہ و ناول پر لکھا جائے۔ ابھی طالب علمی ہی کی منزل میں تھے کہ یکمشت دو کتابیں لکھ ڈالیں۔ ایک کا عنوان تھا: ''فن افسانہ نگاری'' دوسری کا عنوان تھا: ''ہمارے افسانے''۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ چھپیں کیسے۔ خوش قسمتی سے الٰہ آباد میں ایک ناشر تھا جس نے ان سے درسی کتابیں لکھوائیں تھیں مگر معاوضہ ادا کرنے سے پہلو تہی کر رہا تھا۔ آخر اس پر آ کر معاملہ ٹھہرا کہ تم ہماری یہ دو کتابیں چھاپ دو، ہم سمجھ لیں گے کہ ہمیں ہمارے کام کا معاوضہ مل گیا۔ اس طرح یہ دو کتابیں چھپیں اور اردو فکشن کی تنقید کا حرف آغاز بنیں۔

1936ء میں لکھنؤ میں پہلی کُل ہند ترقی پسند کانفرنس ہوئی۔ اس میں الٰہ آباد

کے دو طالب علم بھی شریک ہوئے۔ ایک احتشام حسین، دوسرے سید وقار عظیم۔ اس کے بعد علی گڑھ کی راہ لی۔ وہاں سے بی ٹی کیا۔ بی ٹی کرنے کے بعد جامعہ ملیہ میں استاد بن گئے۔ جامعہ ملیہ والے بھی ٹھوک بجا کر استاد رکھتے تھے۔ پہلے ہی ایسا نقشہ دکھاتے تھے کہ آیا ہوا آدمی بھاگ جائے۔ پروفیسر مجیب نے خبردار کیا کہ: ''دیکھئے یہاں سب سے اونچی تنخواہ اسی روپے ہیں اور وہ صرف ڈاکٹر ذاکر صاحب اور عابد صاحب کو ملتی ہے۔ آپ کی تنخواہ ساٹھ روپے ماہوار ہوگی''۔

''منظور ہے۔''

''مگر ملیں گے چالیس۔''

''جی؟''

''جی ہاں، ہم تنخواہ کا صرف تین....''

یہ شرط بھی منظور ہوئی اور وقار صاحب جامعہ ملیہ میں استاد بن گئے اور اس طرح الہٰ آباد، لکھنؤ، کانپور، علی گڑھ اور مختلف قصبوں کی خاک چھان کر دلی میں آ رہے۔ پہلے جامعہ ملیہ میں، پھر پولی ٹیکنیک میں، پھر رسالہ آج کل میں۔ اس زمانے میں دلی میں افسانہ نگاروں کا جمگھٹا تھا۔ بیدی، کرشن چندر، منٹو، اشک وغیرہ وغیرہ۔ مگر غریبوں کو نقاد میسر نہیں آ رہا تھا۔ جو نقاد اُٹھتا تھا نظم آزاد پر رواں ہو جاتا تھا۔ ایسے میں انہوں نے وقار صاحب کو ایک نعمت غیر مترقبہ جانا۔ افسانہ نگاروں کو ایک نقاد مل گیا۔ نقاد کو ایک پورا میدان بلا شرکت غیرے مل گیا۔ افسانے پر تنقید لکھتے چلے گئے:

یہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

وقار صاحب نے یوں شاعری پر بھی بہت لکھا ہے بلکہ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے

CS CamScanner

شاعری پر کہیں زیادہ لکھا ہے مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ ان کی شناخت تو افسانے ہی کی تنقید سے ہوئی تھی۔ اب بے شک وہ اور موضوعات پر لکھتے رہیں اور نہ لکھیں، پہچانے جائیں گے افسانے ہی کے نقاد کی حیثیت سے۔ شاعری کے بارے میں وہ بے شک دفتر لکھ ڈالیں مگر شاعری انہیں بخشوائے گی نہیں۔

آج کل وقار صاحب کی مصروفیات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ غریب افسانہ ان مصروفیات میں کہیں دب کر رہ گیا ہے مگر وقار صاحب آج کے افسانے سے بالکل بے خبر بھی نہیں ہیں۔ افسانے نے جو نئی راہ پکڑی ہے اس پر ان کی نظر ہے۔ علامتی افسانے پر انہیں اعتراض یہ ہے کہ علامت کے چکر میں افسانے سے کہانی رخصت ہو گئی ہے اور اس لیے اس کے قارئین کا حلقہ محدود سے محدود تر ہو گیا ہے۔

* * *

''ہمارے ادبی اکابرین میں حالی سا فرشتہ سیرت انسان کم از کم میری نگاہ سے نہیں گزرا۔ سید وقار عظیم کو بھی کسی کو بُرا کہتے نہ سنا اپنی رائے ایسے پیرائے میں ظاہر کرتے تھے کہ چبھن محسوس نہ ہو۔ ہم کبھی کوئی بات کہہ بھی دیں تو ہاتھ کی ایک جنبش سے مسکرا کر ٹال دیتے تھے۔ درگزر اُن کی طبیعت کا جوہر تھا۔''

ابن انشاء

* * *

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

ایک دھیمی شخصیت

انتظار حسین

ہمارے زمانے میں ایک شخص تھا جسے کبھی کسی نے قہقہہ لگاتے اور اونچی آواز سے بولتے نہیں دیکھا۔ اس پُر شور زمانے میں پہچانے جانے والے اونچا بول کر پہچانے جاتے ہیں مگر اسی پُر شور زمانے میں وقار صاحب دھیمے لہجہ میں بول کر اور زیر لب مسکرا کر ممتاز ہوئے اور کل وقار صاحب دھیما بولتے بولتے چُپ ہو گئے۔

حکیم اجمل خان کے متعلق دیکھنے والوں نے بتایا کہ وہ حکیم اپنی پوری زندگی میں کبھی اونچی آواز میں نہیں بولا، کبھی قہقہہ نہیں لگایا، کبھی تیز قدم اُٹھا کر نہیں چلا، نتیجہ یہ نکالا کہ یہ شائستگی انہیں باہر سے نہیں ملی تھی اس نے ان کے اندر سے نشوونما کی تھی۔ شائستگی تہذیب ہی کی دین نہیں ہوتی پیدائشی بھی ہوتی ہے۔

دبلے پتلے، برمن شیروانی، گلے میں مفلر، اگر ہاتھ میں چھتری لے لیتے اور چہرہ مسکراتا نہ ہوتا تو سو فیصدی مولانا حالی بن جاتے۔ شیروانی تو خیر اور وضعدار بزرگوں پر بھی بہت بجی مگر مفلر اردو ادب میں صرف دو ممتاز ہوئے۔ ایک مولانا حالی کا مفلر ایک سید وقار عظیم کا مفلر اور اب مجھے یاد آرہا ہے کہ ایک زمانے میں عسکری صاحب نے مولانا حالی کے مفلر پر بہت لے دے کی تھی۔ انہوں نے حالی کے گلے کا مفلر حالی کی تنقید میں بھی دریافت کر لیا تھا۔ عسکری صاحب مولانا حالی کے مفلر پر طنز کرتے ہوئے کنکھیوں

سے وقار صاحب کو بھی دیکھتے جاتے تھے مگر وقار صاحب ان دنوں بھی اسی طرح مسکراتے دیکھے گئے۔

ویسے مظفر کے سوا بھی وقار صاحب اور مولانا حالی میں بہت سی مشترک باتیں ہیں بلکہ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ مولانا حالی آدھے پیدا ہوئے تھے۔ وقار صاحب کی پیدائش کے ساتھ وہ پورے ہوئے۔ بات یہ ہے کہ ادبی تنقید محض شاعری کی تنقید سے تو عبارت نہیں ہے۔ تنقید کی جو روایت فکشن کا احاطہ نہیں کرتی وہ ادھوری روایت ہے۔ مولانا حالی کی بنائی ہوئی تنقید کی روایت ادھوری تھی۔ جب وقار صاحب نے فکشن پر تنقید کا آغاز کیا تب یہ پوری تنقیدی روایت بنی۔ سو مولانا حالی کی طرح سید وقار عظیم بھی ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک ایسے موڑ پر کھڑے ہیں کہ کوئی آتا جاتا ان سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔ ان کی تنقیدی تحریروں کے بارے میں مختلف رائیں ہو سکتی ہیں۔ وہ مولانا حالی کی تنقیدی تحریروں کے بارے میں بھی ہیں مگر تاریخ کے جس نکڑ پر وہ کھڑے ہیں وہاں سے کون انہیں ہٹائے گا اور کیسے ہٹائے گا۔

خیر یہ تو ان کے ادبی مقام کو سمجھنے سمجھانے کا معاملہ ہے۔ اس وقت تو مجھے وہ آدمی کی حیثیت سے یاد آ رہے ہیں۔ کیا میٹھے آدمی تھے۔ نقاد اور اتنا میٹھا۔ تنقید بھی میٹھی ہی لکھی ہے۔ جس کے بارے میں لکھا وہ خوش ہوا۔ جس کی تحریر کو سراہنے میں تامل ہوا، بے مزا اسے بھی نہیں ہونے دیا۔

مجلسی آدمی تھے مگر کیسی ہی مجلس ہو رکھ رکھاؤ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ وقتاً فوقتاً خود مجلسیں آراستہ کرتے تھے۔ آج سے چند برس ادھر کی بات ہے کہ احباب کو دعوت دی کہ اتوار کی اتوار غریب خانے پر تشریف لائیے مگر شرط یہ ہے کہ کچھ ساتھ لے

کرآئیے۔ احباب نے پوچھا کیا لائیں۔ کہا کہ اپنی پسند کے اشعار لے کر آئیے۔ تو یہ محفل اتوار اس رنگ سے سجی کہ کوئی ایک قدیم استاد موضوع ٹھہرتا اور محفل کے سب رکن اس کے یہاں سے اپنا انتخاب کر کے لاتے اور محفل میں پیش کرتے۔

یہ صحبت چند ماہ خوب گرم رہی مگر سب احباب، وقار صاحب کی طرح وضعدار تو نہیں تھے۔ احباب کی دنیوی مصروفیات بڑھتی چلی گئیں اور شرکت، یاروں کی گنڈے دار ہوتی چلی گئی آخر کو اس محفل کا بستر لپٹ گیا۔

ایک زمانے بعد وقار صاحب نے پھر یاروں کو اکٹھا کرنے کی صورت نکالی اور ایک نئی طرح کی محفل آراستہ کی۔ اب سے چند برس پہلے کی بات ہے کہ ان کے چھوٹے بھائی سید اقبال عظیم مشرقی پاکستان سے آئے ان کی بینائی جاتی رہی تھی۔ بڑے بھائی نے سوچا کہ احباب کو گھر پہ اکٹھا کر کے شعر و شاعری کی محفل گرم کرو۔ یوں بھائی کا بھی دل بہلے گا اور ایک انجمن کی بھی صورت نکل آئے گی۔

وقار صاحب نے شعر و شاعری کی محفل کو چاندنی مشاعرہ بنا دیا۔ صورت اس محفل کی یہ ٹھہری کہ ہر چاند کی چودہ کو پہلے دسترخوان بچھتا، پھر شاعر اور شعر کے رسیا بالائی منزل پر پہنچتے، جہاں کھلی چھت پر چاندنی بچھی ہوتی۔ نہ شمع نہ بجلی کا قمقمہ۔ چودھویں کے چاند کی کیا کم روشنی تھی بس اسی میں مشاعرہ شروع ہو جاتا اور رات بھیگنے کے ساتھ ساتھ گرم ہوتا چلا جاتا۔

یہ مشاعرہ بھی چار دن کی چاندنی بن کر رہ گیا۔ سید اقبال عظیم کراچی چلے گئے اور محفل درہم برہم ہو گئی۔ اب وقار صاحب بھی تو بہت مصروف آدمی ہو گئے تھے۔ ایک تو کمیٹیاں ہی پیچھا نہیں چھوڑتی تھیں۔ جب پوچھو کمیٹی کی میٹنگ میں گئے ہوئے ہیں

یا جانے کو تیار کھڑے ہیں۔ بس یہ سمجھو کہ اس جانِ ناتواں کا رواں رواں کمیٹیوں میں بندھا ہوا تھا۔

لکھنے کی مصروفیت بھی بہت بڑھ گئی تھی مگر اب تو وہ شاعری پر بہت لکھتے تھے۔ بس یہ جانو کہ کتابوں پہ کتابیں لکھی جا رہی ہیں مگر اردو ادب کی تاریخ میں وہ اصلاً فکشن کے نقاد ہیں اور اگرچہ 36ء سے آج تک بہت وقت گزر چکا ہے مگر آج بھی وہ اردو میں فکشن کے اکلوتے نقاد ہیں۔

* * *

سید وقار عظیم شعبۂ اُردو الہ آباد یونیورسٹی کے نامور طلباء میں سے ایک تھے۔ شعبۂ اُردو اس ہونہار سپوت، اس افسانے کے افسانہ خواں اور داستان کی داستاں سنانے والے کی یاد ہمیشہ تازہ رکھے گا اور کوشش کرے گا کہ خدمتِ ادب کا جو رستہ مرحوم نے دکھایا ہے اس پر گامزن رہے۔''

پروفیسر ڈاکٹر گیان چند

* * *

CS CamScanner

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

شجرِ سایہ دار

محمد طفیل

یہ ذکر 1950ء کا ہوگا۔ میں نے اخبار میں پڑھا کہ سید وقار عظیم نے ''ماہِ نو'' کی ادارت چھوڑ دی ہے اور ان کا تقرر پنجاب یونیورسٹی میں ہو گیا ہے۔ اُس وقت تک میں سید صاحب سے ملا نہ تھا۔ مگر مجھے اس خبر سے خوشی ہوئی تھی۔

پھر ملنے کی آرزو نے زور پکڑا۔ میں نے اِدھر اُدھر سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ پروفیسر حمید احمد خان کے ہاں ٹھہرے ہیں۔ چنانچہ اُدھر جا نکلا۔

گھنٹی بجائی۔ نوکر نے پوچھا: ''کس سے ملنا ہے؟''

میں نے بتایا: ''سید وقار عظیم سے۔''

نوکر ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلا گیا۔ سید صاحب تشریف لائے۔ میں اُن کے خد و خال کا ذکر نہ کروں گا۔ کیوں کہ وہ اپنی صورت سے زیادہ خوبصورت انسان تھے۔ اُنہوں نے پہلی ہی ملاقات میں مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ میں محسوس کرنے لگا کہ یہ شخص تو میرا اپنا تھا مگر مجھ سے دُور تھا۔

وہ لوگ جو ان سے دُور تھے۔ وہ ان کی عزت، اُن کے ادبی کارناموں کی وجہ سے کرتے تھے۔ جو ان کے نزدیک تھے وہ اُن کے ادبی کارناموں کے علاوہ ذاتی حیثیت میں بھی ان کی تعظیم کرتے تھے۔ وہ ایسے محسن تھے کہ سب کے محسن تھے۔

معلوم ہوا کہ سید صاحب کے بچپن کے مشاغل میں، اناؤ سے امیر الدولہ لائبریری (لکھنؤ) میں ہر ہفتہ جانا، وہاں سے انگریزی کتابوں کا لانا، پھر انہیں حرف بہ حرف پڑھنا، اُن کے نوٹس لینا یا پھر انگریزی فلمیں دیکھنا تھا۔ فلم بینی میں ان کے ہمراہ علی عباس حسینی ہوتے تھے۔ یہ دونوں اتنی باقاعدگی سے فلمیں دیکھتے تھے کہ رمضان شریف کا بھی ان پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ روزہ اپنی جگہ، فلم اپنی جگہ!

یہ جس سکول میں پڑھتے تھے۔ اُس کے ہیڈ ماسٹر تھے سرہو نرائن تیواری، وہ پریم چند کے عزیز تھے۔ وہ کلاس میں پریم چند کا ذکر کیا کرتے تھے۔ ذکر سے شوق اُبھرا۔ اُنہوں نے پریم چند کو پڑھا۔ پھر سید صاحب نے پریم چند کی تقلید میں چند افسانے بھی لکھے۔ ادب بچپن ہی میں گھٹی میں پڑ گیا۔

وقار صاحب نشانہ بازی میں بھی ماہر تھے۔ گھر میں چھوٹے پیسے کو زمین پر رکھ کر یا سامنے دیوار میں اٹکا کر چھرے والی بندوق سے ایسی نشانہ بازی کرتے کہ نشانہ چوکتا نہ تھا۔ نشانہ نہ تو بچپن میں خطا ہوا اور نہ زندگی کی دُھوپ میں، ہر مشکل کو آسان بنانا ان کا خاصا رہا۔

یہ شہسواری میں بھی ماہر تھے۔ گھر میں ایک عربی نسل کا گھوڑا تھا۔ اس پر سوار ہو کر میلوں میل نکل جاتے تھے اور بے تکان گھومتے رہتے تھے۔ سید اقبال عظیم نے بتایا کہ مجھے یاد ہے کہ اُناؤ سے سولہ سترہ میل کے فاصلے پر ایک مٹھائی والا تھا۔ اس کی مٹھائی مشہور تھی۔ ہم بھائی صاحب سے کہتے: ''آج مٹھائی کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔'' وہ کہتے ابھی لایا۔ گھوڑے پر سوار ہوتے۔ تھوڑی دیر کے بعد مٹھائی موجود ہوتی۔ چینی کی مٹھائی بہن بھائیوں نے کھائی، ادب کی مٹھائی ہم سب کے حصہ میں آئی۔

سید صاحب دیکھنے میں تو دھان پان تھے، مگر مضبوط تھے۔ اُنہیں غصہ آتا نہ تھا۔ مگر ایک بار غصہ آیا۔ ان کے ہاں ایک نوکر تھا، اچھا خاصا لحیم شحیم، وہ ان کے ہاں سے نوکری چھوڑ کر چلا گیا اور اس نے ان کے گھر کے آس پاس ہی دوسری جگہ نوکری کر لی۔ اُس نے ان کے والد کی شان میں گستاخی کی۔ یہ وہاں پہنچے، اُسے بلایا۔ جب وہ باہر آیا تو اُنہوں نے اُسے گھونسوں اور لاتوں سے خوب پیٹا۔ جن راہگیروں نے وہ تماشا دیکھا، وہ حیران کہ مقابلہ سیر اور چھٹانک میں تھا۔

ان کے والد پولیس میں تھے، اچھے خاصے بڑے عہدے پر۔ ان کے لیے پولیس کی نوکری ایک معمولی بات تھی۔ مگر نہ یہ اس کے لیے راضی ہوئے اور نہ ان کے والد، یہ سول سروس کے امتحان میں بھی بیٹھے مگر اس میں کامیاب نہ ہوئے۔ اگر ایک اور آسامی پُر کر دی جاتی تو یہ بھی منتخب ہو جاتے مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اُنہیں اس کرسی سے بھی اُونچی کرسی پر بٹھانا مقصود تھا۔

وقار صاحب کی شادی علی گڑھ میں ہوئی۔ تعلقات غلام السیدین سے بڑھے۔ ان کے اصرار پر بی۔ ٹی کا امتحان پاس کیا۔ وہی اُنہیں جامعہ ملیہ لے گئے۔

ان کی زندگی میں جو اہم موڑ آیا۔ وہ جامعہ ملیہ کی ملازمت کا تھا۔ جامعہ نے ان کے کردار کی تشکیل میں بڑا نمایاں رول ادا کیا۔ وہاں کا ماحول ایثار وقربانی کا ماحول تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب معمولی معمولی تنخواہوں پر کام کرتے تھے۔ حالانکہ جامعہ سے باہر ان کے لیے بڑی بڑی نوکریاں دامن پھیلائے ہوئے تھیں۔ جب سید صاحب بھی اسی رنگ میں رنگے گئے تو کندن بن گئے۔ دنیا کی بڑائیاں جھولی میں پڑ گئیں۔

پروفیسر اقبال عظیم، سیّد وقار عظیم کے چھوٹے بھائی ہیں۔ شکل وصورت میں مشابہت ہے۔ کبھی کبھی کے دیکھنے والوں کو مغالطہ بھی ہو سکتا ہے۔ اُنہوں نے معلّمی کا پیشہ اختیار کیا۔ انہوں نے بھی۔ شعر و بھی کہتے تھے، شعر یہ بھی کہتے تھے۔ ترنم بھی دونوں کا خوب تھا۔ لوگ جھوم جھوم اُٹھتے تھے۔ البتہ وقار صاحب نے ابتدا میں تو شعر و شاعری کی۔ بعد میں ترک کر دی۔ لہٰذا ترنم بھی رخصت!

کچھ عرصے سے پروفیسر اقبال عظیم صاحب کی بینائی جاتی رہی ہے۔ اب وہ بغیر سہارے اور رہنما کے گھوم پھر نہیں سکتے۔ ایک دن اقبال عظیم صاحب اپنے ایک دوست کے ہمراہ انارکلی سے گزر رہے تھے کہ کسی نے اقبال عظیم کو دُور سے سلام کیا۔

ساتھی نے کہا: ''ایک صاحب نے آپ کو سلام کیا ہے۔''

اقبال عظیم صاحب کا جواب یہ تھا: ''اُنہوں نے مجھے بھائی صاحب کے مغالطے میں سلام کیا ہے۔ اگر وہ اقبال عظیم کو سلام کرتے تو اُنہیں یہ بھی معلوم ہوتا کہ مجھے تو دکھائی نہیں دیتا۔''

ہاں تو میں نے عرض کیا کہ دونوں بھائیوں میں بڑی مشابہتیں ہیں۔ جسم بھی ویسا چھریرا، قد بوت بھی اتنا، رنگت بھی وہی گیہواں، یہی وجہ ہے کہ اب کے جو میں اقبال عظیم کو وقار صاحب کے گھر ملا تو اقبال عظیم نے کہا: ''یہاں آتا ہوں تو یادیں گھیراؤ کرتی ہیں۔ بھائی صاحب کی ایک ایک بات یاد آتی ہے۔ تڑپاتی ہے۔ اب دیکھو نا، یہ جو میں نے شیروانی پہن رکھی ہے، بھائی صاحب کی ہے۔''

وقار صاحب بڑے حوصلے والے انسان تھے۔ والد صاحب کا انتقال ہوا، والدہ کا انتقال ہوا، تین بہنوں کا انتقال ہوا، دو بھائیوں کا انتقال ہوا، مگر یہ روئے نہیں سب کی ڈھارس بندھاتے رہے۔

یہ زندگی میں کبھی بھی نروس نہیں ہوئے۔ بڑے سے بڑے پہاڑ کو بھی اُنہوں نے سر پہ ایسے رکھ لیا، جیسے وہ پہاڑ نہ ہو بلکہ ایک چھوٹا سا پتھر ہو۔

البتہ اُنہیں دو مواقع پر افسردہ دیکھا گیا۔ ایک موقع وہ تھا کہ جب اُنہیں 1934ء میں بطور لیکچرار منتخب نہ کیا گیا۔ اس کمیٹی کے صدر مسعود حسن رضوی تھے۔ اُنہوں نے یقین دلا رکھا تھا کہ آپ کا حق ہے اس لیے آپ ضرور منتخب ہوں گے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مخالفت صرف مسعود حسن رضوی نے کی تھی۔ سیّد صاحب کہا کرتے تھے کہ میرا منتخب نہ ہونا اتنا بڑا دھچکا نہ تھا، جتنا یہ کہ انسانیت پر سے اعتماد اُٹھ گیا۔

دوسری مرتبہ افسردہ اُنہیں اس وقت دیکھا گیا کہ جب اورینٹل کالج لاہور میں ریڈر کی آسامی خالی تھی۔ اس کے امیدوار دو تھے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی اور سیّد وقار عظیم۔

جب پہلے پہل وقار صاحب نے لیکچررشپ کے لیے کوشش کی تھی تو اس وقت وقار صاحب کی بجائے سیّد احتشام حسین منتخب ہو گئے تھے۔ اس بار احتشام صاحب منتخب کرنے والی کمیٹی کے رکن تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس دفعہ بھی وقار صاحب منتخب نہ ہو سکے۔

بہر حال اُنہوں نے اس دھچکے کو بھی برداشت کیا۔ اس کے بعد بہت تیزی سے ادبی کاموں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اپنے آپ کو خوب مصروف رکھا۔ جیسے کسی نے نئے سرے سے عزائم کو مہمیز لگا دی ہو۔

وقار صاحب کے والد بھی شعر کہتے تھے۔ عرش تخلص کرتے تھے۔ پورا نام سید مقبول عظیم عرش! وہ صرف نعت کہتے تھے۔ اُن کا اُٹھنا بیٹھنا عبدالباری آسی،

CS CamScanner

قدیرلکھنوی وغیرہ کے ساتھ تھا۔

اقبال عظیم کہتے ہیں کہ بھائی صاحب کو میری غزلیہ شاعری سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ کہا کرتے تھے: ''عشق و عاشقی کی شاعری چھوڑو، اسمٰعیل میرٹھی کی طرح بچوں کے لیے نظمیں لکھو۔ یہ کیا تم بے مقصد شاعری کرتے ہو۔ ہجر و وصال کے افسانے تراشتے ہو۔''

ایک واقعہ یہ بھی سنایا کہ جن دنوں ''آج کل'' کے مدیر آغا دواشی تھے۔ میں نے اُن دنوں ایک غزل ''آج کل'' کے لیے بھیجی۔ وہ چھپ گئی۔ کچھ لوگوں کو غزل پسند آ گئی۔ بعد میں جب بھائی صاحب ''آج کل'' کے مدیر ہوئے۔ اُن دنوں انہیں ایک خط ملا: ''اقبال عظیم کی بھی غزلیں چھاپیں۔''

اُدھر بھائی صاحب مجھے نصیحتیں کیا کرتے تھے کہ غزلیں وزلیں نہ کہا کرو۔ اِدھر بھائی صاحب بحیثیت مدیر اپنے اوپر کچھ ذمہ داریاں محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ اس فرمائش والے خط کے ساتھ، مجھے ایک خط لکھا: ''محترم! تسلیم! منسلکہ خط ارسال ہے۔ چند غزلیں عنایت فرمائیں۔''

یہاں جو بات عرض کرنے والی ہے وہ یہ کہ اپنی ایک رائے کے باوجود اپنے فرائض سے کوتاہی نہ کی۔ پھر بھائی پندار کو بیچ میں نہ لائے۔ بس ایک رکھ رکھاؤ کے ساتھ خط لکھ دیا۔

اقبال عظیم کہتے ہیں کہ ایک طرف تو اُن کی، میری شاعری پر جو رائے تھی، آپ نے سُن لی۔ دوسری طرف وہ میرے اچھے اشعار کو ذہن میں محفوظ بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ جب میرا مجموعہ کلام چھپنے لگا تو میں نے اُن سے فرمائش کی کہ دیباچہ لکھ دیجیے۔ ابھی میں اُن کی طرف سے جواب کا منتظر ہی تھا کہ دیباچہ لکھا ہوا پہنچ گیا۔

اس دیباچہ میں میرے متعدد اشعار نوٹ کیے ہوئے تھے۔ جب کہ اُن کے پاس میرا مسودہ نہ تھا۔

سیّد وقار عظیم نے زیادہ تر کام، اُردو افسانہ پر کیا۔ داستانوں پر کیا۔ موضوع اپنے لیے مختص کرلیا۔ ہر چند کہ انہوں نے دیگر موضوعات پر بھی کتابیں لکھیں۔ حق بھی ادا کیا مگر داستانوں اور اُردو افسانہ پر تو ان کی تحریریں اتھارٹی کی حیثیت رکھتی ہیں۔

نثر نویسی میں یہ بڑا ٹیڑھا کام تھا۔ آج زیادہ تر نقاد شاعری کے ملتے ہیں۔ ہر کسی کے لیے شاعری کا پڑھنا، اس سے حظ اُٹھانا، روزمرہ کا شغل ٹھہرا۔ مگر داستانوں کا پڑھنا، فنی اور تنقیدی نظر سے پڑھنا، شغل نہیں جان جوکھوں کا کام ہے۔ اُنہوں نے اپنی قلمی ریاضت کے سلسلے میں آسان راہ کی طرف دھیان نہ دیا، مشکل راہ اختیار کی۔ اگر ناقدین میں مولانا صلاح الدین احمد اور سیّد وقار عظیم اُردو افسانہ کو نہ ملتے تو آج اُردو افسانہ اتنا ترقی یافتہ بھی نہ ہوتا۔

اختصاص کی وجہ شاید یہ ہو کہ بچپن میں اُن کے جو اُستاد تھے وہ پریم چند کے رشتہ دار تھے اور پریم چند اُس زمانے میں اُردو افسانے کا خدا تھا۔ یہ رشتہ استوار ہوتے ہوتے زندگی کا مسلک بن گیا۔

میرا یہ مضمون خاکہ نگاری کی روش سے زیادہ سوانح نگاری کی طرف جُھک رہا ہے۔ میں اسے اس مخمصے سے نکالتا ہوں۔ آدمی یا تو سراسر کافر ہو یا سراسر مسلمان!

وقار صاحب کی زندگی ایک مقررہ ڈھرے پہ چلتی رہی۔ اس میں کوئی اُتار چڑھاؤ نہ تھا۔ کوئی مدّ و جزر نہ تھا۔ ایک پُرسکون زندگی، ایک بااصول زندگی، وہ ہنگاموں سے دُور بھاگتے تھے۔ اگر کسی ہنگامے نے ان کی دہلیز پہ دستک دے ہی

ڈالی تو اُنہوں نے اس ہنگامے کو اپنے تدبر سے فرو کرلیا یا صبر کرلیا، مقابلے میں نہ اُترے۔

غرض وقار صاحب کا زندگی گزارنے کا ایک ضابطہ تھا۔ پروگرام پہلے سے بن جاتا تھا کہ فلاں وقت سے فلاں وقت تک یہ کام کرنا ہے اور فلاں وقت سے فلاں وقت تک یہ کام، یوں ہفتوں اور مہینوں کے پروگرام بن جایا کرتے تھے۔ پھر اُن پہ عمل ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے اپنی سلیقہ مندی سے بہت سارے بلکہ سارے کے سارے کام کیے۔

یہی وجہ ہے کہ قلم کی روزی سے اُنہوں نے اپنا ایک اچھا سا گھر بنایا۔ جُملہ آسائشوں والا گھر، ایک اچھی سی موٹر خریدی، پھر پورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ بلکہ شان کے ساتھ زندگی گزاری۔

میں نے اُن میں ایک خاص بات دیکھی۔ وہ یہ کہ اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے تھے۔ اُنہوں نے کبھی کسی دوست سے اُدھار نہ مانگا۔ آج تو ماشاءاللہ ان کے بچے جوان ہیں، اچھی نوکریوں پہ ہیں۔ مگر میں اُن دنوں کی بات کر رہا ہوں کہ جب بچے چھوٹے تھے۔

ان کی طبیعت کا ایک خاصہ یہ بھی تھا کہ وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتے تھے۔ وہ اپنے تالیف و ترجمہ کے دفتر میں گئے۔ سٹاف کو بلا کر کہا: ''یوں سمجھیں کہ ہم سب ایک خاندان کے لوگ ہیں۔ ہمیں اکٹھا رہنا ہے اور اس خاندان کو باوقار مقام تک پہنچانا ہے۔ لہٰذا میں بھی محنت کروں گا، آپ بھی محنت کریں۔''

اگر سٹاف کا کوئی آدمی بیمار ہوگیا تو اس کی عیادت کے لیے اس کے گھر پہنچے۔ اگر سٹاف کے کسی رُکن کا انتقال ہوگیا تو تعزیت کے لیے پہنچے۔ غرض اُن کا اپنے سٹاف کے ساتھ وہی برتاؤ تھا جو گھر کے ایک بزرگ کا اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے۔

وقار صاحب کے بارے میں کیا کہا جائے اور کیا نہ کہا جائے؟ وہ بہت صلح جُو شخصیت کے مالک تھے۔ دوستوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا اُن کا مشن تھا۔ میں نے اُن کی زبان سے کم کسی کی بُرائی سُنی ہوگی۔ وہ کہا کرتے تھے۔ کیوں دوسروں کی بُرائیاں کریں۔ کیوں اپنا خون کھولائیں؟

میں لقمہ دیتا: ''زندگی کو اتنا زیادہ بے رونق بھی تو نہیں بنانا چاہیے۔''

وہ مجھے سمجھاتے: ''دوسروں کے منہ لگنے سے بہتر ہے کہ وقت کو اپنی زندگی سنوارنے میں صرف کیا جائے۔ بیوی بچوں کے معاملات میں دلچسپی لی جائے اور لکھنے پڑھنے میں جملہ راحتوں کو ڈھونڈا جائے۔''

میں عمر میں اُن سے چھوٹا تھا۔ اس لیے کئی معاملات میں تندی و تیزی کا مظاہرہ بھی کر دیا کرتا تھا۔ وہ مجھ سے کہتے: ''نہ نہ ایسا نہ کرو۔ جذبات سے نہ کھیلو۔ بلکہ اس محاورے پر عمل کرو۔ ایک چپ سو سُکھ!''

میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ اب جا کر جو مجھ میں تھوڑی سی نرمی آئی ہے وہ صرف سیّد وقار عظیم کی نیازمندی کی وجہ سے ہے۔

وقار صاحب نے ایک خاص طرز کا لباس پہنا، پھر زندگی بھر وہی لباس پہنا، پاجامہ کُرتا اور شیروانی، یہ اُن کے تن کا لباس تھا۔ ہاں مولانا حالی کی طرح، ان کے کندھوں پہ مظلر بھی ہوتا تھا۔ وہ بھی ان کے لباس کا ضروری حصہ تھا۔

تن کے لباس کا ذکر آپ نے سُن لیا۔ من کے لباس کا ذکر بھی آپ کے سامنے مختلف حوالوں سے آیا۔ اُنہوں نے ہمیشہ صاف ستھرے کپڑے پہنے، مگر اُن کا من، اُن کے تن کے کپڑوں سے زیادہ اُجلا تھا۔

جن لوگوں کو سوسائٹی میں عروج حاصل ہوتا ہے یا جن کی شہرت کو پر لگ جاتے ہیں۔ وہ خوانخواہ باور کراتے ہیں کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں۔ اُن میں اس قسم کی تفاخرانہ بات کوئی نہ تھی۔ بلکہ جوں جوں انہیں دوستوں کی محبت حاصل ہوتی گئی یا دُنیوی اعتبار سے اہمیت بڑھتی گئی۔ اُن میں عاجزی آتی چلی گئی۔ پھل دار درخت ہمیشہ جُھکا ہوا ہوتا ہے۔

میں نے اُن سے اس فقرے پر کہ پھل دار درخت ہمیشہ جُھکا ہوا ہوتا ہے، عرض کیا تھا: ''پھل دار درخت بے شک جھکا ہوا ہوتا ہے۔ مگر سارے پھل میٹھے تو نہیں ہوتے۔''

اس پر اُنہوں نے کہا تھا: '' نظامِ قدرت کے اصول تو اٹل ہیں۔ ساری گڑ بڑ پرداخت کی ہے۔ یہی حال انسان کے بننے اور بگڑنے کا ہے۔''

ہاں تو میں بات کر رہا تھا۔ اُن کی نرم روئی اور عاجزانہ روش کی۔ دوستوں کے دلوں میں گھر کرنے کا، اُن کا ایک رویّہ یہ بھی تھا کہ بہانے بہانے سے دوستوں کی دعوتیں کیا کرتے تھے۔ پھر بڑی بڑی دعوتیں، ورنہ جو لوگ ذرا اُوپر اُٹھ جاتے ہیں وہ دوسروں کے ہاں دعوتوں میں حاضر ہونے کو ہی، میزبان پر احسان دھرنے کے مترادف سمجھتے ہیں۔ یعنی آج بڑے آدمی کی پہچان یہ ہے کہ وہ دعوتیں کھاتا ہو۔ کھلاتا نہ ہو۔

آج کل دوستیاں جیتے جی کی ہیں۔ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ لوگ جو زندگی میں بہت ہی قریب ہوتے ہیں وہ دوست کے جنازے تک میں شریک نہیں ہوتے۔ سوچتے ہیں، جس سے میل جول تھا۔ جب وہ چل دیا۔ پھر وقت کیوں ضائع کیا جائے۔

مگر وقار صاحب کی ادائیں اوروں سے مختلف تھیں۔ ہمارے ایک

CS CamScanner

مشترکہ دوست کا انتقال ہو گیا۔ کبھی اُس دوست کے اچھے دن تھے۔ اس کے دسترخوان پر متعدد لوگ سیر ہو کر اُٹھتے تھے مگر گردشِ زمانہ کا کیا علاج!

ہم سب اپنے دوست کے انتقال پر بے حد رنجیدہ تھے مگر عملاً کچھ نہیں کر رہے تھے۔ اس دوران عید آ گئی۔ وقار صاحب کا ٹیلی فون آیا: ''بھئی عید آ رہی ہے۔ اپنے دوست کے بچوں کا بھی کچھ خیال ہے؟''

میں نے کھسیانا ہو کر کہا: ''جی ہاں، جی ہاں!''

کہنے لگے: ''میں نے قریبی دوستوں سے، مرحوم کے بچوں کے لیے کچھ رقم اکٹھی کی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو آپ بھی اپنا حصہ ڈال دیں۔''

چنانچہ وقار صاحب جب تک زندہ رہے وہ ہر عید پر، کوئی ہفتہ بھر پہلے، مرحوم دوست کے گھر پہنچا کرتے تھے اور مرحوم کے بچوں کو کچھ نہ کچھ دے آتے تھے۔

آج وقار صاحب کے انتقال کو دو برس ہو گئے ہیں۔ دو برس میں میرے پاس کوئی بھی نہیں آیا جس نے کہا ہو کہ عید آ رہی ہے۔

جی ہاں! سیّد صاحب دوستوں کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ یہ رویہ ان کا اپنے سے چھوٹوں سے ہوتا۔ وہ دوستوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ یہ رویہ ان کا بڑوں سے ہوتا۔ حفظِ مراتب کے جتنے وہ دلدادہ تھے، کم کوئی ہو گا۔ غرض وہ چھوٹوں کے خیر خواہ اور بڑوں کے نیازمند تھے۔

میں نے ہمیشہ اُن کی زبان سے جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان، پروفیسر حمید احمد خان، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے لیے تحسین کے کلمات ہی سُنے۔ حالانکہ وہ ان کے سامنے نہ ہوتے مگر ان کی صفات ان کے ہر دم سامنے رہتی تھیں۔

بدقسمتی سے پنجاب یونیورسٹی میں، ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے دوستوں اور پنجابیوں کے درمیان ایک دُوری دُوری کی سی فضا قائم ہے۔ مگر سیّد صاحب ایک ایسی متوازن شخصیت کے مالک تھے کہ ان جھمیلوں میں کم ہی اُلجھتے تھے۔ اُنہوں نے انسانیت جہاں دیکھی، اُسے سینے سے لگا لیا۔

تالیف وترجمہ کے دفتر میں ٹیلی فون نہ تھا۔ اُنہوں نے ٹیلی فون کے لیے درخواست دی۔ فنانس کمیٹی نے درخواست نامنظور کر دی۔ کمیٹی کے ریمارکس یہ تھے۔ ٹیلی فون بیجا فضول خرچی کی مد میں آتا ہے۔ پھر اسی مسئلے پر غور کے لیے ایک میٹنگ ہوئی۔

اس میٹنگ میں آداب میزبانی کے طور پر فنانس کمیٹی نے چائے اور بسکٹ کا انتظام کیا۔ وقار صاحب نے کہا: ''اگر ٹیلی فون فضول خرچی کی مد میں آتا ہے تو یہ چائے اور بسکٹ بھی فضول خرچی کی مد میں آتے ہیں۔ لہٰذا میں اس میٹنگ میں نہ بیٹھوں گا کہ جو خود اپنے فیصلوں پر عمل نہیں کرتی۔''

اس کے بعد اُنہوں نے فنانس کمیٹی سے، ٹیلی فون کے سلسلے میں قطعاً کوئی رابطہ نہ رکھا۔ مگر سنڈیکیٹ کو درخواست دے کر ٹیلی فون لگوا لیا۔

حمید احمد خان سے وقار صاحب کا بڑا یارانہ تھا مگر حمید احمد خان بھی اصول کے آدمی تھے۔ اس معاملے میں دوست دشمن سب برابر تھے۔

ایک موقع ایسا آیا کہ حمید احمد خان، وقار صاحب کو فائدہ پہنچا سکتے تھے۔ چونکہ معاملہ اُصول کا تھا۔ اس لیے حمید احمد خان نے فیصلہ وقار صاحب کے مدِمقابل کے حق میں کر دیا۔

وقار صاحب کو اس کا رنج بھی ہوا ہوگا۔ مگر معاملہ اصول کا تھا۔ اس لیے شکوہ بھی

CS CamScanner

نہیں کر سکتے تھے۔ اُدھر حمید احمد خان کو یہ خیال تھا کہ دوستی میں رخنہ نہ پڑے۔ اُنہوں نے اپنی وائس چانسلری کے زمانہ میں غالب چیئر کی ایک نئی جگہ نکالی اور وہاں وقار صاحب کا تقرر کر دیا۔ یوں وقار میں بھی اضافہ ہوا۔ دوست بھی خوش ہو گیا۔ اصول بھی نہ ٹوٹا۔

انہی دنوں کئی لوگوں نے وقار صاحب کو چھیڑا: ''حمید احمد خان نے آپ کا مطلق خیال نہیں رکھا۔'' وقار صاحب کا جواب یہ تھا: ''میرا ہی حق نہ ہوگا۔''

یہ وقار صاحب کی شفقت تھی کہ وہ میری باتوں کو غور سے سُنتے تھے۔ مشورے دیتے تھے۔ کبھی میں نے کسی معاملے میں ضد کی تو اس کا بھرم بھی رکھ لیا۔

کچھ ایسے ہی امتحان کا ایک وقت وہ تھا کہ جب میں نے وقار صاحب سے جا کر یہ کہا: ''اس فارم پر دستخط کر دیجیے۔'' وہ فارم رائٹرز گلڈ کے سلسلے میں رضامندی کا تھا کہ الیکشن لڑوں گا۔

فارم کو میرے ہاتھ سے لے لیا۔ کہنے لگے: ''نہ آپ مجھ سے یہ فارم پُر کرائیں اور نہ آپ خود الیکشن لڑیں۔ ہمیں صرف اپنے ادبی کاموں سے دلچسپی رکھنی چاہیے۔''

میں نے ضد کی۔ ''اس ادارے کو مزید سنوارنا چاہیے۔''

وقار صاحب نے پھر سمجھایا: ''طفیل جانے دو، جانے دو!''

میں نے اصرار جاری رکھا: ''نہیں جناب! دستخط کیجیے۔ دستخط کیجیے۔''

چنانچہ اُنہوں نے بادلِ ناخواستہ فارم پر دستخط کر دیے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی مصروفیات کی بنا پر بعض معاملات میں دلچسپی نہیں لینا چاہتے تھے لیکن دوستوں کے اصرار پر، صرف اُن کی خوشی کی خاطر، راضی بھی ہو جایا کرتے تھے۔

وقار صاحب یونیورسٹی سے فارغ ہو کر کبھی کبھی میرے دفتر بھی آن نکلتے

تھے۔ پھر ہم بہت سی باتیں کیا کرتے تھے۔ کچھ ادبی کچھ ذاتی، ان کی فرمائش عموماً یہ ہوتی تھی۔ نوکر کو بھیج کر پان منگوا دیجیے۔ فلاں پھل والے سے پھل منگوا دیجیے۔ اگر میں کبھی ان چیزوں کے پیسے دیتا تو خفا ہوتے، کہتے یہ میری روزانہ کی ضرورتیں ہیں۔ دوست زیر بار کیوں ہوں۔

اگر میں ان سے عرض کرتا: ''چائے پیجیے''۔ تو ان کا جواب یہ ہوتا:

''ابھی گھر جا کے کھانا کھاؤں گا۔ چائے پی لی تو بھوک جاتی رہے گی۔''

ایک دن تشریف لائے تو بیٹھتے ہی کہنے لگے: ''بھئی طفیل چائے منگواؤ۔''

میرے لیے ان کی فرمائش خوشگوار حیرت کی بات تھی۔ جب نوکر چائے لانے کے لیے جا رہا تھا تو اس سے کہا: ''کچھ ساتھ کھانے کے لیے بھی لانا۔ آج میں گھر دیر سے پہنچوں گا۔ کیونکہ ادھر یونیورسٹی میں ایک ضروری میٹنگ ہے۔''

چائے آئی۔ میں نے بنائی۔ ابھی ہم نے دو تین گھونٹ ہی پیئے ہوں گے کہ میں ایکدم بیہوش ہو گیا۔ ہاتھ سے پیالی چھوٹ گئی۔ چائے میز پر تیر گئی اور میں ایک طرف کو لڑھک گیا۔

بعد میں میرے عزیزوں نے بتایا کہ جب آپ گرنے لگے تو وقار صاحب نے آپ کو سہارا دے کر گرنے سے بچایا۔ پھر فوراً اپنے ایک دوست ڈاکٹر کو ٹیلی فون کیا۔ ڈاکٹر کے ہاں پہنچایا۔ یوں اُس ضروری کام کا وقت بھی نکل گیا جس کے لیے وہ رُکنا چاہتے تھے۔ پھر میں جتنے دن ہسپتال رہا۔ وقار صاحب کا اصرار رہا۔ کھانا میرے گھر سے آئے گا۔

رائٹرز گلڈ میں وقار صاحب کی حیثیت، بنیادی قسم کی تھی۔ اُن کے تدبر سے

بڑے بڑے عقدے حل ہو جایا کرتے تھے۔ اوّل تو معاملے کی تہہ تک پہنچ کر، بات ہی اس انداز سے کرتے تھے کہ مخالفین کے لیے کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی اور اگر کوئی دوست خلافِ ضابطہ، محض ضد کی بنا پر اڑتا تھا تو پھر اُن کا ''بزمی نما خلوص'' دیکھنے والا ہوتا تھا۔ ایسے عالم میں پھر کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ خلوص کے پہاڑ سے ٹکر لے۔

یوں تو سید صاحب نے جس ادارے میں بھی کام کیا۔ وہ یقیناً اُن کی روپوشی کی وجہ سے خاصے پریشان ہوں گے مگر وہ جو راہنما اُصول چھوڑ گئے ہیں اُن کی بنیادوں پر مسئلے سلجھتے ہی رہیں گے۔

عرض کر چکا ہوں کہ ایک تو وقار صاحب کا بات کرنے کا انداز ہی اپنے اندر ایک سلیقہ اور ایک کشش رکھتا تھا۔ اس پر اُن کی مفرح ٹائپ گفتگو ہر درجہ لُطف دیتی تھی۔ اُن کے پاس گھنٹوں بیٹھیے اُکتانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

گفتگو میں علمی انداز بھی تھا، مجلسی انداز بھی، اپنے اساتذہ کی بھی باتیں کرتے تھے۔ اپنے پرانے دوستوں کو بھی یاد کرتے تھے۔ یوں وہ حکمت آمیز باتوں سے آپ کو مالا مال کرتے تھے۔ اُن کے پاس خالی دامن جانے والے بھی خالی دامن نہیں لوٹا کرتے تھے۔

ابھی میں نے اُن کی شگفتہ مزاجی کی بات کی ہے۔ ایک چھوٹا سا واقعہ سُن لیجیے۔ کوئی پچیس برس پہلے کی بات ہے کہ وقار صاحب نے ایک موٹر خریدی تھی پھر اُس موٹر کی شہرت یہ سُنی کہ وہ اپنی مرضی سے چلتی تھی اور اکثر نہیں چلتی تھی۔

میں نے پوچھا: ''وقار صاحب، یہ موٹر جس کی اتنی شہرت ہے۔ آپ نے کتنے میں خریدی؟''

کہنے لگے: ''سترہ سو روپے میں۔''

میں نے کہا: '' خوب خریدی۔''

کہنے لگے: '' کالج آنے میں وقت ہوتی تھی۔ اس مجبوری سے خریدی۔ مگر جب سے خریدی ہے کالج میں پہنچنا اور بھی غیر یقینی ہو گیا ہے۔''

ایک دن سُنا کہ وقار صاحب نے موٹر بیچ دی۔ وقار صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا: ''موٹر بیچ دی؟''

کہنے لگے: ''ہاں آٹھ سو روپے منافع میں۔''

میں بہت خوش ہوا۔ پوچھا: '' پچیس سو میں؟''

کہنے لگے: ''اس موٹر کو تو کوئی مفت بھی لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ جو آٹھ سو ملے ہیں میں اُسے منافع سمجھتا ہوں۔''

وہ زندگی کے آخری دنوں تک کام کرتے رہے۔ اُنہوں نے زندگی کا ایک لمحہ تک ضائع نہیں کیا۔ اُنہوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ زندگی کا ہر لمحہ، دوسروں کی امانت ہے۔ وہ جتنے دن بھی ہمارے درمیان رہے امانتیں ہی لوٹاتے رہے۔

اگر اُنہیں ایک سو دو درجے کا بخار ہے اور اُن کی کہیں ضرورت ہے تو اُنہوں نے اپنی علالت کی پروا نہیں کی۔ وہ اس جگہ پہنچے۔ اپنے فرائض ادا کیے۔ جب جملہ مراحل طے پا جاتے تب وہ اپنا ہاتھ بڑھا کر کہتے: ''ذرا ہاتھ لگائیے، مجھے اس وقت 102 درجے کا بخار ہے۔''

وہ ہر وقت کام، ہر وقت کام کے اُصول پر زندگی بھر عمل کرتے رہے۔ گرمیوں کی ایک دوپہر میں میرے پاس تشریف لائے۔ اتنے میں اچانک بجلی

غائب ہوگئی۔ میں نے کہا: ''گرمیوں میں بجلی چلی جائے تو آدمی کسی کام کا نہیں رہتا؟'' فرمانے لگے: ''کیوں کام کا نہیں رہتا؟ میں تو ایسے مواقع پر اپنی قمیص اُتار دیتا ہوں اور کام کرتا رہتا ہوں۔'' ایسی لگن اور اپنے مقاصد سے اتنا خلوص، میں نے کسی اور میں نہیں دیکھا۔

سید وقار عظیم مجھ سے دُور چلے گئے ہیں اور میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگا ہوں۔ وہ دُور ہو کر بھی میرے بہت قریب ہیں۔ کیوں کہ میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ آج میرے مہربان دوستوں میں ایسا کوئی نہیں جس پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کر سکوں۔

جب میں نے سید صاحب کے انتقال کی خبر سُنی تو اُن دنوں میں کراچی میں تھا۔ رائٹرز گلڈ کے ایک جلسے میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ مجھے ایک مرکزی رُکن نے ٹیلی فون کیا اور پوچھا: ''آج کا اخبار پڑھا؟''

میرا جواب یہ تھا کہ ''جب میں لاہور سے باہر نکلتا ہوں تو اخبار نہیں پڑھتا کہ مبادا کوئی نیا صدمہ پہنچے۔''

میرے دوست نے کہا: ''اچھا تو پھر سنو۔ سید وقار عظیم کا انتقال ہوگیا ہے۔''

میں سناٹے میں آگیا۔ اپنے سارے کام چھوڑ کر اُسی دن لاہور کے لیے چل دیا۔ مگر میں پھر وقار صاحب کو نہ دیکھ سکا۔ وہ میرے خیر خواہ تھے۔ وہ میرے بھائی تھے۔ وہ میرے محسن تھے۔ میں کیا کیا کچھ بتاؤں؟

ایسے لوگ جن کے کارنامے موجود اور زندہ ہوں۔ وہ مر نہیں سکتے۔ روپوش ہو سکتے ہیں۔ مرتے وہ لوگ ہیں جو دنیا میں محض اپنے لیے آتے ہیں۔ وہ

CS CamScanner

غائب ہوگئی۔ میں نے کہا: ''گرمیوں میں بجلی چلی جائے تو آدمی کسی کام کا نہیں رہتا؟'' فرمانے لگے: '' کیوں کام کا نہیں رہتا؟ میں تو ایسے مواقع پر اپنی قمیص اُتار دیتا ہوں اور کام کرتا رہتا ہوں۔'' ایسی لگن اور اپنے مقاصد سے اتنا خلوص، میں نے کسی اور میں نہیں دیکھا۔

سیّد وقار عظیم مجھ سے دُور چلے گئے ہیں اور میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگا ہوں۔ وہ دُور ہو کر بھی میرے بہت قریب ہیں۔ کیوں کہ میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ آج میرے مہربان دوستوں میں ایسا کوئی نہیں جس پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کر سکوں۔

جب میں نے سیّد صاحب کے انتقال کی خبر سُنی تو اُن دنوں میں کراچی میں تھا۔ رائٹرز گلڈ کے ایک جلسے میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ مجھے ایک مرکزی رُکن نے ٹیلی فون کیا اور پوچھا: '' آج کا اخبار پڑھا؟''

میرا جواب یہ تھا کہ '' جب میں لاہور سے باہر نکلتا ہوں تو اخبار نہیں پڑھتا کہ مبادا کوئی نیا صدمہ پہنچے۔''

میرے دوست نے کہا: ''اچھا تو پھر سنو۔ سیّد وقار عظیم کا انتقال ہوگیا ہے۔''

میں سنائے میں آ گیا۔ اپنے سارے کام چھوڑ کر اُسی دن لاہور کے لیے چل دیا۔ مگر میں پھر وقار صاحب کو نہ دیکھ سکا۔ وہ میرے خیر خواہ تھے۔ وہ میرے بھائی تھے۔ وہ میرے محسن تھے۔ میں کیا کیا کچھ بتاؤں؟

ایسے لوگ جن کے کارنامے موجود اور زندہ ہوں۔ وہ مر نہیں سکتے۔ روپوش ہو سکتے ہیں۔ مرتے وہ لوگ ہیں جو دنیا میں محض اپنے لیے آتے ہیں۔ وہ

لوگ جو دوسروں کے لیے جیتے ہیں وہ نہیں مرا کرتے!

مجھے اس موقع پر بھگت کبیر کا ایک دوہا یاد آ گیا ہے وہ سُن لیجیے۔

کہت کبیر سُن ری میری لوئی
ہم نے نہیں مرنا روئے نہ کوئی

سیّد وقار عظیم سے پہلے ہماری تمام تر تنقید صرف شاعری سے متعلق ہوتی تھی۔ اردو کے نثری ادب کی تنقید کا خزانہ خالی تھا حالانکہ تاریخ و سیر اور داستانوں اور کہانیوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اردو میں موجود تھا۔ اول تو اردو تنقید ہی ابتدائی مراحل میں تھی اور مغربی تنقید کے اصول اور انداز سے نقادوں کو صرف تعارف ہی حاصل ہوا تھا۔ پھر تذکرہ نگاری کی کچھ ایسی رو چلی ہوئی تھی کہ صرف شعراء اور ان کی شاعری ہی موضوعِ تنقید ٹھہرتے تھے۔ اس عالم میں سیّد وقار عظیم نے اردو افسانوں اور داستانوں کو تنقید کے لئے منتخب کیا اور اس سلسلے میں متخصص کا درجہ حاصل کیا۔ بعد میں دوسرے نقادوں نے بھی اس طرف توجہ کی مگر اولیت کا سہرا بھی وقار عظیم کے سر رہا اور اپنے دور میں قدیم اور معاصر افسانوی ادب پر حرف آخر کا اعزاز بھی انہی کے حصے میں آیا۔

احمد ندیم قاسمی

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

لاہور کا ایک خاموش دانشور

اے حمید

1948ء میں رسالہ ''ادب لطیف'' میں میری پہلی کہانی چھپی تو ایک ادبی محفل میں اُردو کے نامور نقاد وقار عظیم صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنی مخصوص شگفتہ مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا:

''آپ نے بڑی عمدہ کہانی لکھی ہے۔''

میرے لیے یہ بڑی عزت کی بات تھی کہ وقار عظیم ایسا اُردو کہانی کا نقاد میری کہانی کی تعریف کر رہا ہے۔ میں نے وقار صاحب کا شکریہ ادا کیا تو انہوں نے مزید فرمایا: ''نہیں نہیں شکریے کی کیا بات ہے آپ نے عمدہ کہانی لکھی ہے۔''

وقار عظیم صاحب کی شہرت پاکستان کے قیام سے پہلے لاہور پہنچ چکی تھی۔ اُردو افسانے پر ان کی رائے حرف آخر کا درجہ رکھتی تھی۔ پھر وہ لاہور تشریف لے آئے۔ ان سے میری پہلی ملاقات کہاں ہوئی؟ یاد نہیں رہا۔ ماضی کے دھندلکوں میں ایک اچکن پوش دبلی پتلی دلکش شخصیت کو دیکھتا ہوں کہ ایک لمبا مفلر گردن سے ہوتا ہوا سینے پر پڑا ہے۔ تنگ موری کا پاجامہ، سانولے چہرے پر ذہانت کی چمک، بال گہرے سیاہ اور لہریالے، چال میں متانت اور وقار، چہرے پر ایک مسکراہٹ رہتی ہے۔ آواز بھاری مگر لہجہ دھیما اور نرم۔ بات ختم ہونے پر بھی چہرے پر

مسکراہٹ کھلی رہتی ہے۔ حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند مصنفین کی انجمن میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ ہر کوئی انھیں احترام کی نظر سے دیکھتا ہے اور ان کی رائے کو بڑی وقعت دیتا ہے۔ اس اتوار حلقہ ارباب ذوق کے ادبی جلسے کی صدارت کر رہے ہیں تو دوسرے ہفتے انجمن ترقی پسند مصنفین کے ادبی اجلاس میں کرسی صدارت پر تشریف فرما ہیں۔ سبھی اُن کا ادب کرتے ہیں۔ ایک صاحب الرائے نقاد، ایک اُستاد اور ایک خوش اخلاق شریف النفس انسان کی حیثیت سے بھی۔

وقار عظیم صاحب رسالہ ''نقوش'' کے ایڈیٹر ہوئے تو مجھے افسانے کے لیے ضرور کہتے۔ یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی۔ کبھی کبھی ایبک روڈ پر واقع رسالہ ''نقوش'' کے دکان نما دفتر میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہو جاتا۔ ان کے چہرے پر ایسی شگفتگی آ جاتی جو اپنے پیاروں کو دیکھ کر آتی ہے۔ میں خود ان کی دلکش اور سکالرانہ شخصیت سے بڑا متاثر تھا۔ وقار صاحب اورینٹل کالج لاہور میں اُردو پڑھاتے تھے۔ بلکہ اُردو ناول اور کہانی پڑھاتے تھے۔ میں بھی اسی کالج میں پڑھتا تھا۔ اُس زمانے کے پرسکون اورینٹل کالج کی یادیں بڑی حسین اور شگفتہ ہیں۔ اُونچی چھت والے ٹھنڈے ٹھنڈے خاموش برآمدے اور کاریڈور، محدود طلبا اور طالبات۔ علم کی فراوانی، علم حاصل کرنے والوں کی کمیابی، کشادہ خالی خالی کمرے، کہیں فارسی کے اُستاد عبدالشکور احسن صاحب، کہیں ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب لیکچر دے رہے ہیں تو کہیں ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر عبدالصمد صارم اور وقار صاحب نے کلاسیں لے رکھی ہیں۔ وقار عظیم صاحب اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے اور سمٹ کر

کرسی پر بیٹھ جاتے۔ ان کے لیکچر آج بھی یاد آتے ہیں۔ مجھے موسم بہار کا وہ دن نہیں بھولتا۔ وقار عظیم صاحب کلاس روم میں لیکچر دے رہے تھے۔ یہ شروع موسم بہار کا زمانہ تھا۔ درختوں پر نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ کالج کے صحن میں جو برگد کا بہت بڑا درخت تھا اس کی شاخوں پر بھی لال اور نسواری رنگ کے پتے آ رہے تھے۔ کسی کسی ٹہنی پر کوئی زرد، خزاں نصیب پتا ابھی تک اٹکا ہوا تھا۔ ہوا کا جھونکا آتا تو وہ اپنی شاخ سے ٹوٹ کر نیچے گر پڑتا۔ مجھے یاد ہے لیکچر دیتے ہوئے وقار عظیم کی نگاہ کھڑکی میں سے برگد کے درخت پر پڑی۔ ایک زرد پتا ٹہنی سے جدا ہو کر چکراتا ہوا نیچے گرا۔ وقار عظیم صاحب کے چہرے پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ تھی۔ پھر انہوں نے گردن پھیر کر طلبا کی طرف دیکھا اور لیکچر دینے لگے۔

ایک روز کی بات ہے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ سُنہری دھوپ کالج کے چھوٹے سے لان میں پھیلی ہوئی تھی۔ وقار عظیم صاحب مجھے کوئی بات سمجھا رہے تھے کہ انہوں نے نگاہیں اُٹھا کر برگد کے درخت کو دیکھا اور فرمایا:

''ابھی یہ درخت نوعمر ہے ایک دن یہ بہت گنجان درخت بن جائے گا۔''

اورینٹل کالج کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ ہال طلبا اور طالبات سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ طلبا، شور مچا رہے تھے۔ باہر سے کچھ معزز مہمان بھی آئے ہوئے تھے۔ وقار صاحب صدارت کر رہے تھے۔ طلبا، ہر شعر پر منہ نیچے کر کے ہوٹنگ کرتے۔ سٹیج سیکرٹری نے ایک دو بار منع بھی کیا مگر لڑکے باز نہ آئے اس پر وقار عظیم مسکراتے ہوئے طلبا سے مخاطب ہوئے:

''ہوٹنگ ضرور کیجیے مگر اچھے شعر کی داد بھی دیجیے۔ شعر فہمی اورینٹل کالج کی

CS CamScanner

قدیم روایات میں شامل ہے۔''

لڑکے یہ سُن کر چپ ہو گئے اور اچھے شعروں پر داد دینے لگے۔ کالجوں میں سیاست اور پارٹی بازیاں چلا ہی کرتی ہیں مگر وقار عظیم نے کبھی ان سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیا تھا۔

ناصر کاظمی بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل ہوا تو ان دنوں میں ریڈیو پاکستان سٹاف آرٹسٹ یونین کا صدر تھا۔ ہم نے صوبائی حکومت کی توجہ اس عظیم شاعر کی طرف دلانے کے لیے ریڈیو یونین کی طرف سے ایک جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا۔ میں خود وقار عظیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے جلوس میں شرکت کی درخواست کی۔ وقار صاحب علیل تھے۔ انہیں سانس کی تکلیف تھی اور زیادہ پیدل نہیں چل سکتے تھے۔ لیکن وہ ایک پلے کارڈ تھامے دوسرے شاعروں، ادیبوں اور آرٹسٹ کے ساتھ جلوس میں شامل ہوئے اور شملہ پہاڑی سے میو ہسپتال تک پیدل چلے۔ یہ تو ایک نامور شاعر کا معاملہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی جگہ اگر کوئی دوسرا غریب آدمی ہوتا تب بھی وقار صاحب جلوس میں ضرور شامل ہوتے۔ انسانوں سے پیار اُن کے مزاج کا حصہ تھا۔

اُردو مرکز والے ظہیر صاحب سے بھی ان کے بڑے مراسم تھے۔ رسالہ ''سویرا'' کے دفتر جاتے ہوئے جب کبھی وقار صاحب اُردو مرکز کے آفس میں بیٹھے دکھائی دیتے تو میں ان کی خدمت میں سلام کرنے ضرور حاضر ہوتا۔ وہ اپنی روایتی محبت اور شفقت سے ملتے۔

اورینٹل کالج میں وقار صاحب کا کمرہ برآمدے کے شمالی کونے پر

کامن روم کے پہلو میں تھا۔ میز، کرسی، کتابیں، مسکراہٹ اور چائے، یہ اس کمرے کا سامان تھا۔ اس کمرے کی ساری رونق وقار صاحب کے دم قدم سے تھی۔

وہ کمرے میں ہوتے تو کمرہ بھرا بھرا لگتا۔ میں کبھی ان کی کرسی خالی پاتا تو دل گرفتہ سا ہو کر کامن روم میں چلا جاتا۔ جب انہیں اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھتا تو دو منٹ بعد میں بھی ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ مجھے دیکھتے ہی وقار صاحب گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلاتے اور کہتے:

''چائے کا پانی رکھ دیجیے۔''

بجلی کے چولہے پر چائے کا پانی رکھ دیا جاتا۔ وقار صاحب کوئی فائل کھولتے ہوئے میری طرف دیکھ کر مسکراتے اور کہتے:

''ایک منٹ میں یہ کام نمٹا لوں، پھر آپ سے باتیں ہوں گی۔''

وہ کام میں مصروف ہو جاتے اور میں کھلی کھڑکی میں سے باہر برگد کے درخت کو تکنے لگتا۔ میں وقار عظیم صاحب کے سامنے سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ ایک روز میں وقار صاحب کے پاس کالج کے لان میں بیٹھا تھا کہ پروفیسر محی الدین اثر صاحب تشریف لے آئے۔ وہ وقار صاحب سے کسی ادبی موضوع پر باتیں کرنے لگے۔ اثر صاحب نے جیب سے گولڈ فلیک کی ڈبی نکالی تو مجھے بھی سگریٹ دیا۔ میں نے معذرت کر دی۔ وقار عظیم بولے:

''بھئی آپ میرا اتنا خیال نہ کیا کیجیے، سگریٹ لے لیجیے۔''

انہوں نے یہ بھی نہ کہا کہ میں جانتا ہوں آپ سگریٹ پیتے ہیں۔ وقار صاحب کے کمرے میں برقی چولہے پر چائے کا پانی کھولنے لگا تھا۔

وقار صاحب نے بھی کام ختم کر لیا تھا۔ میں نے خود چائے بنا کر انہیں پیش کی تو بڑے خوش ہوئے۔

’’بڑی عمدہ چائے بنائی ہے آپ نے۔‘‘

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ انہیں میری بنائی ہوئی چائے پسند آئی تھی۔ ان ہی دنوں ایک روز نامور افسانہ نگار، نقاد اور مترجم محمد حسن عسکری صاحب سے پاک ٹی ہاؤس میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا:

’’بھئی حمید صاحب! آپ نے اپنے جن افسانوں میں شہر کی گلیوں میں رہنے والے لوگوں کا ذکر کیا ہے وہ ہمیں پسند ہیں۔ آپ ان لوگوں کے بارے میں زیادہ لکھا کریں۔‘‘

مگر مشکل یہ تھی کہ میں عسکری صاحب کی پسند کے افسانے نہیں لکھ سکتا تھا۔ میں اپنی پسند کے افسانے لکھ رہا تھا۔ تیسرے روز کالج میں وقار صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں عسکری صاحب کا ریمارکس سنایا۔ وہ مسکرائے۔ کہنے لگے: ’’ایک طرح سے ان کا مشورہ بھی اپنی جگہ پر درست ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح سے آپ لکھتے ہیں اسی طرح سے آپ کو لکھتے رہنا چاہیے۔‘‘

ان ہی دنوں وقار عظیم صاحب نے کالے رنگ کی ایک پرانی گاڑی خرید لی۔ اب روزانہ ڈرائیور انہیں کار پر لاتا لے جاتا۔ وہ کالج کے گیٹ پر کار سے اترتے۔ ڈرائیور کار ایک طرف پارک کر دیتا۔ ہم بڑے خوش تھے کہ وقار صاحب کو تانگے کے ہچکولوں سے نجات مل گئی۔ شروع شروع میں وقار صاحب بھی بڑے خوش تھے۔ لیکن ان کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ پرانی کار نے انہیں پریشان کرنا شروع

CS CamScanner

کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے کار بیچ ڈالی اور ایک بار پھر تانگے پر کالج آنے لگے۔

میں اورینٹل کالج سے فارغ ہو چکا تھا اور صبح شام پاک ٹی ہاؤس میں دوستوں سے خوش گپیاں ہوتیں۔ میری کہانیوں کے دو مجموعے اور کچھ ناول چھپ چکے تھے۔ کبھی کبھار وقار صاحب بھی ٹی ہاؤس آ جاتے۔ کبھی میں ان سے ملنے اورینٹل کالج چلا جاتا۔ وقار صاحب زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ ضرورت کی بات کرنے کے بعد خاموش ہو جاتے مگر ان کی خاموشی میں بھی بڑی علمیت تھی۔ ان کی خاموشی بھی بہت کچھ سکھا دیتی تھی۔

سمن آباد والا مکان انہوں نے ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کے ساتھ ہی بنوالیا تھا۔ اس زمانے میں بوڑھ والے چوک سے ایک کچا راستہ ان کے گھر تک جاتا تھا۔ یہ مکان یا کوٹھی چوک کی دوسری طرف والی سٹریٹ میں تھی۔ ان کا یہ مکان میں نے پہلی بار اس وقت دیکھا جب میں بھی فلیمنگ روڈ سے اُٹھ کر سمن آباد میں آ گیا تھا۔ وقار عظیم کے ہاں میں پہلی بار ان سے ملنے گیا تو دیکھا کہ مکان کے چھوٹے سے برآمدے میں ایک تخت بچھا ہے جس پر تکیہ لگا ہے۔ دیوار پر منی پلانٹ والی بوتل لٹک رہی تھی۔ سامنے باغیچے میں پیڑ لگے تھے۔ وقار صاحب مجھے خندہ پیشانی سے ملے اور اندر لے گئے۔ کہنے لگے:

''بھئی میں نے سُنا ہے آپ نے بھی یہیں کہیں مکان خرید لیا ہے۔''

ڈرائینگ روم بڑے سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ ٹرالی کے نچلے خانے میں خشک میووں سے بھری ہوئی پلیٹیں رکھی تھیں۔ دیوار پر چغتائی کی ایک دیدہ زیب

تصویر کا پرنٹ آویزاں تھا۔ وہ خود چائے بنا رہے تھے۔ کہنے لگے:

"یہ آپ نے بڑا اچھا کیا جو اپنا مکان خرید لیا۔"

ڈرائینگ روم میں بڑی خوشگوار ٹھنڈک تھی۔ میں تھوڑی دیر اُن کی خدمت میں بیٹھا رہا۔ پھر اجازت لے کر چلا آیا۔

کچھ دنوں بعد ان کے ہاں گیا تو برآمدہ خالی تھا۔ معلوم ہوا کہ چور رات کو تخت اُٹھا کر لے گئے ہیں۔ وقار صاحب باہر تخت بچھا کر ایک خاص تہذیب کی روایت نبھا رہے تھے مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ یہاں راتوں کو جن پھرتے ہیں جو تخت اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ وقار صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا:

"غنیمت ہے کہ چور نے صرف تخت اُٹھانے پر ہی اکتفا کیا۔"

اس کے بعد انہوں نے برآمدے میں لوہے کی جالیاں لگوا لیں۔ ایک روز میں موسم برسات میں ان سے ملنے گیا تو دیکھا کہ وقار عظیم صاحب لان میں کرسی پر بیٹھے ہیں، موسم ابر آلود تھا۔ لان میں ایک طرف پپیتے کا درخت تھا اور سامنے کی جانب امرود کے کچھ پیڑ لگے تھے۔ امرود کے درختوں کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ یہ بھرے باغوں کے پیڑ ہیں۔ ایک دوست نے خاص طور پر لا کر دیئے ہیں۔ ان کے امرود بڑے میٹھے ہوتے ہیں۔ ہم باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک درخت پر پکا ہوا امرود پٹ سے گھاس پر گرا۔ وقار صاحب اُٹھے، امرود اٹھایا اور اسے رومال سے صاف کرنے لگے۔

"کھائیں گے آپ؟"

کوٹھی کے صدر دروازے والے کونے میں انہوں نے ربڑ کا ایک درخت

لگوا لیا تھا۔ یہ درخت دیکھتے دیکھتے بڑھ گیا ہے۔ لاہور میں اس درخت کا بڑا رواج ہو گیا ہے۔ اصل میں یہ ربڑ کا درخت نہیں ہے۔ اس سے ملتا جلتا بلکہ اسی خاندان کا ایک درخت ہے۔ ربڑ کے درخت میں نے سنگاپور، ملایا اور برما میں بڑے دیکھے ہیں۔ وہ ان درختوں سے ذرا مختلف ہوتے ہیں اور اتنے گھنے بھی نہیں ہوتے۔

آسمان پر بادل گھنے ہو رہے تھے۔ لگتا تھا کہ ابھی بارش ہونے لگے گی۔ وقار صاحب نے اپنے بچپن کی باتیں شروع کر دیں۔ میں ان سے پہلی بار ان کی بچپن کی یادیں سُن رہا تھا۔ کہنے لگے:

''ہمارے سکول میں جو راستہ جاتا تھا۔ وہاں ایک نہر ہوا کرتی تھی۔ ساون کی جھڑیاں لگتیں تو ہم اس نہر میں نہایا کرتے۔ نہر کی دوسری طرف آم کے باغ تھے۔ ہم ان باغوں میں گھس جاتے اور کچے پکے آم توڑ کر کھاتے۔''

اپنے بچپن کی یادیں تازہ کرتے ہوئے ان کے چہرے پر بچپن کی معصومیت آ گئی تھی۔ وقار صاحب نے آم کے ایک درخت کا خاص طور پر ذکر کیا جو اُن کے سکول کے راستے میں پڑتا تھا۔ کہنے لگے کہ درخت کی بڑی رکھوالی ہوتی تھی۔ کیونکہ اس پر بڑے عمدہ قسم کے آم لگتے تھے۔

''مگر ہم چند شرارتی بچے کسی نہ کسی طرح دیوار کے سہارے اس درخت پر چڑھ جاتے اور آم توڑتے جب رکھوالا شور مچاتا تو ہم بھاگ جاتے۔''

میں نے اپنے مکان کی پہلی تعمیرِ نو کی تو اپنے دوستوں کی دعوت کی۔ وقار صاحب کو میں نے خاص طور پر دعوت دی۔ ہمارے مکان کے پچھلے صحن میں ساتھ والوں کے گھر اُگے ہوئے آم کے درخت کی شاخیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کا

پھل ہمارے صحن میں بھی گرتا تھا۔ اپریل کا مہینا تھا درخت پر ہرے ہرے آم لگے تھے۔ وقار صاحب نے کہا کہ یہ اچاری آم ہیں۔ میں نے کچھ آم توڑ کر انہیں پیش کیے۔ جو وہ اپنے ساتھ لیتے گئے۔ وقار صاحب کو زردہ بہت پسند تھا۔ زردہ میری بھی کمزوری رہا ہے۔ اور اس روز میں نے خاص طور پر زردے کی دیگ پکوا رکھی تھی۔ اس کام کے لیے موچی دروازے کا خاص باورچی بلوایا گیا تھا۔ جس نے بڑے کمال کا زردہ پکایا۔ آج کل بیاہ شادیوں میں جو زردہ پکتا ہے اس میں نہ جانے کیا کچھ ڈال دیا جاتا ہے۔ جس سے زردے کی اصل دب کر رہ جاتی ہے۔ ہمارے والا زردہ سادہ اور اصلی تھا۔ یعنی اس میں بادام، ناریل اور ترنج کی ہوائیاں ہی چھوڑی گئی تھیں۔ اور موچی دروازے کے ماہر باورچی نے ایسی ہوائیاں چھوڑی تھیں کہ کسی کو نظر ہی نہیں آتی تھیں۔ اور سارا زردہ ان کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ وقار صاحب نے زردے کو بہت پسند کیا۔ دوسرے روز صبح صبح میں زردے کا تھال لے کر وقار صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ صرف اپنی محبت اور احترام کی وجہ سے جو میرے دل میں ان کے لیے تھا۔ زردہ ذرا سا لگ جائے تو اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ زردے کی گھروڑی کون امرتسری کشمیری ہوگا جو چھوڑ دے۔ اس کے لیے تو سب کچھ چھوڑا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں شاید کسی کی سالگرہ تھی ہم نے وقار عظیم صاحب کو خاص طور پر دعوت دی تھی۔ وہ تشریف لائے اور اپنے ساتھ دو نئی کتابیں لیتے آئے۔ ایک کتاب کا نام ''اقبال، شاعر اور فلسفی'' تھا اور دوسری کتاب ''اقبال معاصرین کی نظر میں'' یہ دونوں کتابیں انہوں نے اپنے ہاتھ سے بڑے پیارے جملے لکھ کر مجھے دیں۔ یہ کتابیں آج بھی ایک نایاب تحفے

کے طور پر میرے پاس محفوظ ہیں اور مجھے بہت عزیز ہیں۔ کیونکہ وقار عظیم ایسے نقاد اور شریف النفس بزرگ خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ چونکہ میں ان کے ہمسائیوں میں تھا۔ اس لیے ان سے شرف ملاقات کا موقع ملتا ہی رہتا تھا۔ پھر ان کی علمی اور ادبی مصروفیات بڑھتی گئیں۔ دو مہینے ان سے ملے بغیر گذر گئے۔ ایک روز میں ریڈیو سٹیشن کی دوسری منزل والے اپنے کمرے سے نکل کر راہ داری میں سے گذر رہا تھا کہ اچانک وقار عظیم سامنے سے آتے نظر آ گئے۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''یہ عید کا چاند اچانک کیسے نظر آیا۔''

وقار صاحب مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا اور کہا:

''مصروفیت ہی کچھ ایسی تھی کہ ملنے کا موقع نہ نکال سکا۔''

وہ کسی پروگرام کی ریکارڈنگ کے لیے آئے ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ریڈیو پاکستان لاہور کی فضا علمی اور ادبی پروگراموں سے معمور رہا کرتی تھی اور بلند پایہ عالم، ادیب، شاعر اور نقاد حضرات سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ وقار عظیم صاحب کو میں اس پروڈیوسر کے کمرے میں لے آیا جس نے ان کی تقریر ریکارڈ کرنا تھی۔ جب تک وقار صاحب ریڈیو سٹیشن کی عمارت میں رہے میں ان کے ساتھ رہا۔ ریکارڈنگ کے بعد میں نے انہیں چائے پیش کی۔ وہ پاکستان کے افسانوی ادب پر باتیں کر رہے تھے۔ پاکستان میں جو نئے افسانے لکھے جا رہے تھے وہ ان سے بے حد مطمئن تھے۔ انہوں نے کہا:

''یہ ایک تاریخی تسلسل ہوتا ہے۔ جب کوئی قوم اپنی ایک الگ شناخت

CS CamScanner

قائم کر لیتی ہے تو اس کی راہ میں کچھ رکاوٹیں آتی ہیں۔ مگر زندہ قومیں ان کو دور کر لیتی ہیں۔ پاکستانی بھی ایک زندہ اور آزاد قوم ہیں۔ ہماری قوم انشاء اللہ دوسرے شعبوں کے ساتھ ساتھ علم و ادب میں بھی بہت ترقی کرے گی۔''

وقار صاحب کی باتیں ہمیشہ بڑی امید افزا، اور رجائیت سے بھرپور ہوتی تھیں۔ انہیں اللہ پر بڑا بھروسہ تھا اور اس کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتے تھے۔ وہ خود نماز روزے کے پابند تھے۔ اور کلاس روم میں نوجوانوں کو بھی نماز روزے کی پابندی کی تلقین کیا کرتے۔

عید کی صبح تھی۔ گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا سامنے وقار صاحب تھے ہاتھ میں پھلوں کا لفافہ لیے مسکرا رہے تھے۔

''سوچا آپ کو عید مبارک دیتا چلوں۔''

میرے لیے یہ بڑی عزت افزائی اور برکت کی بات تھی۔ میں نے سیویاں اور سبز چائے پیش کی۔ انہوں نے صرف سبز چائے پر اکتفا کی۔ بچوں کی عیدی دی اور چلنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں انہیں چھوڑنے کے لیے گاڑی تک آیا۔ اس کے بعد ہر عید پر وقار صاحب تھوڑی دیر کے لیے عید کی مبارک دینے ہمارے ہاں ضرور تشریف لاتے۔

وقار صاحب کو سانس کی تکلیف تھی جس کا اظہار وہ کبھی نہیں کرتے تھے۔ تکلیف کچھ بڑھ گئی تو ان کا زیادہ تر وقت گھر پر ہی گزرنے لگا۔ میں ان کے آرام میں خلل ڈالنے کے خیال سے ان کی عیادت کو ہر روز نہ جاتا تیسرے چوتھے دن ان کے ہاں پہنچ جاتا۔ وہ بستر پر تکیوں کے سہارے نیم دراز ہوتے۔ وہ مسکراتے پلنگ

کی پٹی پر ہاتھ پھیر کر فرماتے:

''یہاں بیٹھئے آپ دور کیوں بیٹھے ہیں۔''

یہ ان کی مجھ سے شفقت اور محبت تھی وہ سب کا حال احوال پوچھتے۔ میں ان کا حال پوچھ لیتا تو مسکرا کر کہتے:

''بس ٹھیک ہے جو دم گذر جائے غنیمت ہے۔''

اور پھر ایک روز وہ اللہ کو پیارے ہو گئے دنیائے ادب کا ایک تابندہ ستارہ ٹوٹ کر خلاؤں میں گم ہو گیا۔ دنیا کے کام نہیں رُکتے اور رُکنے بھی نہیں چاہئیں۔ زندگی کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتی صرف زندہ رہنے والے پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے رہتے ہیں۔ ایک ستارہ ٹوٹتا ہے تو کارخانہ قدرت سے دوسرا نمودار ہو جاتا ہے، لیکن انسان ہونے کے ناطے ہم میں کچھ جذباتی کمزوریاں بھی ہیں۔ ہم بڑی محبتیں کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو جذباتی رشتوں کے جال میں اُلجھائے رکھتے ہیں۔ ہم ستاروں ایسی بے نیازی شاید پوری طرح سے اختیار نہیں کر سکتے۔ ہمارا کوئی پیارا ہم سے بچھڑ جائے تو اس کی یاد میں آنسو بھی بہاتے ہیں۔ اور مرتے دم تک اس کی یاد سے اپنے غم کو بہلاتے رہتے ہیں۔ ایک چیز کا تکمیل تک پہنچ کر فنا ہو جانا قدرت کا تقاضا ہے۔ اسی چیز سے محبت کے رشتے استوار کرنا اور پھر اس کی یاد میں آنسو بہانا یہ ہماری مجبوری ہے۔ ہو سکتا ہے یہی وہ آنسو ہوں۔ یہی وہ جذبہ محبت ہو جو قدرت کو ایک ستارے کے ٹوٹ جانے پر دوسرے ستارے کی تخلیق پر آمادہ کرتا ہو۔

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

شفقت اور محبت کا دیوتا

صادق حسین

میں نہیں بھول سکتا، جیتے جاگتے چاٹگام میں 1951ء کی ایک رات مرحوم اے ڈی اظہر کی صدارت میں ایک مشاعرہ، وہ مشاعرہ ایک شاعر نے لوٹ لیا۔ اس شاعر کی آنکھیں بڑی بڑی اور روشن تھیں۔ گندمی رنگ، چھریرا بدن، منہ میں پان کی گلوری' دلکش ترنم۔ مشاعرہ ختم ہوا تو میں نے بڑھ کر اس شاعر سے ہاتھ ملایا اور پھر ہم دونوں قدم سے قدم ملا کر مشاعرہ سے باہر نکلے۔ یوں محسوس ہوا جیسے ہم ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔ اس شاعر کا نام ہے اقبال عظیم، وقار عظیم صاحب کے چھوٹے بھائی۔

اسی سال میں رخصت پر مری آیا۔ ایک شام مال روڈ پر ٹہل رہا تھا۔ دیکھا کہ سامنے سے اقبال عظیم آ رہے ہیں۔ بغیر کسی تامل کے میں نے اس اقبال عظیم کے قریب جا کر اپنا تعارف کرایا۔ اس اقبال عظیم نے مجھے گلے سے لگا لیا اور آن کی آن میں، خلوص اور محبت اور شفقت کے موتیوں سے میری جھولی بھر دی۔ وہ سید وقار عظیم تھے۔ بڑی بڑی اور روشن آنکھیں، گندمی رنگ، چھریرا بدن' منہ میں پان کی گلوری، ہاتھ میں چھڑی، گلے میں مفلر، وہ روشن آنکھیں مجھے کھینچ کر لاہور لے آئیں۔

ایک عرصے کی بات ہے، میں نے ایک غیر ملکی کمپنی کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ عزتِ نفس کا تحفظ کر کے ضمیر مطمئن ہو گیا۔ گھر والے پریشان تھے کہ کاروبارِ زندگی کیسے چلے گا۔ اور اس بات کو صرف میں سمجھ سکتا تھا کہ وقار عظیم میرے گھر والوں سے بھی زیادہ پریشان ہیں۔ وہ دن میں‘ دو چار مرتبہ ہمارے گھر آتے، مسکراتے ہوئے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں کرتے‘ میری بیٹی نرگس سے پیار کرتے۔ جب نرگس نے بی اے کر لیا۔ تو وقار عظیم گرمیوں کی دھوپ میں، چھتری لگا اسے گورنمنٹ کالج میں داخل کرانے اپنے ساتھ لے کر گئے۔ میری شریکِ حیات نے کہا: “آپ کے سارے دُکھ درد وقار صاحب نے اپنے کمزور کندھوں پر اُٹھا رکھے ہیں۔” یہ سُن کر میں نے سوچا: “یہ کمزور کندھے کتنے توانا ہیں۔ اس دبلے پتلے جسم کے اندر، دل کے معبد میں، انسان دوستی کے کتنے چراغ روشن ہیں۔”

جب نرگس کی شادی ہوئی تو وقار عظیم نے اپنے ہاتھوں سے ایک بیٹی کو رخصت کیا۔ پھر دفعتاً موت نے ہمارے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ سردیوں کی ایک رات ہمیں اطلاع ملی کہ نرگس کا طرابلس میں انتقال ہو گیا ہے۔ وقار عظیم فوراً ہمارے گھر پہنچے اس وقت انہیں دمے کی تکلیف تھی۔ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ میں نے بار بار عرض کیا: “آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ آپ آرام فرمائیں۔” انہوں نے ہر بار جواب دیا۔ “ٹھیک ہوں۔” موت کے تقدس نے در و دیوار پر خاموشی طاری کر رکھی تھی۔ اس خاموشی میں وقار عظیم کی چپ کی گمبھیرتا ہمارا سہارا تھی۔

ایک مرتبہ میں، بے خیالی میں، ایک گولی کے بجائے زیادہ تعداد میں

خواب آور گولیاں کھا گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ اب کوچ کا وقت آ پہنچا۔ بیوی کو ماجرا سنایا۔ وہ گھبرا گئیں۔ لپک کر وقار صاحب کو بلا لائیں۔ اس عرصے میں، میں وصیت کر چکا تھا کہ میرے ادھورے افسانے کے مرکزی کردار کو کثیر تعداد میں خواب آور گولیاں کھلا کر ہلاک کر دیا جائے۔ اور اب نہایت سنجیدگی سے موت کا انتظار کر رہا تھا۔ وقار صاحب مسکراتے ہوئے تشریف لائے۔ اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ فرمایا: " آپ ہشاش بشاش نظر آ رہے ہیں۔ لائیے گولیوں کی بوتل، میں آپ کے سامنے ساری گولیاں کھا جاؤں گا اور مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ رات گئے تک میرے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ سورج نکلا تو میرے گھر کے افراد سو رہے تھے۔ میں جاگ رہا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ گولیاں کسی جعلی دوا ساز ادارے کی تیار کردہ تھیں۔ خدا بھلا کرے ان جعلی دوا سازوں کا۔ اگر یہ سماج دشمن عناصر ہزار آدمیوں کی جان لیتے ہیں تو ایک آدھ کی زندگی بچا بھی لیتے ہیں۔

ہم پان نہیں کھاتے مگر ہر عید پر وقار صاحب کے گھر پر پان کھانا ہمارے لئے ایک روایت بن گئی۔ میں اور میری بیوی جب یہ روایتی پان کھاتے تو میں کہتا: ”ہم تو عید بقرعید پر پان کھاتے ہیں۔“ وقار صاحب یہ سُن کر چپکے سے مسکرا دیتے۔ جب ہمیں پتہ چلا کہ عید بقرعید پر پان کون کھاتا ہے تو وقار صاحب کی مسکراہٹ کا مطلب سمجھ میں آیا۔

سردیوں کی ایک رات، سیّد وقار عظیم نے مجھے بلوا بھیجا۔ ان دنوں وہ سینے کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ انہیں میو ہسپتال پہنچایا گیا۔ ڈاکٹر کی ہدایات پر وقار صاحب نے پہلے اچکن اتاری، پھر سویٹر، قمیض، بنیان وقار صاحب نے یہ

کپڑے یکے بعد دیگرے اتارتے ہوئے فرمایا: ''آپ بھی کیا کہتے ہوں گے کہ میں نے کیا کچھ پہن رکھا ہے۔'' اس وقت میں نے سوچا کہ بیشتر لوگ کپڑے پہن کر بھی ننگے ہوتے ہیں۔ اس بڑے انسان کے ننگے سینے کے اندر ایک حسین دنیا آباد ہے۔ جس دنیا کے افق سے امن و آشتی کا سورج چمک رہا ہے۔ جس دنیا کی دھرتی کا ذرہ ذرہ جگ مگ جگ مگ کر رہا ہے۔

ایک مرتبہ سید وقار عظیم راولپنڈی میں ہمارے گھر اچانک جا پہنچے۔ انہیں اتفاق سے راولپنڈی جانا پڑا۔ انہیں معلوم تھا کہ میرے بال بچے چند دنوں کے لئے اپنے آبائی شہر گئے ہوئے ہیں۔ بوہڑ بازار کے دکانداروں اور راہ گیروں سے پوچھتے پوچھتے، ایک ہاتھ میں چھتری اور دوسرے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ لئے، وقار صاحب ہمارے گھر کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ راولپنڈی کا بوہڑ بازار آج بھی ایک روایتی محلہ ہے۔ اس محلے کے لوگ آج بھی کہتے ہیں کہ ہمارے گھر کی ڈیوڑھی میں ایک دبلا پتلا شخص، ایک ہاتھ میں چھتری اور دوسرے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ لئے کھڑا ہے۔ تصور کی یہ جنت تا ابد قائم رہے گی۔

میں نے 26 سال کی رفاقت میں سید وقار عظیم کی زبان سے کسی کے خلاف بات نہیں سنی۔ اگر کوئی شخص ان کی موجودگی میں کسی کے بارے میں نازیبا بات کرتا تو وہ اسے نرمی سے ٹوک دیتے۔ میں جب بھی ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ انہیں کام کرتے پایا۔ وہ تخت پر بیٹھ کر لکھتے تھے۔ ان کے کمرے کی ہر چیز ایسی صاف ستھری ہوتی تھی کہ انسان دیکھا کرے۔ وہ کم خورو کم خواب تھے۔ ضرورت مندوں کی چپکے سے مدد کر دیتے۔ جو شخص ان کے پاس آتا۔ خالی ہاتھ نہ

جاتا۔ وہ بصیرت افروز باتوں کے خزانے لے کر جاتا۔ میں نے انہیں اکثر جانماز پر سجدہ ریز دیکھا۔ انہیں رقت میں، خاموش دعائیں مانگتے دیکھا۔ یہ معاملہ ان کا اور ان کے رب کا تھا۔ وہ رب جس نے انہیں انسانیت کا دوست بنا کر بھیجا تھا۔ ان کے ہونٹوں پر سرورِ کائنات کا نام آتا تو ان کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔

انسان مرجاتا ہے۔ انسان زندہ رہتا ہے

سیدوقار عظیم زندہ ہے۔

اب بھی ان کی باتوں کی خوشبو آرہی ہے۔

فیصلہ انسانوں کے دل کرتے ہیں۔ یہ فیصلہ تاریخ بن جاتا ہے۔

سیدوقار عظیم ایک تاریخ ہے۔ آنے والی نسلیں یہ تاریخ پڑھ کر محبت اور امن و آشتی کا درس لیں گی۔

* * *

ان کا سب سے بڑا اعزاز یہ ہے کہ ان کے شاگرد اور مداح اور پڑھنے والے اور اُردو ادب اور ایشیائی تہذیب کی تاریخ انہیں بڑی محبت کے ساتھ مدتوں یاد کرتے رہیں گے۔ انسان کا سب سے بڑا اعزاز وہ ہے جو دوسرے انسانوں کے دلوں میں جاگزیں ہو جائے۔”

جمیل الدین عالی

* * *

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

ایک مکمل انسان

پروفیسر مشرف انصاری

پروفیسر سیّد وقار عظیم اس دنیا سے اُٹھ گئے اور اپنے ساتھ نہ جانے کتنی ایسی خوبیاں لے گئے جو میرے نزدیک اب کسی اور میں نہیں۔ میں انہیں ’’بھائی صاحب‘‘ کہتا تھا۔ میرا ان کا خون کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ ہم پیشہ و ہم مشرب ہونے کا ناتا تھا لیکن اب کس سے کہوں اور کون یقین کرے گا کہ اس رشتہ میں کیا کچھ نہ تھا۔ وہ مجھ پر سگے بھائی کی سی شفقت فرماتے اور میں انہیں بھائیوں سے زیادہ عزیز اور بزرگوں سے زیادہ بزرگ سمجھتا تھا۔ آج ان کے تصور کے سامنے خدائے سخن میر تقی میر کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے:

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اور میں سمجھتا ہوں کہ بھائی صاحب کی بے مثال سیرت، تدریسی خدمات اور ادبی کارناموں کو نظر میں رکھیے تو محسوس ہوگا کہ میر کے اس شعر کا جتنا بھرپور اطلاق ان کی ذات پر ہوتا ہے۔ شاید ہی کسی دوسری شخصیت پر ہو سکے۔ ایسے جامع کمالات اور صاحب سیرت لوگ برسوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا نقش ایسا گہرا اور دیرپا ہوتا ہے کہ گردشِ ایام کے مٹائے نہیں مٹتا۔

غالباً 1942ء کا ذکر ہے جب میں لکھنؤ یونیورسٹی میں بی اے کا طالب علم تھا۔ میرے تین شفیق اُستادوں مسعود حسین رضوی ادیب، مولانا محمد حسین اور احتشام حسین صاحب نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے اُردو کی کلاس میں بھائی صاحب کا تذکرہ کیا۔ اوّل الذکر دونوں اُستادوں نے ان کا ذکر ہونہار شاگرد کی حیثیت سے کیا اور ان کی ادبی صلاحیتوں کی دل کھول کر تعریف کی۔ احتشام صاحب کے تذکرے میں ایک دوست بلکہ محسن کا رنگ نمایاں تھا۔ انہوں نے پہلی بار مجھے مشورہ دیا کہ افسانوی ادب پر بھائی صاحب کی دو مطبوعات ''ہمارے افسانے'' اور'' فن افسانہ نگاری'' کا مطالعہ کروں۔ اساتذہ کے محبت آمیز تعارف نے دل پر اثر کیا۔ چند دنوں بعد یہ دونوں کتابیں پڑھیں تو موضوع کی ندرت اور اسلوب کی دل نشینی نے ایسا گرویدہ کیا کہ بھائی صاحب سے ملنے کی آرزو ہوئی۔ اتفاق سے سید احسان عظیم (بھائی صاحب کے تایا جان) اس زمانہ میں لکھنؤ میں ڈپٹی پوسٹ ماسٹر جنرل تھے۔ ان کے سب سے چھوٹے صاحبزادے سعید العظیم سے میں متعارف تھا۔ ان سے جاکر ملا تو پتہ چلا بھائی صاحب جامعہ ملیہ دلّی میں اُستاد ہیں۔ چند ماہ بعد دوبارہ گیا تو معلوم ہوا کہ وہ جامعہ چھوڑ کر پولی ٹیکنیک سے وابستہ ہو گئے ہیں غرض بھائی صاحب سے ملاقات کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

تقسیم کے بعد میں دوسری بار لاہور آیا تو مشفق ڈاکٹر ابواللیث صدیقی سے رسم و راہ ہوئی۔ اور انہیں کی تحریک پر جنوری 1950ء میں لیکچرار کی حیثیت سے میرا تقرر یونیورسٹی اورینٹل کالج میں ہوا۔ اس وقت شعبہ اُردو میں مکرمی

ڈاکٹر سید عبد اللہ، لیث صاحب اور میں صرف تین اُستاد تھے۔ بھائی صاحب اس زمانہ میں "ماہِ نو" کے مدیر تھے۔ البتہ یہ خبر گرم تھی کہ ان سے اور برادرم عبادت بریلوی سے گفت وشنید ہو رہی ہے۔ عنقریب دونوں کا تقرر ہو جائے گا۔ میں ذاتی طور پر ان دونوں کی آمد کا بڑی بے چینی سے منتظر تھا۔ عبادت صاحب تو چند ماہ بعد شاید مئی 1950ء میں آئے مگر بھائی صاحب فروری کے آخر یا مارچ کے پہلے ہفتے میں لاہور پہنچے اور آتے ہی کام شروع کر دیا۔ میں ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کے کمرے میں بیٹھا کرتا تھا۔ اسی کمرے میں میری بھائی صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی۔ میرے ذہن میں ان کے متعلق نہ جانے کیوں ایک بارعب، تندرست وتوانا اور آن بان والے انسان کا تصور تھا۔ مگر جب وہ سامنے آئے تو نقشہ ہی اور تھا۔ دراز قد، سانولی رنگت، ستواں ناک، کشادہ پیشانی، روشن آنکھیں، لبوں پر ایک خاص طرح کا تبسم، گالوں پر جُھریاں جو شاید کلین شیو نہ ہوتے تو کم محسوس ہوتیں۔ سر پر انگریزی فیشن کے کھچڑی بال، ضرورت سے زیادہ دبلے پتلے، اس پر طرہ یہ کہ لباس میں بے محابا سادگی یعنی علی گڑھ کاٹ کا پاجامہ، بدن پر شیروانی جس کا کالر اور اوپر کے دو تین بٹن ایسے کھلے ہوئے کہ اکہرے کالر کی قمیض نظر آ رہی تھی۔ اور بس۔ وہ مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ لیث صاحب نے معانقے کے بعد میرا تعارف کرایا تو بڑی محبت سے بغل گیر ہوئے اور چند ہی منٹ میں ایسے بے تکلف ہو گئے۔ جیسے وہ مجھے برسوں سے جانتے ہیں۔

مذکورہ پہلی ملاقات اور 17 نومبر 1976ء کی وہ ویران شام، جب وہ

ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہو گئے، کے درمیان ستائیس سال کا طویل عرصہ حائل ہے۔ اس لمبی مدت میں، میں نے بھائی صاحب کو جتنا قریب سے دیکھا ہے شاید ہی کسی دوست یا عزیز نے دیکھا ہو اور میں اپنے ذاتی مشاہدے و تجربے کی روشنی میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک مکمل انسان تھے۔ ان کی شخصیت اتنی جامع اور متنوع تھی کہ وہ ہر موضوع اور ہر موقع سے نہایت خوش اسلوبی سے عہدہ برآ ہوئے ان کی صحبت میں جی لگتا تھا اور کبھی ایسی کمی کا احساس نہیں ہوا، جسے پورا کرنے کے لئے کسی اور کو ڈھونڈنے کی ضرورت پیش آئی ہو۔ وہ مشرقی تہذیب کا ایک معتدل و متوازن نمونہ تھے۔ شرافت و اخلاق، مروت و ہمدردی اور انکسار و وضعداری نے یکجا ہو کر ان کی شخصیت کو اس درجہ دلکش و دلنشین بنا دیا تھا کہ جو بھی ان سے ایک مرتبہ مل لیتا ممکن ہی نہ تھا کہ دل سے ان کا احترام نہ کرنے لگے۔

انسان کی حقیقی برتری و بڑائی اس کے اخلاق میں ہے۔ اخلاق کی پابندی و استواری میں انسان کے جوہر کھلتے ہیں۔ بھائی صاحب کی عظمت و فضیلت کا راز بھی دراصل ان کے اخلاقِ حمیدہ میں مضمر تھا۔ ان کے بارے میں محض یہ تصور کر لینا کہ وہ کریم النفس تھے، دوسروں سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے، تواضع و مدارات کرتے تھے، زبان و قلم سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے اور ضرورت مند کی ضرورت پوری کرتے تھے۔ ہرگز ہرگز کافی نہیں۔ ان کے وسیع اخلاق کی حدود میں عزم و استقلال، ضبط و تحمل، ہمت و جرأت، کام کی لگن، فرض شناسی، دیانت، صداقت، رواداری، انصاف، ہمدردی، ایثار وغیرہ سب کچھ آ جاتا ہے۔ وہ دوسروں کے دُکھ درد میں تا مقدور شریک ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ

اسے اپنا دُکھ درد سمجھتے تھے۔ انہیں اپنے ملک وقوم، دین وثقافت اور زبان وادب سے بے پناہ محبت تھی۔ اور اُن میں سے کسی کے مفاد پر اپنی ذاتی اغراض کو وہ کبھی ترجیح نہیں دیتے تھے۔

بھائی صاحب کی گراں مایہ ادبی تخلیقات اور بحیثیت استاد انہوں نے جو باوقار مقام حاصل کیا دونوں سے صرف نظر کر کے ان کی شخصیت پر غور کرتا ہوں تو دل گواہی دیتا ہے کہ ایسی جاذب ودل آویز شخصیت کی تشکیل وتعمیر میں نہ جانے کتنی عظیم ہستیوں نے حصہ لیا ہوگا۔ قدرت نے انہیں محبت، ذہانت اور دردمندی جیسی گراں بہا صفات سے بہرہ ورضرور کیا تھا۔ لیکن ان خوبیوں کو جلا دے کر نقطۂ کمال تک پہنچانا، انہیں بزرگوں کا حصہ ہے اس ضمن میں میری چشمِ تصور کے سامنے سب سے پہلا نقش جس ہستی کا ابھرتا ہے۔ وہ ان کے والد ماجد سیّد مقبول عظیم عرش ہیں۔ جو محکمہ پولیس کے ایک نیک نام اور باذوق افسر تھے۔ شعر وادب کے رسیا ہونے کے ساتھ ساتھ خود شاعر تھے اور بیان یزدانی میرٹھی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ غزلیں بھی کہیں مگر نعت گوئی سے انہیں خاص شغف تھا۔ گھر پر شعر وسخن کی محفلیں برپا کرتے۔ جن میں ایک زمانہ میں نواب جعفر علی خان اثر، جگت موہن لال رواں، رضی بدایونی، فرخ بناری وغیرہ شریک ہوتے۔ ان مجالس میں شفیق باپ تربیتِ ذوق کی خاطر بھائی صاحب کو بلا کر بٹھاتے۔ گھر میں اُردو اور فارسی کے مشہور شعراء کے دیوان موجود تھے۔ ہر ماہ چند رسائل بھی آتے تھے۔ جن کی ورق گردانی کا انہیں موقع ملتا۔ اس طرح ابتدا ہی سے انہیں ایسا گھریلو ماحول میسّر آیا۔ جس نے پڑھنے لکھنے کے شوق کو تیز سے تیز تر کر دیا۔

انٹرمیڈیٹ انہوں نے گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ سے کیا۔ جہاں حامد اللہ افسر اور علی عباس حسینی جیسے نامور اساتذہ موجود تھے۔ ان بزرگوں کی تدریس و تربیت کے اثر سے بھائی صاحب کا ادبی ذوق نکھرا اور تنقیدی شعور بیدار ہوا۔ بی اے میں اُستاد مسعود حسین رضوی ادیب اور مولانا محمد حسین جیسے فضلاء کا قرب نصیب ہوا۔ جو بہت اچھا پڑھانے کے علاوہ طالب علم میں مطالعے کا شوق پیدا کر دیتے تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں 1932ء تک ایم اے اُردو کی کلاس کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ مجبوراً انہیں الٰہ آباد جانا پڑا۔ الٰہ آباد یونیورسٹی میں وہ ڈاکٹر حفیظ سیّد، ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر زبیر احمد اور پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق کے بہت قریب رہے۔ ان معروف اور فاضل اساتذہ سے انہوں نے اتنا کچھ سیکھا جو تمام عمر ان کے کام آیا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد بھائی صاحب نے ملازمت کا باقاعدہ آغاز جامعہ ملیہ دلی سے کیا۔ غیر منقسم ہندوستان میں جامعہ اپنی نوعیت کا واحد تعلیمی ادارہ تھا۔ جہاں درس و تدریس کے ماسوا طلباء کے بہتر اور مفید انسان بنانے پر سب سے زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہاں کی تعلیم کا بنیادی مقصد نوخیز طلباء کی شخصیت کو سنوارنا اور نکھارنا تھا۔ اس مقصد کے تحت تمام طلباء نہ صرف اپنا ہر کام خود کرتے بلکہ رضا کارانہ ذمہ داریاں بھی سنبھالتے۔ ان ذمہ داریوں کی انجام دہی میں اساتذہ ان کی رہبری و رہنمائی بھی کرتے اور ایک مخلص دوست کی طرح برابر کے شریک رہتے تھے۔ بنا بریں جامعہ کا ہر استاد اپنے علم و فضل کے ساتھ ساتھ ایثار و قربانی اور انسانی خدمت کے جذبے سے سرشار ہوا کرتا تھا۔ بھائی صاحب

کے رفقائے کار شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب وغیرہ جیسی عظیم ہستیاں تھیں۔ جن کے ایثار کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ حضرات ساٹھ یا اسی روپے ماہوار تنخواہ لیتے تھے۔ اور اس قلیل معاوضہ میں سے بھی ایک تہائی رقم طلباء کے بہبود فنڈ میں دے دیتے تھے۔ ظاہر ہے اس آمدنی میں گزارا ناممکن تھا۔ چنانچہ وہاں کے جملہ اساتذہ کو لکھنے پڑھنے کا اتنا فاضل کام کرنا پڑتا تھا۔ جو ایک معلّم کے شایانِ شان زندگی بسر کرنے کے لئے کافی ہو۔ جامعہ میں دو طرح کے کام ہوتے تھے۔ ایک اچھی کتابوں کے تراجم، دو نصابی کتب کی تیاری۔ اور ان دونوں کاموں کا جامعہ میں رہ کر بھائی صاحب کو اعلیٰ درجہ کا تجربہ ہوا۔ وہ آئندہ زندگی میں ان کے لئے نہایت مفید ثابت ہوا۔

میرے نزدیک بھائی صاحب اس لحاظ سے بے حد خوش نصیب تھے کہ انہوں نے ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی۔ جہاں نیکی و راستبازی اور علم و ادب کا چرچا تھا۔ پھر انہیں ایسے نامور اساتذہ سے اکتسابِ علم کا موقع ملا جو محبت و شائستگی کا گہوارہ تھے اور جسے بھی ان کا قرب میسّر آ جاتا۔ انسان بن جاتا۔ آخر میں جامعہ کی پرخلوص فضا اور یگانۂ روزگار رفقاء کی صحبت کیمیا اثر نے تو بس انہیں کندن بنا دیا۔

جبھی تو جامعہ سے نکل کر انہوں نے جس طرف کا بھی رُخ کیا۔ نیک نامی و سرخروئی ان کے جلو میں رہی۔ وہ پولی ٹیکنیک میں رہے، پھر ''آج کل'' کی ادارت سنبھالی۔ تقسیم کے بعد ''ماہِ نو'' کے خدوخال متعین کئے۔ وہاں سے ہٹے تو پنجاب یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے اور عمر عزیز کے اکیس سال اسی دانشگاہ میں گزار دیئے۔ غرض جامعہ کے بعد وہ جہاں بھی گئے عزت اور شہرت نے ان کے قدم لئے۔

ہر ذمہ دار شخص کسی نہ کسی حد تک فرض شناس تو ہوتا ہی ہے۔ مگر بھائی صاحب کو میں نے جس پایہ کا فرض شناس پایا بہت کم لوگ اس معیار پر پورا اُترتے ہیں۔ وہ جب تک یونیورسٹی میں رہے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ تاخیر سے اپنی کلاس میں پہنچے ہوں یا وقت سے پہلے کلاس کو چھوڑا ہو۔ فارغ اوقات میں طلباء اپنی انفرادی مشکلات ان کے پاس لے کر جاتے۔ جنہیں وہ توجہ سے سنتے اور حل کرتے اس طرح تحقیقی کام کرنے والے طلباء و طالبات ان کی نگرانی میں کام کر کے خوش ہوتے تھے۔ تدریس کے علاوہ علمی، مجلسی یا انتظامی جو بھی ذمہ داریاں ان کے سپرد کی جاتیں وہ پورے انہماک، دیانت داری اور تندہی سے انجام دیتے۔ ملازمت کے دوران اور اس کے بعد کئی علمی و ادبی اداروں سے ان کی وابستگی رہی۔ ادارہ تصنیف و تالیف پنجاب یونیورسٹی سے وہ برسوں متعلق رہے اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ان کے عہد میں اس ادارے میں وضع اصطلاحات اور تراجم کا کام جس معیار و مقدار اور باقاعدگی سے ہوا پھر نہ ہو سکا۔ اس طرح مجلس استناد محکمۂ زبانِ دفتری، مجلسِ ترقی ادب، مرکزی اُردو بورڈ، مرکزی مجلسِ اقبال، کری کولم کمیٹی، رائٹرز گلڈ وغیرہ جیسے اداروں سے آخر دم تک ان کا تعلق رہا۔ ان کے ساتھ کام کرنے والے معترف ہیں کہ بھائی صاحب نے جس خلوص، فرض شناسی اور توجہ سے ان اداروں کے لئے کام کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ وقت کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ وہ وقت معین سے ہمیشہ چند منٹ پہلے ہر میٹنگ میں پہنچ جاتے تھے۔ اس معاملے میں گرمی، سردی، بارش، آندھی یا طوفان کوئی چیز ان کی راہ میں حائل نہ ہو سکتی تھی۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوا کہ تیز بخار چڑھا ہے اور متعلقین منع کر رہے ہیں کہ

آج نہ جائیے مگر وہ اسی حال میں تیار ہو کر ٹھیک وقت پر نکل کھڑے ہوتے۔ علمی کاموں کو عبادت سمجھ کر کرتے میں نے انہیں کو دیکھا۔

بھائی صاحب بڑے کریم النفس انسان تھے۔ وہ چھوٹوں پر شفقت کرتے تھے۔ انہیں پناہ دیتے، دل دہی کرتے اور ہر ممکن امداد و اعانت کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ ان کی آغوش میں رحمت تھی۔ ان سے اپنا دُکھ سکھ بیان کرنے کے معنی یہ تھے کہ اب ساری ذمہ داری ان کی اور سہولت و سرخروئی مدد لینے والے کی۔ ان کے پاس جب بھی جاؤ وہ دیکھتے ہی مسکراتے اور ایسے پیار و محبت سے خوش آمدید کہتے کہ پریشان حال دوست تھوڑی دیر کے لئے اپنا سارا غم بھول جاتا۔ پھر گفتگو کا سلسلہ شروع ہوتا۔ دورانِ گفتگو جانے والا اپنی پریشانی کا اظہار کرتا تو وہ عموماً یہی کہتے: ''ارے اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ گھبراؤ نہیں کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔'' یہ بات وہ اتنے اعتماد اور دل آسائی کے ساتھ دوستی و بزرگی کی شان سے کہتے کہ ضرورت مند سوچتا میں ناحق پریشان ہوا اگر پہلے آ جاتا تو خواہ مخواہ اتنے دن مصیبت و مایوسی کا شکار نہ ہوتا۔

میں نے بہت کم لوگوں کو بھائی صاحب جیسی شگفتہ و لطیف باتیں کرتے سُنا ہے۔ برجستہ فقروں، چبھتے ہوئے جملوں اور برمحل لطائف کی ان کے یہاں کمی نہ تھی۔ جب زیادہ موڈ میں ہوتے تو موضوع کی مناسبت سے حسرت، اصغر، جگر اور اکثر اکبرالٰہ آبادی کے اشعار سُناتے۔ میں نے اپنی نیاز مندی کی طویل مدت میں ایک ہی فقرہ یا لطیفہ دہراتے انہیں کبھی نہیں سُنا۔ وہ جسے دوست رکھتے اس سے خوش ہو کر اور کھلے دل سے ملتے اور ہمیشہ خوش دلی یا خوش طبعی کا کوئی نہ کوئی فقرہ ضرور

کہتے۔ جو جتنا چھوٹا ہوتا اس سے اتنی ہی فروتنی اور شفقت سے ملتے گفتگو میں کوئی گندہ لفظ یا رکیک فقرہ ان کی زبان سے نکلتے میری شنید میں نہیں آیا۔ بات آہستہ اور مسکرا کر کرتے۔ لہجہ نرم و شگفتہ مگر پروقار ہوتا۔ ان کے ملنے والے مختلف مزاج اور مشرب کے لوگ تھے۔ لیکن وہ کلام اس انداز سے کرتے کہ نہ اپنی وضع ہاتھ سے جاتی نہ مخاطب مایوس ہوتا۔

وہ بہت اچھی صحت کے مالک نہیں تھے۔ خصوصاً کراچی سے ضیق النفس کا جو نامراد روگ وہ لے کر آئے اس نے انہیں بہت پریشان کیا۔ مگر یہ چیز ان کے کام کی لگن اور عزائم کو متزلزل نہ کر سکی۔

انہوں نے محنت سے جی نہیں چرایا۔ دن رات کام میں لگے رہے لیکن انہیں کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میں بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے۔ اس لئے انہیں اپنے کام پر فخر یا غرور نہ تھا۔ تصنیف یا تالیف، رسالے کے لئے مضمون، کتاب پر تبصرہ، ریڈیو یا ٹیلی وژن کی تقریر غرض کسی علمی یا ادبی کام کو انہوں نے اپنے لئے بوجھ نہیں بنایا۔ ہر کام خوش دلی، مستعدی اور دیانت داری کے ساتھ پروگرام کے مطابق وقت پر کیا۔ عام طور پر لکھنے پڑھنے کا کام کرنے کے لئے لوگ سکون و خاموشی کے متلاشی ہوتے ہیں۔ خاص کر کام کے دوران کسی کا مُخل ہونا برداشت نہیں کرتے کہ اس سے خیالات کا شیرازہ منتشر اور طبیعت اچاٹ ہو جاتی ہے۔ لیکن بھائی صاحب کی ذہانت، وسعت مطالعہ اور فنی مہارت کی داد دینا پڑتی ہے کہ وہ کام کے دوران گھریلو مسائل سے بھی نمٹتے جاتے تھے۔ بچے چیخ و پکار کر رہے ہوں۔ تب بھی ان کے سلسلۂ خیالات میں کوئی انتشار پیدا نہ ہوتا۔ کوئی مہمان

آ جاتا تو وہ اپنا قلم روک کر اس سے ہم کلام ہو جاتے اور جب وہ رخصت ہو جاتا تو جہاں سے جملہ چھوڑا تھا۔ آگے لکھنا شروع کر دیتے تا آنکہ مضمون ختم ہو جاتا۔ ان کے قلم کی روانی دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے سارا ضروری مواد ان کی نظر کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔

بھائی صاحب نے زندگی میں کئی نشیب و فراز دیکھے۔ مختلف مذاق، عمر اور حیثیت کے لوگوں سے ان کا واسطہ پڑا۔ مگر خلوص اور خودداری کا دامن انہوں نے کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ وہ اگر باشعور نقاد و ادیب اور شفیق استاد نہ بھی ہوتے تب بھی ایک بے مثل و منفرد انسان ضرور ہوتے۔ میں ان کے اکثر ملنے والوں کو جانتا ہوں۔ جن میں ادیب، شاعر، دانشور، طالب علم، تاجر، امراء، سرکاری افسر، اہل حرفہ، درویش غرض ہر طرح کے لوگ شامل ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں جو بھائی صاحب کے بارے میں رطب اللسان نہ ہو یہاں تک کہ ان کے نظریات و آراء سے اختلاف کرنے والے بھی ان کا احترام ضرور کرتے تھے۔

1970ء میں وہ یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ دیکھا یہی گیا ہے کہ عزت و نیک نامی سے ریٹائر ہونے کے بعد لوگ اطمینان کا سانس لیتے اور آرام کرتے ہیں مگر بھائی صاحب نے اس عام روش کے برخلاف اپنے علمی و ادبی مشاغل میں مزید اضافہ کر لیا۔ جیسے وہ کئی پچھلے اور بکھرے ہوئے کاموں کو جلد سے جلد مکمل کرنا چاہتے ہوں۔ اس سن و سال اور اتنے دھان پان ہونے کے باوجود وہ اتنا کام کرتے تھے۔ جوان سے کم عمر والوں کے لئے مشکل تھا۔ ان کے ذہنی قواء پورے طور پر بیدار و استوار تھے۔ اور شگفتگی و زندہ دلی میں ذرہ برابر

فرق نہیں آیا تھا۔ انتقال سے دس بارہ دن پہلے مجھے پتہ چلا کہ ان کے گردوں میں پتھری ہے اور پیشاب میں خون آیا ہے۔ میں 8 نومبر کی شام ملنے گیا تو بھابھی جان سے پتہ چلا کہ ملتان گئے ہیں بس آتے ہی ہوں گے۔ تقریباً ساڑھے چھ بجے وہ واپس آئے اور کمرہ میں مسکراتے ہوئے داخل ہوئے۔ مجھے دیکھتے ہی بڑھ کر گلے سے لگا لیا۔ ملتان کے سفر اور یونیورسٹی کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے طبیعت کا حال پوچھا تو سرگوشی کے انداز میں بولے: ''مشرف مجھے کل پیشاب میں تھوڑا سا خون آ گیا تھا۔ مگر تکلیف کوئی نہیں۔ کل ایکسرے کرواؤں گا۔'' پھر اس خیال سے کہ بھابھی کچھ شک نہ کریں۔ گفتگو کا موضوع بدل کر قدرے بلند آواز سے کہا کہ: ''مشرف ڈرائیور چلا جائے گا۔ اور تمہیں سواری میں دقت ہوگی۔ ابھی گھر چلے جاؤ۔'' میں ان کی خواہش کے مطابق مطمئن ہو کر واپس چلا آیا۔

13 نومبر کو عزیز اظہر وقار نے کالج میں مجھے بتایا کہ بابا ہاجرہ میموریل کلینک میں داخل ہیں۔ اور مجھے تاکید کی تھی کہ مشرف چچا سے کہنا یہاں آ کر ملیں۔ یہ خبر سُن کر میں بدحواس ہو گیا اور ایک ہی سانس میں اظہر سے نہ جانے کتنے سوالات کر ڈالے۔ بارے اس نے اطمینان دلا دیا۔ کالج سے فارغ ہو کر تین بجے میں انہیں دیکھنے گیا۔ کمرہ میں داخل ہوا تو پلنگ پر لیٹے تھے۔ ساتھ ٹرانسسٹر رکھا تھا۔ اور کرکٹ کمنٹری سُن رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی مسکرائے اور ہاتھ بڑھایا میں قریب گیا تو میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینہ پر رکھ لیا اور دیر تک پکڑے رہے۔ پھر نہایت اطمینان سے بولے: ''مشرف! پریشانی کی کوئی بات نہیں میں ازرہِ احتیاط داخل ہو گیا ہوں۔ یہاں باقاعدگی سے معائنہ اور علاج ہو جائے گا۔ ایکسرے سے پتہ چلا ہے

کہ دس بارہ چھوٹے چھوٹے پتھر ہیں۔ جن کی وجہ سے پیشاب میں تکلیف ہے۔ اتفاق سے مجھے یرقان بھی ہو گیا ہے۔ دو چار دن میں اس کا زور ٹوٹے تو پھر اصل بیماری کا علاج ہو۔''

علامت کی یہ روئیداد سُن کر مجھے تشویش ہوئی۔ لیکن دُور دُور یہ خیال بھی نہیں تھا کہ چند گھنٹوں بعد قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ میں گلاس اٹھانے الماری کی طرف گیا تو چند کتابیں نظر آئیں۔ میں نے بھائی صاحب سے پوچھا یہ کتابیں کون لایا؟ تو ہنس کر بولے: ''میں نے منگوائی ہیں۔ اقبال پر ایک کتاب میرے ذمہ باقی ہے۔ کل انشاء اللہ بیٹھ کر کچھ لکھنے کا ارادہ ہے۔ معین صاحب کو بھی بلوایا ہے۔'' میں حیران رہ گیا کہ اس عالم میں بھی فرض شناسی اور کام کی لگن اپنی جگہ جوں کی توں ہے۔ بہرصورت میں نے سمجھایا کہ اتنی عجلت بھی کیا ہے۔ چند دن میں یہاں سے فارغ ہو کر گھر چلئے گا تو کر لیجیے گا۔ یہ سُن کر مسکرائے اور کہنے لگے: ''اچھی بات ہے۔'' اتنے میں چھ بج گئے۔ اور میں ان سے رخصت ہو کر گھر آ گیا۔

اسی رات 10 بجے بھائی صاحب کی حالت بگڑی اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ اتوار کی صبح سے بدھ کی شام تک چند گھنٹوں کے علاوہ سارا وقت میں انہیں کے پاس رہا نہ مجھ میں بھائی صاحب کو اس حال میں چھوڑنے کا یارا تھا۔ نہ بچوں (انور، اختر، اطہر اور اظہر وقار) کو گوارا تھا کہ میں ان سے ایک منٹ کے لئے جدا ہوں۔ بلکہ میرا کمرے میں رہنا سب کے لئے باعثِ تقویت و سکون اور باہر نکلنا اس بات کی علامت سمجھا جانے لگا کہ خدانخواستہ خیریت نہیں ہے۔ بہرطور ان چار دنوں میں دوا سے لے کر دعا تک کے تمام مراحل طے ہو گئے۔ بھائی صاحب

CS CamScanner

کے جسم کا سارا خون بھی تبدیل کیا گیا مگر وہ انہونی جس کا دھڑکا لگا تھا آخر ہو کر رہی۔ 17 نومبر چہار شنبہ کو شام 7 بج کر 33 منٹ پر خلوص و محبت اور مرحمت کا وہ پیکرِ مجسم ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے زندگی کی سب سے مضبوط طناب ٹوٹ گئی۔ زندگی جو عبارت تھی بھائی صاحب کی محبت و شیفتگی سے اس میں خلا پیدا ہو گیا۔ گلزار بخاری نے سچ کہا ہے:

جانے والوں کی کمی پوری کبھی ہوگی نہیں
آنے والے آئیں گے لیکن خلا رہ جائے گا

وہ عزیز اور دوست جن کے اُٹھ جانے سے بزمِ ہستی سونی معلوم ہونے لگتی ہے اور جینے کا مزا تلخ ہو جاتا ہے اُن میں میرے لیے سید وقار عظیم بہت نمایاں طور پر شامل ہیں۔ وہ صرف ایک بہت بڑے مصنف، ایک بڑے مدیر، ایک بڑے معلم، ایک بڑے مقرر اور ایک بڑے نقاد و ادب ہی نہ تھے بلکہ شائد ان سب سے بڑھ کر ایک بہت بڑے انسان بھی تھے۔ ہر لحاظ سے ہر مفہوم میں ایک بہت بڑے شریف انسان۔

مولانا حامد علی خان

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

عظمت و استقامت کا پیکر

ڈاکٹر محمد معزالدین

پروفیسر وقار عظیم ایک جامع الصفات انسان تھے۔ ان کے ذکر سے ہی ان کی وہ دلکش، سنجیدہ اور سراپا شفقت شخصیت سامنے آتی ہے جس میں علم کا تدبر، تجربے کی پختگی، محبت اور شائستگی کا بلند معیار نظر آتا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں ملنے والوں کو ان سے قرابت کا احساس ہونے لگتا تھا۔ انگریزی کا یہ محاورہ ان پر پورے طور پر صادق آتا تھا:

To know him was to love him

پروفیسر موصوف کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب میں کالج کے ابتدائی درجوں میں تھا، ان کی کتاب افسانے کی تکنیک پر بازار میں آئی تھی۔ یہ 1942-43ء میں اس فن پر اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلی کتاب تھی اس کے بعد اور کتابیں اس مضمون پر آئیں مگر طلبہ اور اساتذہ سب ہی اس سے استفادہ کرتے تھے۔ یہ ایک نادر تصنیف تھی۔ پھر پروفیسر کلیم الدین احمد کی کتاب ''فن داستان گوئی'' بہت مقبول ہوئی اور ڈاکٹر گیان چند کی کتاب ''اردو کی نثری داستانیں'' آئی۔ اس زمانے میں پروفیسر وقار عظیم کے مسلسل مضامین اس موضوع پر شائع ہو رہے تھے۔ جن میں داستانوں سے افسانوں تک

ہمارے قدیم سرمایۂ ادب کا تفصیلی جائزہ لیا گیا تھا۔ یہ مضامین جب کتابی شکل میں یکجا ہوئے تو ان کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ ہوا۔ غرض یہ کہ اس فن پر آج بھی افسانے کی تکنیک پر ان کا مطالعہ سند کا درجہ رکھتا ہے۔

اس کے بعد ''ماہِ نو'' کے مدیر کی حیثیت سے ان کے مضامین پڑھتا رہا۔ وہ دور ''ماہِ نو'' کے ماہِ کامل بننے کا دور تھا۔ پھر معلوم ہوا کہ آپ نے صحافت کو خیرآباد کہہ کر اورینٹل کالج لاہور میں اُردو کے پروفیسر کی حیثیت سے درس و تدریس کی ذمہ داری سنبھال لی ہے اور اپنی پرانی دلچسپی کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ یہاں آکر جس تندہی، لگن، خلوص اور استقلال سے انہوں نے اپنے فرائض انجام دیئے وہ ان کے شاگردوں اور احباب کو معلوم ہے۔ ان کی اعلیٰ کارکردگی اور ادبی خدمات کا صلہ تھا کہ 'غالب پروفیسر' کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ غرض اُردو کے صاحب طرز ادیب، نقاد، خوبصورت نثر نگار اور بہترین مترجم کی حیثیت سے دنیائے ادب میں اپنا ایک مقام حاصل کرلیا۔ اقبال شناسی میں بھی ان کی کتاب ''اقبال شاعر اور فلسفی'' کافی مقبول ہوئی۔

ان کے چھوٹے بھائی اقبال عظیم بھی صاحب طرز شاعر تھے۔ ان کے مجموعہ کلام ''مضراب'' کا دیباچہ پروفیسر وقار عظیم نے تحریر فرمایا جس سے ان کے تبحرِ علمی، دیانت داری اور متوازن طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

پروفیسر وقار عظیم کو زیادہ قریب سے دیکھنے اور جاننے کا موقع 1970ء میں ڈھاکہ میں ملا۔ یہ پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایم اے (اُردو) کے طالب علموں کا زبانی امتحان (Viva Voce) لینے آئے

تھے۔ وہاں کی سیاسی فضا سخت مسموم تھی۔ بدقسمتی سے وہاں بہاری بنگالی فساد پھوٹ پڑا تھا۔ راستے مخدوش، لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ گئے تھے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید ڈھاکہ نہ جاتا مگر پروفیسر صاحب جو ڈھاکہ کی گلی کوچوں سے بھی واقف نہ تھے۔ ٹھیک وقت پر نہایت اطمینان وسکون سے شعبۂ اُردو میں موجود تھے۔ ہم لوگ یونیورسٹی کیمپس میں رہتے تھے لہٰذا ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ یہ اپنے بھائی پروفیسر اقبال عظیم کے سرکاری فلیٹ میں قیام پذیر تھے۔ وہ علاقہ زیادہ محفوظ نہ تھا۔ ان کے اس احساس ذمہ داری سے میں بہت متاثر ہوا۔ شعبۂ اُردو کے اساتذہ نے بھی حیرانی کا اظہار کیا اور کہا کہ اس حالت میں آپ کو ڈھاکہ کا سفر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ ”آخر شاگردوں کی بھی تو جان ہے۔“ حالات کچھ ایسے تھے کہ کسی کو پتہ نہ تھا کہ کل کیا ہوگا۔ مگر ان کی مستعدی، استقامت اور احساس ذمہ داری کو دیکھ کر ہمارے بھی حوصلے بڑھے۔ اب واپسی کا سوال تھا۔ سواری ندارد۔ میں نے درخواست کی کہ ادھر ہی قیام کیجیے۔ مگر یہ نہ مانے۔ میں ڈرتے ڈرتے اپنی گاڑی نکال لایا۔ یہ ہمارے مہمان تھے۔ ان کی حفاظت ہمارا فرض تھا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ کار میں خاموشی سے بیٹھے رہیں اگر خدانخواستہ کسی جانب سے حملہ ہوا تو میں بجائے اُردو کے بنگلہ زبان میں بات کرنے کی کوشش کروں گا، اللہ کے فضل سے محفوظ پہنچ گئے۔ فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ دوسرے روز بھی ان کو لانے کا پروگرام تھا۔ جیسے ہی میں نے دستک دی۔ دیکھا کہ یہ تیار بیٹھے تھے۔ مجھے ایک منٹ بھی انتظار نہ کرنا پڑا۔ چہرے سے کسی قسم کی گھبراہٹ یا خوف کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ اطمینان سے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں

خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔ شعبے میں آ کر طلبہ کا انتظار کرتے رہے۔ جو طالب علم پہلے دن نہ آ سکے تھے وہ ڈرتے ڈرتے آ گئے تھے۔ امتحان کے بعد طلبہ کا حوصلہ بڑھانے کے لئے مختصر سی تقریر بھی کی۔ ایک ایک لفظ سے خود اعتمادی مترشح تھی۔ اللہ پر بھروسا اور نا مساعد حالات سے مقابلہ کرنے کی تلقین کی جیسے کہہ رہے ہوں کہ:

اگر خواہی حیات اندر خطر زی (اقبال)

حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ دوسرے دن بھی پانچ بجے شام سے کرفیو لگنا تھا۔ میں انہیں اپنی گاڑی میں وقت سے کچھ پہلے ائرپورٹ چھوڑ آیا۔ رخصت ہوتے ہوئے جس شفقت اور تشکر سے گلے ملے اس کا لمس میں اب بھی محسوس کرتا ہوں۔ ان سے ملنے کا یہ رسمی موقع خلوص و یگانگت میں بدل چکا تھا۔ اس وقت ہم سب بے حد سراسیمہ تھے۔ پتہ نہ تھا کہ آگے ہماری منزل کہاں تھی۔ قوم کا کیا بنے گا۔ ہماری زبان، ہماری ثقافت اور پاکستان کا کیا بنے گا۔ رخصت ہوتے وقت اتنا یاد ہے کہ یہ کہہ رہے تھے، حوصلہ رکھئے، آزمائش اور ابتلا کا دور گزر جاتا ہے۔ اس کے بعد مشرقی پاکستان پر جو قیامت ٹوٹی اور جس شکست و ریخت سے ہم گزرے وہ ایک الگ خونچکاں داستان ہے۔ ان آنکھوں نے کیسی کیسی سازشیں دیکھیں۔ قتل و خون دیکھے اور سرکوبی کے مناظر دیکھے اور بالآخر:

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

تاریخ کا ایک باب ختم ہوتا ہے تو دوسرا باب شروع ہوتا ہے۔ شب تار کے سینے سے صبح صادق طلوع ہوتی ہے۔ ہماری قومی تاریخ نے بھی پلٹا کھایا۔ اب ہم نئے راستے پر گامزن تھے۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد ستم ہائے روزگار سے مقابلہ

کرتے ہوئے مصائب و آلام کے دور سے گزرتے ہوئے کراچی میں پناہ لی۔ اس دوران میں لاہور جانا ہوا تو پروفیسر وقار عظیم سے ملنے ان کے گھر گیا۔ بڑی گرمجوشی سے ملے، اپنی پُر امید باتوں سے دلجوئی کرتے رہے اور تسلی دیتے رہے۔ اس سے چند ماہ پہلے جب میں لاہور گیا تھا تو مزارِ اقبال پر فاتحہ پڑھنے گیا۔ ہاتھ اُٹھتے ہی سارے جسم میں رعشہ سا پیدا ہوا اور ایسا محسوس ہوا کہ میں جس عظیم ہستی کے سامنے کھڑا ہوں وہ مجھے دیکھ رہی ہے۔ دل کی عجیب کیفیت ہوئی۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ کلام اقبال سے دل کی سرشاری کا احساس تو تھا ہی روح میں سما جانے والی اس آسودۂ خاک شخصیت کا کرشمہ بھی دیکھا۔

تھوڑے ہی عرصے کے بعد مجھے بفضلہ تعالیٰ علامہ اقبال کے کلام و پیغام کی ترویج و اشاعت کا سنہری موقع نصیب ہوا۔ میں اقبال اکادمی، کراچی سے بطور ڈائرکٹر منسلک ہو گیا۔ اس ادارے سے وابستہ ہوتے ہی پروفیسر وقار عظیم سے قربت کا موقع حاصل ہو گیا۔ اقبال اکادمی کے خازن ڈاکٹر نذیر احمد کا یکا یک حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس جگہ پر پروفیسر وقار عظیم کو خازن مقرر کر دیا گیا۔ ادارہ کراچی میں اور وہ لاہور میں۔ کئی بار مجلس منتظمہ کی میٹنگ میں شرکت کے لئے آئے۔ اس وقت ان کی معارف پروری، رواداری، عنایت و شفقت کے جوہر سامنے آئے۔ فیصلے دوٹوک، بات کھری، مشورے صائب، صاف ذہن، صاف قلب اور روشن دماغ کے مالک تھے۔

حکومت پاکستان نے تقریباً دو سال کے بعد علامہ اقبال کے صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر اقبال اکادمی کو کراچی سے لاہور منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس منتقلی میں کئی دشوار منزلیں آئیں مگر پروفیسر صاحب کے مفید اور صائب مشوروں اور ان کی عملی کوششوں سے یہ تمام مراحل خوش اسلوبی سے انجام پا گئے اور اکادمی مستقلاً لاہور منتقل ہو گئی۔ پروفیسر صاحب سے اکثر ملاقاتیں ہوتیں تقریباً ہر روز ٹیلیفون پر باتیں ہوتیں۔ میں وقت بے وقت اکادمی کے سلسلے میں انہیں زحمت دیتا۔ کبھی بے وقت فون پر میں معذرت کرتا تو وہ اس طرح نرمی اور خندہ پیشانی سے جواب دیتے: ''میں ہر وقت تیار ہوں، آخر ذاتی کام تو نہیں۔'' میں ان کے اخلاق اور مستعدی سے حیران ہوتا کہ اس قدر لکھنے پڑھنے میں مصروف رہنے اور کمزور صحت کے باوجود وہ ہمہ وقت مستعد و معاون ہوتے۔ جب کبھی حاضر ہوتا مسکراتا چہرہ سامنے آتا۔ تبحر علمی، ادبی اور ادارے کی ترقی کے متعلق گفتگو کے سوا اور کوئی موضوع نہ ہوتا۔ نہ کبھی کوئی شکایت نہ کسی کا گلہ، دراصل وہ سب پر مہربان تھے اور اسی لئے زمانہ ان کا قدردان تھا۔ میں جب لاہور آیا تو تنہا آیا پھر چند دنوں کے بعد صرف میرا چھوٹا بیٹا میرے پاس آیا۔ دو عیدیں آئیں، اصرار کر کے مجھے اور میرے لڑکے کو گھر بلوا لیا۔ نماز ادا کرنے کے بعد ملنے جلنے کا سلسلہ رہا۔ پھر دسترخوان بچھا اور مجھے اور میرے بچے کو گھر سے دوری کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ وہ اکثر گھر بھی ٹیلیفون کر کے خیریت دریافت کرتے۔ آدمی جب قریب ہوتا ہے تو احساس نہیں ہوتا اگر بچھڑ جاتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ کیا کچھ کھو دیا۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

جیسے کہا جاتا ہے کہ آدمی اگر کسی کے ساتھ سفر کرے تو اس کو اس کے اخلاق و عادات کے مطالعے کا موقع ملتا ہے، مجھے دو تین بار ان کے ساتھ اسلام آباد

تک ہوائی سفر کا موقع ملا۔ ایک بار صوفی تبسم صاحب بھی ساتھ تھے۔ اتفاق سے ہوائی سفر میں موسم کی خرابی سے سخت تکلیف ہوئی۔ میں نڈھال ہو گیا۔ میرے برابر پروفیسر صاحب تشریف فرما تھے۔ جہاز ہچکولے کھاتا رہا، ہم زندگی اور موت کے درمیان جھولتے رہے، مگر ان کے چہرے پر ایسا سکون و اطمینان تھا کہ جیسے منزل سامنے ہے۔ گھبرانا کیسا۔ بعد از خرابی بسیار جہاز اپنے مستقر پر اُترا تو میں نے معذرت کی کہ مجھے افسوس ہے کہ میں برداشت نہ کر سکا، طبیعت مالش کرتی رہی اور الٹی ہو گئی۔ یقیناً آپ کو تکلیف ہوئی ہو گی۔ کہنے لگے: نہیں، مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی زیادہ مدد نہ کر سکا۔ (وہ ہمیشہ آپ سے مخاطب کرتے)۔ ایک بار ٹرین کے سفر میں ہماری نشست دور تھی۔ صوفی صاحب اور یہ برابر بیٹھے تھے۔ بار بار اُٹھ کر کبھی ہمارے پاس آتے کبھی کسی اور مسافر کے پاس اور کہتے کہ میں آپ کو اپنے برابر کی سیٹ دلوانا چاہتا ہوں۔ آخر جب ایک صاحب اس پر آمادہ ہو گئے کہ وہ اپنی نشست بدل لیں تو ان کو قرار آیا۔ میں اس قدر شرمندہ ہوا کہ میری خاطر ان کو زحمت ہوئی۔ مگر ان کی خوشی قابل دید تھی، جیسے بہت بڑا مرحلہ طے ہو گیا۔

کسی کی شخصیت کا اندازہ انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہوتا ہے۔ کتنی عظیم شخصیت تھی پروفیسر وقار عظیم کی۔ وقار عظیم سراپا اسم بامسمّیٰ تھے۔ شاید ہی کسی نام کے ساتھ یہ جملہ اوصاف ایک جگہ مجتمع ہوئے ہوں۔

انتقال سے چند روز بیشتر دو ملاقاتیں رہیں۔ ایک بار گھر پر دوسری بار ہسپتال میں۔ یوم اقبال کی مصروفیت کے سبب مجھ کو مزاج پرسی کا زیادہ موقع نہ مل سکا، تقریب سے دو روز پہلے اکادمی تشریف لائے۔ انتظامات کے مکمل ہونے پر

CS CamScanner

اطمینان کا سانس لیا اور کہنے لگے میں کل ملتان جا رہا ہوں، انشاءاللہ پرسوں ملاقات ہوگی۔ یوم اقبال کی تقریب پر تشریف نہ لائے تو تشویش ہوئی۔ گھر پر جا کر مزاج پرسی کی تو مضمحل پایا۔ تاہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اور کہا کہ کل عکس ریز (x-rays) کے لئے جانا ہے۔ اصرار کر کے کھانے کے لئے روک لیا۔ دوسرے روز صوبائی اسمبلی میں دفتر گئے۔ دفتری زبان اُردو کے لئے اصطلاحات سازی کا کام ہو رہا تھا۔ جس کا ایک ممبر میں بھی تھا۔ تیسرے دن فون کیا تو پتہ چلا کہ ہسپتال میں ہیں۔ شام کو عیادت کے لئے گیا۔ گلوکوز چڑھایا جا رہا تھا، اسی سنجیدہ مسکراہٹ اور گرمجوشی سے پیش آئے۔ کہنے لگے کہ یرقان ہو گیا ہے، ٹھیک ہو جاؤں گا۔ جب چلنے لگا تو پوچھا: آج کل دستخط کے لئے چیک یا فائل نہیں بھیجتے۔ میں نے کہا آپ کی صحت ٹھیک ہو جائے تو بھیجوں گا۔ بولے نہیں کاغذات بھیج دیں۔ میں تو امتحان کی کاپیاں اور اقبال پر کتابیں یہیں منگوا رہا ہوں۔ میں ان کی ہمت اور کام کی ذمہ داری کا قائل تو تھا ہی اور بھی متاثر ہوا۔ اللہ رے فرض شناسی! بیمار ہو کر بھی آج کے کام کو وہ کل پر نہ ٹالتے۔ کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد، مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنا بیشتر کام نپٹا گئے۔ یہ دوسروں کے لئے درس ہے کہ دیکھو کام اس طرح کرتے ہیں۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ ڈاکٹروں نے مایوسی کا اظہار کیا ہے اور خون کی ضرورت ہے۔ ہم (میں اور میری بیگم) ہسپتال پہنچے۔ لوگوں کا ہجوم تھا۔ چھوٹے بڑے قطار میں کھڑے تھے اور ہر شخص کی خواہش تھی کہ پہلے اس کا خون لیا جائے۔ آخر ڈاکٹرز کو ان لوگوں کے پتے اور ٹیلی فون نمبر لے کر معذرت کرنا پڑی کہ جب ضرورت ہوگی تو بلا لیا جائے گا۔ یہ تھی پروفیسر وقار عظیم کی مقبولیت اور

ہر دل عزیزی۔ ایک انسان کی اصلی کمائی، لوگ انہیں اپنا خون دے کر زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ انسانیت اور شرافت کے اعلیٰ اقدار کے نمونے کو زندگی بخشنا چاہتے تھے۔ مگر وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

وہ ہم میں نہیں، بے شمار ادبی اور ثقافتی ادارے ان کی سرپرستی سے محروم ہوگئے۔ ٹی وی ان کے پُروقار چہرے سے محروم، ریڈیو ان کی آواز کی گونج کا منتظر، مگر وہ خلوص، علم اور انسانیت کا جو چراغ روشن کر گئے ہیں وہ جلتا رہے گا۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

* * *

> ''یوں تو زندگی میں اُونچ نیچ آتی رہتی ہے کوئی ایسا آدمی نہیں جسے اس طرح کے مدوجزر سے سابقہ نہ پڑا ہو لیکن وقار عظیم صاحب میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ کبھی غصے میں نہیں آتے تھے کبھی تلخ اور تند بات نہیں کہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے بڑے بڑے مخالفین بھی ان سے مفاہمت ضرور کر لیتے تھے اور اس میں، میں سمجھتا ہوں کہ ان کے کردار کا ان کے خلوص کا اور ان کے انسانی پہلو کا دخل تھا اور وہ چیز بہت کم لوگوں میں ملے گی۔''
>
> ڈاکٹر وحید قریشی

* * *

میرا دوست

اثر صہبائی

حق نے بخشا ہے تجھ کو قلب سلیم
تیری خو ہے کہ موج بادِ نسیم

دوستوں میں عزیز تر ہے مجھے
جس کو کہتے ہیں سب وقار عظیم

ہے ابھی مستیِ خرام نسیم
ہے ابھی باغ زندگی میں شمیم

علم و حلم و مروت و ایثار
ہے یہی تیری زندگی کا سنگار

دیکھنے میں تو ناتواں ہے مگر
تیری ہمت ہے روکش کہسار

شستہ دل، شستہ روح، طبع سلیم
دردِ انسانیت سے قلب دونیم

سب حبیبوں میں سب ادیبوں میں
مجھ کو محبوب ہے وقار عظیم

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

مشفقِ من

پروفیسر خواجہ محمد سعید

اورینٹل کالج کے اساتذہ میں سید وقار عظیم ہر اعتبار سے سب سے نمایاں تھے۔ جب میں نے وہاں پڑھانا شروع کیا اور وقار صاحب کو دیکھا تو پہلی نظر میں ہی اُن کی شخصیت سے اتنا مرعوب ہوا کہ اُن کے سامنے بات کرنے کی جرأت ہی نہ ہوئی۔ ایک عرصے تک یہ کیفیت تھی کہ اُن کی مجلس میں بات کرتے ہوئے میں ہمیشہ کم سے کم زبان کھولتا۔ یہی خیال ہوتا کہ زبان و بیان کی کوئی غلطی نہ ہو جائے، کسی لفظ کے تلفظ یا ادائیگی میں کوتاہی نہ ہو جائے۔ یہ خیال کر کے عافیت اسی میں سمجھتا کہ جس مجلس میں سید وقار عظیم موجود ہوں سب سے بہتر یہی ہے کہ خاموش رہا جائے۔ آہستہ آہستہ جب اُنہیں ذرا قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ نہایت خلیق، منکسر المزاج اور سراپا شفقت ہیں۔ چنانچہ میں اُن سے قریب ہوتا گیا اور وہ اس قدر شفقت فرمانے لگے کہ مجھے یوں محسوس ہوتا کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں مجھ سے امتیاز برتتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر ایک پر اسی طرح شفقت فرماتے اور میری طرح بہت سے لوگ یہ سمجھتے کہ وقار صاحب کا اُن کے ساتھ سلوک خاص طور پر مشفقانہ ہے۔ نیاز مند تو میں ہمیشہ سے تھا ہی اب اُن کے معتقدین میں شمار ہونے لگا۔ میری ذاتی رائے میں اُردو ادب میں اُن کے پائے کے ادیب اور نقاد تو اور بھی مل جائیں گے لیکن اُن جیسا شریف النفس انسان اور کوئی نہ مل سکے گا۔ آہستہ آہستہ اُن

کی محبت اور شفقت سے جرأت پا کر میں اُن کی مجلس میں آزادانہ گفتگو کرنے لگا۔ یہ نہیں کہ میں اُردو زبان میں کامل ہو گیا تھا۔ زبان و بیان کی غلطیاں اور بالخصوص تلفظ کی غلطی کہیں نہ کہیں ہو ہی جاتی لیکن وہ ایسے سلیقے سے غلطی کی نشاندہی کرتے کہ یہ محسوس بھی نہ ہونے دیتے کہ اُنہوں نے میری اصلاح فرما دی ہے۔ مثلاً اگر میں نے لفظ، غلط تلفظ کے ساتھ ادا کیا تو وہ نہایت سلیقے سے وہی لفظ اپنی گفتگو میں صحیح تلفظ کے ساتھ استعمال کرتے اور مجھے معلوم ہو جاتا کہ صحیح تلفظ وہ ہے جیسے وقار صاحب نے ادا کیا ہے۔ جب ذرا اور قریب ہوا تو میں خود ہی اپنی زبان و بیان کی مشکلات اُن سے حل کروا لیتا کیونکہ میں جانتا تھا کہ

مستند ہے ان کا فرمایا ہوا

وہ اتنے سلیقہ مند اور مہذب تھے کہ یہ احساس بھی نہ ہونے دیتے کہ میرا تلفظ خاصا اصلاح طلب ہے۔ ایک روز فرمانے لگے کہ تلفظ کا معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے خاص طور پر عربی کے وہ الفاظ جو اُردو میں کم استعمال ہوتے ہیں اُن کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ فرمانے لگے کہ میں تو ہمیشہ لغت کا سہارا لیتا ہوں۔ مزید فرمایا کہ ایک روز کسی مجلس میں مرزا منور کو ایک لفظ جس طرح ادا کرتے سنا میں اُس طرح ادا نہیں کرتا تھا دل میں سوچا کہ مرزا منور عربی کے فاضل ہیں یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اُن کا تلفظ غلط ہو یقیناً میرا تلفظ ہی غلط ہو گا۔ گھر آ کر پہلا کام یہ کیا کہ لغت نکالی کہ صحیح تلفظ معلوم ہو سکے۔ پتہ چلا کہ یہ لفظ دونوں طرح پڑھا اور لکھا جاتا ہے۔ بتانا یہ مقصود تھا کہ اگر کبھی تلفظ کے بارے میں شک میں پڑ جاؤ تو ایسی کوئی بات نہیں۔ عمر بھر کی ریاضت کے بعد بھی تلفظ کے بارے میں انسان یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اور اپنے اطمینان کے لئے بالآخر لغت کا سہارا ہی لینا پڑتا ہے۔

اورینٹل کالج میں طلبہ و طالبات کے خلوص اور احترام کو میں نے ہمیشہ قدر کی نگاہ

سے دیکھا ہے اور اپنی طویل زندگی کے وہ چند سال جو اورینٹل کالج میں ایم۔ اے کی تدریس میں گزرے مجھے ہمیشہ بہت عزیز رہے ہیں اُن کی یاد بھی میرے لئے ایک تازہ ہوا کا جھونکا محسوس ہوتی ہے۔ لیکن بعض لوگوں کی تنگ نظری اور احساس کمتری کی تلخ یادوں کے ساتھ وقار صاحب کی شیریں یاد سب تلخیوں پر حاوی آ جاتی ہے۔ اُن کی محبت اور شفقت کو یاد کر کے میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں اورینٹل کالج سے وابستہ نہ ہوتا تو زندگی کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم رہ جاتا۔ ادبی مرتبہ میں تو وہ سب سے نمایاں تھے ہی، شخصی خوبیوں میں بھی اورینٹل کالج کیا، کہیں بھی وہ اپنی سادگی شرافت، منکسر المزاجی اور سراپا تہذیب ہونے میں نمایاں تھے۔ تاہم اُن کی وضع داری اُن سب خوبیوں میں بھی نمایاں تر تھی۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال ملاحظہ ہو:

جب میں سرگودھا بورڈ میں پہنچا تو میرے چیئرمین ڈاکٹر حمید الدین بہت سے معاملات مجھ پر چھوڑ دیتے تھے۔ ان میں سے ایک اُردو کی کمیٹی آف کورسز کے کنوینر کا انتخاب تھا۔ اس سے پہلے وقار صاحب لاہور بورڈ کے کنوینر تھے۔ لاہور بورڈ تین حصوں میں بٹ گیا۔ ملتان والوں نے پہل کی اور وقار صاحب نے وہاں کا کنوینر بننا قبول کر لیا۔ جب سرگودھا والوں کو کنوینر کی ضرورت پیش آئی تو وقار صاحب اس سے پہلے دو بورڈوں کے کنوینر مقرر ہو چکے تھے۔ بورڈ کے چیئرمین ڈاکٹر حمید الدین صاحب نے مجھ سے مشورہ طلب کیا تو میرے ذہن میں صرف ایک نام ہی آتا تھا اور وہ وقار صاحب کا تھا۔ ڈاکٹر حمید الدین اس انتخاب پر خوش تو بہت ہوئے لیکن پوچھنے لگے کہ وہ مان جائیں گے؟ میں نے عرض کیا کہ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ چنانچہ یہ کام میرے ہی سپرد ہوا۔ میں وقار صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ہر طرح کے عذر کے لئے پیش بندی کر لی۔ مصروفیت اور سفر کی صعوبت دو ہی عذر وہ پیش کر سکتے تھے۔ مصروفیت کا توڑ میں نے پیش کیا کہ میٹنگ کی

صدارت کے لئے آپ کی سرگودھا میں موجودگی ضروری ہوگی ہم یہ اہتمام کر سکتے ہیں کہ میٹنگ کی تاریخ مقرر کرنے سے پہلے آپ سے مشورہ کرلیا جائے اور وہی تاریخ مقرر ہو جب آپ باآسانی سرگودھا تشریف لاسکیں۔ آپ جب بھی تشریف لائیں گے میں خود گاڑی لے کر ریلوے سٹیشن پر حاضر ہوں گا۔ اگر رات کا قیام ضروری ہوا تو آپ میرے غریب خانے پر قیام فرمائیں گے آپ کا قیام وطعام میرے ذمہ ہوگا۔ ہم ایک دن سے زیادہ وقت نہیں لیں گے اور جب آپ واپس تشریف لے جانا چاہیں تو میں خود آپ کو ریلوے سٹیشن پر پہنچا دوں گا۔ سن کر فرمانے لگے کہ اتنی رعایتوں کے بعد انکار کی گنجائش کہاں رہتی ہے۔ کئی سال تک یہی انتظام چلتا رہا۔ جب بھی اُن کے کسی شاگرد یا معتقد نے اپنے یہاں قیام کے لیے درخواست کی تو فرمانے لگے کہ بھئی مجھے جو آرام یہاں میسر ہے اور کہیں نہیں مل سکتا۔ آرام تو خیر کیا ملتا لیکن مجھے یقین ہے کہ اتنی محبت اُنہیں اور کہیں نہیں مل سکتی تھی کیونکہ میرے ساتھ میری بیوی بھی اُن کے عقیدتمندوں میں سے تھی۔ میٹنگ سیکشن اگرچہ میرے ماتحت نہیں تھا میں نے ہدایت دے رکھی تھی کہ جب بھی اس میٹنگ کی تاریخ مقرر کرنے کا وقت آئے تو مجھ سے مشورہ کرلیا جائے تاکہ وقار صاحب سے پوچھ کر میٹنگ کی تاریخ مقرر کی جائے۔

ایک مرتبہ یوں ہوا کہ میں بیمار ہوگیا۔ اور زندگی میں پہلی دفعہ طویل رخصت کی ضرورت پیش آئی۔ اتفاق سے اُنہیں دنوں مختلف مضامین کے لیے اجلاس بلانے کی تاریخیں مقرر ہو رہی تھیں میرا اور وقار صاحب کا معاہدہ خاصا پرانا ہوگیا تھا۔ میری طرف سے ابھی تک کوتاہی نہیں ہوئی تھی۔ رخصت پر ہونے کی وجہ سے اجلاس بلانے والوں نے مجھ سے رابطہ ضروری نہ سمجھا اور وقار صاحب کو مقررہ تاریخ پر تشریف آوری کی اطلاع دے دی۔ وقار صاحب مقررہ تاریخ پر پہنچ گئے۔ مجھے یونہی گھر پر لیٹے لیٹے یاد آیا کہ ان دنوں

مختلف مضامین کے لئے اجلاس بلائے جاتے ہیں خدا جانے اُردو کا اجلاس کب ہوگا۔ میں نے بورڈ کے متعلقہ افسر سے پوچھا کہ اُردو کے لئے اجلاس کب بلایا جائے گا۔ کہنے لگے وہ تو ہو رہا ہے میں نے پوچھا کہ صدارت کون کر رہے ہیں جواب ملا کہ وقار صاحب۔ میں سخت شرمندہ ہوا کہ میں نے اس سے پہلے کیوں نہ دریافت کر لیا خیر میں نے اُنہیں کہا کہ میرا اسلام کہنے کے بعد اُنہیں صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے بتائیں کہ علالت اور طویل رخصت کی وجہ سے مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ اُردو کا اجلاس کب ہوگا۔ ورنہ میں خود اُن سے رابطہ قائم کر لیتا۔ وقار صاحب کو میری علالت کا سن کر افسوس ہوا اور فرمانے لگے کہ مجھے خواجہ صاحب کی بیماری کا علم نہیں تھا اب تو اُن کی عیادت کے لئے مجھے خود جانا ہوگا۔ میں نے بورڈ والوں سے کہہ کر ان کے لئے گاڑی کا بندوبست کر دیا۔ وہ میری عیادت کے لئے تشریف لائے باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ وقار صاحب توقع تو رکھتے تھے کہ میری طرف سے اُنہیں اجلاس کی تاریخ کی اطلاع مل جائے گی لیکن اب جو سرکاری طور پر اُنہیں اطلاع ملی تو اجلاس کے لئے اُنہیں آنا تو تھا ہی بجائے اس کے کہ وہ مجھ سے رابطہ قائم کرتے وہ لاہور سے فیصل آباد پہنچے وہاں کسی دوست کے یہاں رات کو قیام کیا اور صبح سویرے سرگودھا کے لئے چل پڑے اور یہ تردد محض اس لئے کیا کہ وقت پر اجلاس کی صدارت کر سکیں۔ اب شرمندگی کے باعث میں یہ بھی نہ کہہ سکا کہ اگر آپ مجھ سے رابطہ قائم کر لیتے تو اس تردد سے بچا جا سکتا تھا۔ میری دلجوئی کے لئے فرمانے لگے کہ جن دوست کے پاس اُن کا قیام تھا وہ عرصے سے آنے کے لئے کہہ رہے تھے میں نے سوچا کہ آپ کی کوئی مجبوری ہوگی جو مجھے بروقت اطلاع نہیں دے سکے۔ موقع کو غنیمت سمجھا۔ اُن کی فرمائش بھی پوری ہو گئی اور بروقت اجلاس میں بھی شریک ہو گیا۔ اب ایسے وضع دار لوگ کہاں ملتے ہیں۔

CS CamScanner

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

قلب کی تالیف ہوگئی

صابر لودھی

پروفیسر سید وقار عظیم میرے اُستاد تھے، ان کے بارے میں لکھنے بیٹھا ہوں تو فرخی کا وہ شعر یاد آ رہا ہے جو انہوں نے فردوسی کی عظمت کے اعتراف میں کہا تھا:

او نہ اُستاد بُود و ما شاگرد
او خداوند بُود و ما بندہ

جب عقیدت کا یہ عالم ہو تو سید وقار عظیم کی شخصیت کا کوئی کمزور پہلو تو میرے تصور میں نہیں آ سکتا۔ ویسے بھی شاگرد اور عقیدت مند ہونے کے ناطے میں اُن سے جب بھی ملا جلوت میں ملا، خلوت کی بے تکلفی میرے مقدر میں نہ تھی، اس لیے اُن کی کمزوریوں کے تذکرے سے میری تحریر خالی ہوگی اور قارئین کو لطف نہیں آئے گا کہ اب ہم نے محاسن بیان کرنا چھوڑ دیے ہیں اور حماقتوں کی داستان سے لطف لینا شروع کر دیا ہے۔

سید وقار عظیم سے میرا تعارف 1954ء میں ہوا جب میں نے ایمرسن کالج ملتان سے بی اے کرنے کے بعد ایم اے (اُردو) میں داخلہ لیا۔ اُس وقت تک میں اُن کے مضامین ادبی رسائل میں پڑھ چکا تھا اور اُن کی دلنشیں شخصیت کے بارے میں تحسینی کلمات اپنے استاد پروفیسر ملک بشیر الرحمان کی زبانی سُن چکا تھا اس لئے جب سید صاحب فکشن کا پرچہ پڑھانے پہلی بار ہماری کلاس میں آئے تو میں

CS CamScanner

کچھ بھی نہ سُن سکا۔ بس اُنہیں دیکھتا رہا۔ اُن کے سراپا کا جائزہ لیتا رہا۔ سماعت بھی بصارت کا حصہ بن گئی۔ صاف ستھری نازک سی شخصیت، لمبا قد، تنگ پائچوں کا کھڑا پاجامہ، گہرے براؤن رنگ کی اچکن، گلے تک تمام بٹن لگے ہوئے، گلے میں ہلکے براؤن رنگ کا مفلر۔ بڑے اور خوبصورت سر پر پیچھے کی طرف جمائے ہوئے گنگا جمنی بال جو مانگ کا تصور دلاتے تھے، مانگ نہیں بناتے تھے۔ پاؤں میں کٹیش نما قصوری جوتی۔ وہ دھیرے دھیرے تسلسل کے ساتھ بولتے رہے اور میں مسرت کے عالم میں انھیں دیکھتا رہا۔ بقول عدم:

اُن سے ملے تو قلب کی تالیف ہوگئی
پھر درس و تدریس کا سلسلہ چل نکلا۔

سیّد وقار عظیم کے علاوہ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور ڈاکٹر عبادت بریلوی ہمارے ہمہ وقت اُستاد تھے، پروفیسر علم الدین سالک اسلامیہ کالج سے، پروفیسر عاشق محمد غوری دیال سنگھ کالج سے اور پروفیسر قیوم نظر گورنمنٹ کالج سے ہفتے میں ایک ایک بار یا زیادہ سے زیادہ دو دو بار ہمیں پڑھانے آتے تھے۔ یہ تمام نامور اُستاد باقاعدگی اور محنت سے پڑھاتے۔ ہم بھی بڑے خلوص اور توجہ سے ان کے لیکچر سُنتے۔ کبھی کبھی اُکتا کر طمانیت قلب کے لیے دائیں طرف دیکھتے جہاں پردے کے پیچھے طالبات نام کی مخلوق ہوتی یا اس مخلوق کا تصور رہتا۔

گو ملے ہوا ہی سے پردہ حریم ناز
دل یہی سمجھتا ہے شوق کارفرما ہے   (عندلیب شادانی)

ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی تقریر میں اس قدر ٹھہراؤ ہوتا کہ غبی سے غبی طالب علم

بھی ان کی پوری تقریر نقل کر لیتا (ہمارے بعد آنے والے ان کے ایک سعادت مند شاگرد ممتاز منگلوری نے ان کے تمام لیکچر نقل کر کے طیف غزل، طیف نثر وغیرہ کے عنوان سے چھپوا دیے اور اُنہیں نئے لیکچر تیار کرنے پر مجبور کر دیا) ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی لسانیات اور اقبالیات پر لیکچر دیتے لیکن طلباء و طالبات سے بے نیاز ہو کر وہ اپنے سامنے والی دیوار کے کسی جالے یا دھبے پر نظریں گاڑ دیتے اور شروع ہو جاتے جیسے آج کل ٹی وی کے نیوز کاسٹر شروع ہو جاتے ہیں۔ لیث صاحب کو اپنے نوٹس کے ورق الٹنے کی ضرورت بھی پیش نہ آتی۔ یوں لگتا جیسے وہ ایک ایک جملہ حفظ کر کے آئے ہوں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی تنقید پڑھاتے۔ خوبصورت گفتگو کرتے ''تخلیقی رویہ'' اور ''جمالیاتی اسلوب'' کی تراکیب بار بار اُن کی تقریر میں داخل ہوتیں۔ وہ اپنے موضوع کا اعادہ دوسرے تیسرے دن پھر کرتے اور ہمیں یہ سہولت رہتی کہ ہم جب چاہتے اور جہاں سے چاہتے ان کے لیکچر کا سرا پکڑ لیتے۔ پروفیسر علم الدین سالک ادب کا حصہ پڑھاتے۔ انھیں اپنے موضوع پر پوری قدرت حاصل تھی مگر وہ اخلاقیات کا درس دینے لگتے۔ وہ طالبات کی طرف مطلقاً متوجہ نہ ہوتے۔ وہ اپنی کرسی کا زاویہ اس طرح رکھتے کہ وہ ان کا سائیڈ پوز ہی دیکھ سکتیں۔ اگر کوئی طالبہ سوال پوچھ کر یا چوڑیاں چھنکا کر اپنے وہاں ہونے کا احساس دلاتی تو سالک صاحب کے لیکچر میں اچانک عصمت چغتائی کا ذکر آجاتا۔

''اور یہ ہے کہ میں عصمت چغتائی کو سری نگر میں ملا تھا۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ بی بی کیا لکھتی ہو؟ گھر میں بیٹھو اور .... یہ ہے کہ بیہودہ کہانیاں نہ لکھو اور یہ ہے کہ بی بی شرما کے رہ گئی۔''

CS CamScanner

''اور یہ ہے کہ'' ان کا تکیہ کلام تھا۔ پڑھاتے پڑھاتے انہیں جلال آ جاتا اور وہ کہتے'' حافظ شیرازی نے بھی دُکھ کا اظہار کیا ہے:

دختراں را ہمہ جنگ است و جدل با مادر

وہ یہ ہے کہ .... میں تو دو اُنگل کا استعفیٰ جیب میں رکھتا ہوں۔ منہ پہ دے مارتا ہوں....''

سالک صاحب کی باتوں سے ہمارا دل بہل جاتا۔ دن بھر کی کدورت دُور ہو جاتی اور یہ ہے کہ ہمیں طبقہ ءذکور میں شامل ہونے پر فخر ہونے لگتا۔

عاشق محمد غوری بنیادی طور پر شاعر تھے۔ خوبصورت پیروڈی لکھتے تھے۔ اُردو مثنوی پر لیکچر دیتے تھے مگر جلد جلال میں آ جاتے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی طرح ان میں بھی سوال کا مقابلہ کرنے کی تاب نہیں تھی۔ البتہ پروفیسر قیوم نظر کو لیکچر کی تحریک سوال سے ہوتی تھی۔ ہمارے الٹے سیدھے سوال پر وہ ایسا زوردار اور طنز آمیز لیکچر دیتے کہ کم ہمت دَم سادھ لیتے۔ اسالیب نثر پر ان کی گہری نظر تھی۔ فن افسانہ کے بیشتر نقاد پریم چند کی کہانیوں سے چل کر علی عباس حسینی کی'' میلہ گھومنی'' پر رُک گئے تھے۔ یہ قیوم نظر تھے جنہوں نے اپنے لیکچروں کے ذریعے فیاض محمود' صادق حسین' غلام الثقلین نقوی' غلام علی چوہدری اور امجد الطاف کو زندہ کیا۔

ان اساتذہ کے مقابلے میں سید وقار عظیم پڑھانے آتے تو مرعوبیت کی فضا طاری ہو جاتی۔ وہ متانت کے ساتھ اپنے لیکچر کا آغاز کرتے۔ موضوع کے مطابق فضا تیار کرتے۔ سماجی اور تہذیبی پس منظر کی تفصیل بیان کرتے اور پھر اس

پس منظر میں تخلیق پانے والے ادب پارے کا جائزہ لیتے۔ (مجھے احساس ہے سیّد صاحب مادی جدلیت کے حوالے سے سیاسی پس منظر بتانے سے گریز کرتے تھے)ان کا لیکچر ایک زنجیر کی طرح ہوتا۔ کڑی سے کڑی جڑی ہوئی۔ ایک کڑی ٹوٹ جاتی تو زنجیر دولخت ہو جاتی۔ ہمارے بعض دوست سیّد وقار عظیم کو منظر اور پس منظر کا نقاد کہتے۔ ہم پوری توجہ سے سیّد وقار عظیم صاحب کا لیکچر سُنتے اور کبھی ناغہ نہ کرتے کہ ایک دن کی غفلت تسلسل کو درہم برہم کر دیتی۔ وہ ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پڑھاتے۔ اپنے بیان کی تاثیر ہمارے چہروں پر دیکھتے اور ہمیں دائیں بائیں دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی۔ متانت کے باوجود ان کی تقریر میں شگفتگی کا عنصر بھی شامل ہوتا۔

1955ء کے آخر میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کراچی یونیورسٹی میں شعبہ اُردو کے سربراہ کی حیثیت سے تشریف لے گئے تو اقبالیات کا پرچہ بھی وقار عظیم کے حصے میں آیا۔ حضرتِ اقبال کے فکر وفن پر سیّد وقار عظیم نے ایسے جامع اور فکر انگیز لیکچر دیے کہ آج بھی ان کی تازگی کا تصور کرتا ہوں۔

سیّد وقار عظیم کو تنظیمی امور میں بڑی دسترس حاصل تھی ڈاکٹر سید عبداللہ صدر شعبہ تھے اور اورینٹل کالج کے پرنسپل بھی۔ وہ سال میں کم از کم دو بار بڑے پیمانے پر علمی اور ادبی کانفرنس منعقد کراتے۔ کالج کا یوم تاسیس خاص طور پر اہتمام سے منایا جاتا۔ کوشش کی جاتی کہ اس اجلاس میں ملک کی چند نامور ہستیاں ضرور شریک ہوں۔ سید وقار عظیم کو اس کام کا نگران مقرر کیا جاتا۔ وہ بڑی تن دہی اور خاموشی سے جلسوں کا انتظام و انصرام کرتے۔ مستعد اور زیرک طلباء و طالبات کو ان

کی صلاحیتوں کے مطابق فرائض سونپتے اور اپنے اعصاب پر دباؤ ڈالے بغیر ہر کام کمالِ حُسن سے اختتام تک پہنچاتے۔

اورینٹل کالج کی علمی و ادبی فضا پر یوں تو آغاز ہی سے میر کا غم مسلط رہا لیکن 1960ء کے عشرے تک اس کالج میں بڑے دردمند اور ملول لوگ پڑھتے رہے۔ انہیں شعر کہنے اور کہانی سنانے کا لپکا تھا۔ حادثہ کو سانحہ بنا کر وہ تزکیہ نفس کرتے۔ خاص طور پر طالبات کو المناک کہانیاں سنانے کا سلیقہ آتا تھا۔ اپنے نرم رویے کے سبب سید وقار عظیم کو یہ کہانیاں زیادہ سننا پڑتیں تاہم وہ ہر کہانی کار کو دلاسے کے چند کلمات کہہ کر مطمئن کر دیتے۔ وہ قیافے سے اندازہ لگا لیتے کہ کہانی کے پس منظر میں کون سا مقصد پوشیدہ ہے۔ ان میں قوتِ برداشت حد درجہ تھی۔ اس لیے بے سروپا باتوں کو سن کر بھی وہ اکتاہٹ کا اظہار نہ کرتے۔

یہ قوت برداشت ہی تھی جو انہیں دمے کے شدید حملوں سے بچاتی رہی۔ 1954ء کے بعد وہ دمے کے مستقل مریض بن چکے تھے۔ موسمِ سرما میں انہیں خاص طور پر دس پندرہ دن بے حد تکلیف رہتی۔ وہ بڑے حوصلے سے بیماری کا مقابلہ کرتے۔ کبھی ایلوپیتھی کا سہارا لیتے، کبھی ہومیوپیتھی کا تجربہ کرتے۔ زیادہ وقت حبیب اشعر کے یونانی طب کے کمالات دیکھتے۔ حبیب اشعر ادب کا اعلیٰ ذوق بھی رکھتے تھے۔ رسالہ ''فنون'' احمد ندیم قاسمی کے تعاون سے انہوں نے ہی جاری کیا تھا۔

میرا خیال ہے کہ حبیب اشعر کی دوائیوں سے زیادہ انکے ادبی مکالمے سید وقار عظیم کو فائدہ پہنچاتے۔ انہیں اپنی زندگی بہت عزیز تھی۔ اُس وقت اُن کے بچے انور وقار عظیم، اختر وقار عظیم، اطہر وقار عظیم اور اُن سے بھی چھوٹے دو تین بچے

اور تھے جن کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اُن پر تھی۔ وہ اُن کے لیے جان توڑ جدوجہد کرتے۔ پنجاب یونیورسٹی' پشاور یونیورسٹی' کراچی یونیورسٹی کے ایم۔ اے کی جوابات کی کاپیاں جانچتے۔ لاہور بورڈ کا پرچہ مرتب کرتے، جوابات کی کاپیاں دیکھتے، ماہِ نو اور دوسرے سرکاری رسائل میں مضامین لکھتے۔ ریڈیو کے ادبی پروگرام ترتیب دیتے۔ فی البدیہہ تقریر کرتے، لیکچر دیتے۔ چند گھنٹوں کے آرام کے سوا اُن کا تمام وقت لکھنے اور اس لکھائی سے کمانے میں گزرتا۔ اُن کا حوصلہ، اُن کا عزم، اولاد کے لیے جینے کی آرزو ہر مرض کو شکست دے دیتی۔

اپنے خاندان کی کفالت کے لیے شب و روز محنت کرنے کے باوجود وہ اپنے دوستوں اور ضرورت مندوں کے لیے وقت نکال لیتے۔ 1961ء میں میری شادی ہوئی تو سید وقار عظیم نے شام کی چائے پر ہمیں دعوت دی۔ ہم وقتِ مقررہ پر اُن کے دولت خانے (سمن آباد) پر پہنچے۔ عین اُس وقت پروفیسر صدیق کلیم بھی آن پہنچے۔ مجھے یاد ہے کہ دو گھنٹے تک سید صاحب کی بیگم ہماری خاطر مدارت کرتی رہیں اور سید صاحب کمرے کی کھڑکی کے پاس لان میں بیٹھے صدیق کلیم کی باتیں سنتے رہے۔ پروفیسر صدیق کلیم آہستہ آہستہ مگر لمبی گفتگو کرنے کے عادی تھے اور سید وقار عظیم میں طویل گفتگو سننے کا حوصلہ تھا۔ وہ تشریف لے گئے تو سید صاحب اندر آئے اور نہایت دردمندی سے معذرت چاہی۔ انہیں دُکھ تھا کہ وہ ہمیں پورا وقت نہ دے سکے۔

طلبہ کے مسائل کا سامنا بھی سید وقار عظیم کو ہی کرنا پڑتا۔ کوئی معاملہ الجھا ہوا ہوتا تو سید عبداللہ اُس معاملے کو سید وقار عظیم کے حوالے کر دیتے اور

CS CamScanner

سید وقار عظیم بطریق احسن اس معاملے کو نمٹا دیتے۔ میرے ایک گہرے دوست مرزا فضل الٰہی بیگ (اب علامہ عنصر صابری) وولنر ہاسٹل کے میس منیجر بنے تو انہوں نے دعویٰ کیا کہ وہ طلباء کو "بہترین" کھانا کھلائیں گے اور دو ہفتے میں دو کے بجائے تین بلکہ چار "فیشن" (لذیذ اور منفرد ڈش) دیں گے۔ اور "حاضری" بھی معقول نکلے گی۔ ایک ماہ تک وہ Mess کا نظام بہترین صورت میں چلاتے رہے پانچ پانچ بار فیشن .... پستے، کشمش اور بادام والا قورمہ۔ گوالمنڈی کی فیرنی، زعفرانی زردہ، مرغ روسٹ اور مرغ پلاؤ (اورینٹل کالج کی تاریخ میں ایسا مغلئی کھانا پھر کبھی تیار نہ ہو سکا) ہاسٹل کے طلباء کو یہ مینو بے حد پسند آیا۔ خوب تعریفیں ہوئیں۔ مرزا صاحب ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ اگلے مہینے کا مینو تیار کر رہے تھے کہ حاضری کا تخمینہ لگا۔ سات آنے فی حاضری کی جگہ سوا روپیہ فی حاضری خرچ نکلا۔ کالج میں کہرام بپا ہو گیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے سید وقار عظیم کو منصف مقرر کر دیا۔ انہوں نے فوراً عدالت سجائی۔ پیشیاں ہوئیں، گواہ بلائے گئے۔ سودے کے بل دیکھے گئے۔ بڑے دلچسپ مکالمے بولے گئے:

"آپ ہاسٹل میں رہتے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"میس میں کھانا کھاتے ہیں"

"جی ہاں۔"

"کھانا کیسا ملتا ہے؟"

"بہت اچھا۔"

''زردہ' فرنی' مرغ وغیرہ کھاتے رہے ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''تو پھر حاضری کے زیادہ ہونے کی شکایت کیوں؟''

''جناب! چھوٹی الائچی کا خرچ بہت دکھایا گیا ہے۔ آدھ سیر چھوٹی الائچی مہینہ بھر استعمال ہوئی۔ قیمت سوا سو روپے لکھی گئی ہے حالانکہ یہ الائچی پندرہ سے بیس روپے میں مل جاتی ہے۔''

سید وقار عظیم نے اپنی جیب سے بیس روپے نکالے اور طالب علم کے حوالے کیے۔

''بھئی میرے لیے اسی بھاؤ سے آدھ سیر سبز الائچی لا دینا۔''

اس نوع کی شگفتہ بحث کے بعد سید صاحب نے معاملہ سلجھا دیا.... طلباء کو احساس دلایا کہ جب کھانا اچھا ملتا تھا اُس وقت تو آفرین کہتے تھے اور اب بوجھ پڑا ہے تو نفریں کرتے ہو۔ بہرحال حاضری پندرہ آنے مقرر ہوئی۔ کچھ سزا کھانے والوں کو اچھی اور عمدہ خوراک کھانے کی ملی اور زیادہ سزا مرزا فضل الٰہی کو اچھا کھلانے کی ملی۔ دونوں گروہ ایک ہی ماہ میں پھانک ہو کر مطمئن ہو گئے۔

سیّد صاحب کو پرانی انارکلی کی جلیبیاں بہت پسند تھیں۔ دو بجے بعد دوپہر گرم گرم جلیبیاں خرید کر جین مندر سے بس نمبر 19 پر سوار ہوتے (اس زمانے میں بس کا یہی روٹ تھا) جلیبیاں راستے میں ٹھنڈی ہو جاتیں مگر وہ خوش رہتے کہ بچوں کے لیے گرم گرم جلیبیاں لے جا رہے ہیں۔

سید وقار عظیم کی آمدنی کا ایک ذریعہ نصاب کی کتابیں تھیں جو انہوں نے

بڑی محنت اور توجہ سے مرتب کی تھیں۔ امتحانی پرچہ مرتب کرنے کا فن بھی اُنہیں خوب آتا تھا۔ وہ ہر سطح کے طلبہ کا ذہنی معیار اپنے پیش نظر رکھ کر پرچہ مرتب کرتے۔

سید وقار عظیم کو خدا نے پرکھنے والی آنکھ عطا کی تھی۔ وہ دو تین ملاقاتوں ہی میں ملنے والوں کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا لیتے اور پھر ان صلاحیتوں کو صیقل کرنے کی کوشش کرتے۔ جن نوجوانوں میں تحقیقی اور تنقیدی کام کرنے کی صلاحیت دیکھتے انہیں کوشش کر کے اس کام میں لگا دیتے اور جسے وہ بے چین اور مضطرب دیکھتے اُسے جلسوں کا انتظام کرنے اور رپورٹیں لکھنے پر لگا دیتے۔ انہوں نے مجھے اکثر اسی کام پر لگایا۔ اپنی ملازمت کے آخری دنوں میں انہوں نے مجھے بار بار تاکید کی کہ میں پی ایچ ڈی کرلوں۔ اُردو شعراء کے تذکروں پر موضوع بھی منظور کروایا۔ سید عابد علی عابد اور پروفیسر قیوم نظر نے میرے لیے مقالے کا خاکہ بنایا لیکن میں ان دنوں لیکچررز ایسوسی ایشن کا جنرل سیکرٹری بن کر لیڈری کے چکر میں پڑ گیا اور جو کام مجھے کرنا تھا وہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کر دکھایا۔ تذکروں پر ان کی کتاب چھپ کر آئی تو مجھے تحقیقی کام کے خلجان سے نجات ملی۔

سید وقار عظیم اتنی بے داغ اور بامحاورہ اُردو لکھتے تھے کہ ڈاکٹر عبادت بریلوی (وہ خود کہتے تھے) اپنا مقالہ اشاعت سے پہلے وقار عظیم کو ضرور دکھاتے تھے۔ لیکن جب صدر شعبہ کے لیے انتخاب کا مرحلہ آیا اور پروفیسر حمید احمد خان نے سید وقار عظیم کو صدر شعبہ بنانا چاہا تو ڈاکٹر عبادت بریلوی نے استحقاق کا مسئلہ اٹھا دیا۔ کاغذات میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا کام زیادہ اور متنوع تھا۔ سید احتشام حسین کے پاس دونوں اساتذہ کے کاموں کی تفصیل بھیجی گئی۔ سید احتشام حسین نے فیصلہ

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے حق میں کردیا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی صدر شعبہ بنے تو وائس چانسلر نے سید وقار عظیم کے احترام میں غالب پروفیسر کی چیئر قائم کرکے انہیں غالب پروفیسر بنادیا۔

اورینٹل کالج کے مزاج میں مسابقت کا جو رنگ شامل تھا .... وہ کبھی سید عبداللہ اور ابواللیث صدیقی کو مقابل لاتا تھا۔ کبھی ڈاکٹر محمد باقر اور پروفیسر وزیر الحسن عابدی کو آمنے سامنے کھڑا کرتا تھا۔ کبھی ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر محمد باقر میں تناؤ بڑھتا تھا۔ وہی رنگ پروفیسر سید وقار عظیم اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مراسم میں بھی جھلکنے لگا۔ لیکن سیّد وقار عظیم نے اپنے اعتدال پسند رویے کو بالکل نہیں بدلا۔ لہریں پیدا ہوئیں اور سمندر شانت ہوگیا۔

سیّد وقار عظیم کے اسلوبِ زندگی سے ان کے بیٹوں نے ایک سبق سیکھا کہ زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے تدریس کا پیشہ مناسب نہیں ہے۔ اُنہوں نے سیّد وقار عظیم کو ہمہ وقت کام کرتے دیکھا تھا۔ اُن کے شعور میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اتنی محنت اگر کسی دوسرے پیشے میں کی جائے تو شہرت جلد مل جاتی ہے اور مالی دشواری کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑتا۔ اس لیے بڑے بیٹے نے بنک کی ملازمت اختیار کی۔ اختر وقار عظیم نے الیکٹرانک میڈیا میں اپنی جگہ بنائی اور دنیا بھر کی سیر کی۔ اطہر وقار عظیم نے بھی یہی راستہ اختیار کیا۔ دوسرے بچوں نے بھی نئے نئے راستے تلاش کیے۔ بابا کی روایت کسی نے بھی نہ اپنائی۔

یہاں تک لکھا تھا کہ سیّد وقار عظیم کا سفرِ آخرت یاد آ گیا۔ سمن آباد میں ایک بڑا ہجوم اداس اور مغموم کھڑا تھا۔ سیّد وقار عظیم سے پیار کرنے والوں کی تعداد

اُن سے زندگی میں ملنے والوں سے کہیں زیادہ تھی۔ جو لوگ کسی وجہ سے اُن کے قریب نہ آسکے تھے وہ بھی اُن کے جنازے میں شریک تھے اور یہی اُن کی محنت کا صلہ تھا۔

''یاد پڑتا ہے کہ میری ان سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی۔ جب وہ ''ماہِ نو'' کے مدیر تھے۔ وہ لاہور آئے تو میرے ہاں بھی تشریف لائے' کہنے لگے: ''ڈاکٹر تاثیر سے مل کر آرہا ہوں ان سے معلوم ہوا کہ آپ نے ایک نظم بعنوان ''کھلونے'' لکھی ہے۔ ''ماہِ نو'' کے لئے وہ نظم مجھے عنایت کیجئے۔''

میں نے کچھ تامل کیا کہ شاید وہ نظرِ ثانی کی محتاج ہو۔ لیکن وہ مصر ہوئے اور کہنے لگے ڈاکٹر تاثیر نظم کی تعریف کر رہے تھے اور انہوں نے ہی مجھے مشورہ دیا ہے کہ آپ سے اس نظم کو 'ماہِ نو' کے لئے حاصل کر لوں۔ آپ تردد نہ کریں۔

ان کا پر وثوق اور مدافعت شکن لہجہ میرے تامل پر غالب آیا اور میں نے نظم ان کے حوالے کر دی۔''

ڈاکٹر جسٹس ایس۔ اے رحمٰن

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

ایک پُروقار شخصیت

سجاد باقر رضوی

ہمارے چاروں طرف آوازوں کا سیلاب ہے۔ سکون اور خاموشی کے چھوٹے چھوٹے جزیرے اس سیلاب کی نذر ہوتے جارہے ہیں۔ شور خاموشی کے منطقوں کو مسخر کر رہا ہے۔ گردوپیش مقابلے اور مسابقت کی فضا ہے۔ گھن گرج رکھنے والی آوازیں دھیمی آوازوں کو نگل رہی ہیں۔ ایسے میں سید وقار عظیم کی یاد منانے کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں دھیمی آوازوں اور خاموشی کے منطقوں کی تلاش ہے۔ اور اگر آوازوں اور خاموشی کے منطقوں کی ترتیب سے موسیقی پیدا ہوتی ہے تو سید وقار عظیم زندگی کی خوش آہنگی کے علامت تھے۔

شہر کے ہنگاموں سے گزر کر یا پھر کوئی پاکستانی فلم دیکھ کر سید صاحب سے ملاقات کرنا ایسے تھا جیسے آپ بے ہنگم شور وغل کے منطقے سے نکل کر مدہم لے اور خاموشی کے منطقے میں داخل ہو گئے ہیں۔ سید وقار عظیم اپنی ذات میں ایک عالم تھے۔ اس عالم کی کیفیات دوسرے عالموں سے یکسر مختلف تھیں۔ سکون' اعتماد اور اُمید کے متلاشی' انتشار اور بے زاری کے عالم سے گھبرا کر سید صاحب کی پناہ ڈھونڈتے تھے۔ کیمیا گروں کی اصطلاح میں پارہ ٹھہرانا سونا بننے کی اولین شرط ہے۔ سید صاحب نے اپنے دل کی مدہم آنچ میں پارہ ٹھہرالیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم جیسے پارے کی طرح مضطرب اور بے سکون لوگ اُن کی پناہ میں آجاتے تو ہمیں بھی اُن کے اعتماد اور اُمید کی دولت سے کچھ حصہ مل جاتا۔ وہ ہم سے

ہمارا درد لے لیتے اور اس کے بدلے میں ہمیں سکون دے دیتے۔ سید صاحب اس لین دین کے بہت بڑے بیوپاری تھے۔

اگر ہم انسانوں کو دو بڑے منطقوں میں تقسیم کریں تو وہ یوں بھی ہو سکتی ہے۔ ایک وہ جو سکون چھینتے ہیں۔ دوسرے وہ جو سکون بانٹتے ہیں۔ ان دونوں اقسام کے لوگوں کی نفسیاتی ساخت مختلف ہوتی ہے۔ اُن کی تربیتِ ذات کے اُصول بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مقابلے اور مسابقت کی جس فضا میں ہم زندہ ہیں اس کا تقاضہ ایسی نفسیات ہے جو کاندھا مار کر آگے نکلنے کی تلقین کرتی ہے۔ سید وقار عظیم نے یہ سبق نہیں پڑھا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ جانا جانتے تھے۔ لندن کے ایک مہذب بزرگ لارڈ چیسٹر فیلڈ کے بارے میں بہت سے قصے مشہور ہیں جو اُن کی تہذیب ذات کی شہادت دیتے ہیں۔ یہ اٹھارویں صدی کی بات ہے۔ بارش میں لندن کی سڑکیں کیچڑ سے لت پت ہوتی تھیں۔ دیوار کے سہارے چلنے والے کیچڑ سے بچ سکتے تھے۔ لارڈ چیسٹر فیلڈ دیوار کا سہارا لے کر چل رہے تھے کہ مخالف سمت سے ایک شخص آ گیا۔ اُس نے اپنی تربیت کے مطابق کہا: ''میں کسی شیطان کو دیوار نہیں دیتا ہوں۔'' لارڈ چیسٹر فیلڈ یہ کہہ کر کیچڑ میں اُتر گئے: ''اور میں دے دیتا ہوں۔'' یہی تربیت اور تہذیب نفس سید وقار عظیم نے بھی حاصل کی تھی۔ سید صاحب انسانی اُلجھنوں کے ماہر نباض اور طبیب تھے۔ ملازمت کے مسائل ہوں، تعلیم کے مسائل ہوں، انسانی تعلقات کی اُلجھنیں ہوں، گھریلو زندگی کی پریشانیاں ہوں سید صاحب کے مشورے مفید اور اُن سے مشورہ لینے والوں کی تعداد کثیر تھی۔ وہ صرف زبانی جمع خرچ نہیں کرتے تھے۔ عملی طور پر بھی مدد و معاون ثابت ہوتے تھے۔ میں جب یونیورسٹی کی ملازمت میں آیا تو ایک دن مجھے سید صاحب کا لکھا ہوا ایک نوٹ ملا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ مستحق طالب علموں کی مدد کے لیے میں جو رقم

بطور عطیہ دے سکتا ہوں اُس کا اندراج اپنے نام کے آگے کر دوں۔ سید صاحب ایسی رقوم ماہ بہ ماہ جمع کرتے اپنی طرف سے اُس میں خاطر خواہ اضافہ کرتے اور مستحقین میں تقسیم کر دیتے تھے۔ صرف یہی نہیں اس سلسلے میں اُنہوں نے دوسرے مخیر حضرات کی خدمات بھی حاصل کر رکھی تھیں اور اکثر مستحق طالب علموں کی امداد عطیات اور وظائف سے کرتے تھے۔ اب جب کہ مشکلیں پیدا کرنے والے زیادہ اور حل کرنے والے کم ہو گئے ہیں، سید صاحب کسی داستان کی کوئی کہانی بن گئے ہیں۔ وہ خود داستانوں' ناولوں اور افسانوں کے ماہر تھے اُنہیں علم تھا کہ کس طرح حاتم' منیر شامی کے مسائل کا شریک ہو کر اُن سوالات کا جواب تلاش کرتا ہے جنہیں حل کرنا منیر شامی کا کام تھا اور جو اُس کے بس سے باہر تھا۔ حاتم اپنی جان پر کھیل کر آلام و مصائب جھیل کر زندگی کے اہم سوالوں کا جواب ڈھونڈتا اور منیر شامی کی مدد کرتا ہے۔ یہی کچھ سید وقار عظیم نے سیکھا تھا۔ وہ داستان پڑھاتے تھے اور اب خود بھی زندگی کی داستان کا ایک اہم کردار بن گئے تھے۔

سید وقار عظیم نہایت وضع دار انسان تھے۔ زندگی میں کوئی وضع اپنانا اور اپنی وضع سے پہچانے جانا تہذیبِ نفس اور تربیتِ ذات کا نتیجہ ہوتا ہے، یہ وضع، علم و بصیرت' لباس' چال ڈھال' طرزِ گفتگو' اخلاق و آداب' اِن تمام چیزوں کی مکمل ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا مرکز تو انسانی روح ہوتی ہے لیکن اس کا جوہر وضع دار انسان کے ہر عمل سے پھوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ مزاج کے دھیمے پن' سنجیدگی اور متانت کے اعتبار سے سید صاحب کا ایک باطنی تعلق مولانا حالی سے رہا ہو گا۔ کم از کم ظاہری سطح پر یہ تعلق نمایاں تھا۔ وہی شیروانی اور وہی مفلر۔ سلیم احمد نے ایک مضمون لکھا تھا'' حالی مفلر اور ہندوستان۔'' میرا خیال ہے کہ ایک مضمون سید صاحب پر بھی لکھا جا سکتا ہے جس کا عنوان یہ ہو:'' وقار عظیم' مفلر اور پاکستان۔''

حالی کے عہد میں شیروانیاں اور مفلر عام تھے۔ سید وقار عظیم اپنے عہد میں منفرد تھے۔ ایک اور فرق یہ ہے کہ حالی شاعر تھے اور شاعری کے نقاد۔ سید وقار عظیم افسانہ نگار تھے اور بنیادی طور پر داستانوں، ناول اور افسانوں کے نقاد۔ یہ الگ بات ہے کہ اُردو شعر کی روایت میں رچے بسے ہونے کے سبب اُنہوں نے شاعری کو بھی اپنی تنقیدی بصیرت کی روشنی میں پرکھا۔ سید صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے ادب کی روایت کو زندگی کی روایت سے وابستہ کردیا تھا۔ ادب سے جو بصیرت اور تہذیبِ نفس حاصل کی تھی اُس کا مکمل اظہار اپنی زندگی میں کرتے تھے۔ بلند آہنگی نہ اُن کی زندگی میں تھی اور نہ اُن کی تحریروں میں۔ یہ بات محض تحریروں کے مطالب و معانی اور لفظوں کی آوازوں تک مخصوص نہیں ہے۔ جن حضرات نے اُن کی لکھی ہوئی تحریر دیکھی ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اُن کے دائرے اور خطوط چھوٹے اور سمٹے ہوئے ہوتے تھے۔ تحریر نہایت واضح اور مجلی ہوتی تھی۔ کاغذ پر جگہ کم گھیرنا دُنیا میں کم جگہ گھیرنے کی علامت ہے۔ یہ بھی نفئی انا کی ایک صورت ہے اور یہی تہذیبِ نفس ہے۔ میر کا ایک شعر ہے:

عشق میں کیا کام ہے نازک مزاجی کے تئیں
کوہ کن کی طرح سے جی توڑ کر محنت کرو

سید صاحب جی توڑ کر محنت کرنے والوں میں سے تھے۔ صبح کو اِس کمیٹی کی میٹنگ ہے شام کو اُس کمیٹی کی۔ آج راولپنڈی جانا ہے کل ملتان۔ خرابیٔ صحت کی بناء پر آرام بھی ضروری ہے۔ اِن تمام باتوں کے باوجود سید صاحب مضامین پر مضامین اور کتابوں پر کتابیں لکھتے رہتے تھے۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن کے مباحث میں شرکت کرنا مستزاد تھا۔

CS CamScanner

اپنی تمام تر متانت اور سنجیدگی کے باوجود سید وقار عظیم میں ایک لطیف حسِ مزاح تھی۔ وہ لطیفے سناتے بھی تھے اور بات بات پر لطیفے پیدا بھی کرتے تھے۔ مجھے کوئی دلچسپ بات معلوم ہوتی تو انہیں ضرور سناتا تھا۔ بہت محظوظ ہوتے تھے اور جواب میں کوئی نہ کوئی دلچسپ واقعہ سنا دیتے تھے۔ ایک بار یہ ہوا کہ چند لڑکیوں نے ایک بزرگ اُستاد سے یہ شکایت کی کہ لڑکے انہیں تنگ کرتے ہیں۔ اُستاد نے کلاس میں لڑکوں کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا: ''یہ تمام لڑکیاں میری بہنیں ہیں۔'' شریر لڑکوں میں سے ایک نے برجستہ فقرہ لگایا: ''سر پھر تو یہ ہماری پھوپھیاں ہوئیں۔'' کلاس میں قہقہہ پڑ گیا۔ مجھے علم ہوا تو پیٹ میں کھلبلی مچی کہ سید صاحب کو جلد از جلد یہ لطیفہ سناؤں۔ سید صاحب بہت مشغول تھے۔ بالآخر میں نے انہیں لاء کالج میں سے گزر کر ''ادارۂ تالیف و ترجمہ'' کی طرف جاتے دیکھا۔ میں پیچھے دوڑا۔ علیک سلیک کرتے ہوئے اب ہم سڑک کے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں نے جلدی سے کہا: ''وقار صاحب آج ایک بہت دلچسپ واقعہ ہوا ہے۔'' سید صاحب سڑک کے کنارے کھڑے ہو گئے۔ مجھے اُمید تھی کہ وہ اس واقعے سے خوش تو ہوں گے لیکن چونکہ سڑک پر کھڑے ہیں ہنسیں گے نہیں۔ میں نے واقعہ سنایا۔ یکبارگی اُن کے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکلی۔ گویا ہنسی ضبط کرنے کے باوجود قہقہہ نکل گیا ہو۔ میں نے دیکھا وہ ہنس رہے تھے۔

وقار عظیم نہایت شفیق اُستاد تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسے اُستاد کم دیکھے ہیں جن سے اُن کے طالب علم اتنی محبت کرتے ہوں جتنی وہ سید صاحب سے کرتے تھے۔ میرے محترم اُستاد سید جمیل واسطی نے ایک بار مجھ سے یہ کہا تھا کہ عام مفروضہ یہ ہے کہ اُستاد باپ کے برابر ہوتا ہے مگر دراصل اُستاد ماں کی جگہ پر ہوتا ہے۔ طلبا وہ تمام باتیں جو

اپنے ماں باپ سے نہیں کہہ سکتے اپنے اُستاد سے کہہ دیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ اپنا دُکھ درد ماں سے کہتے ہیں۔ جمیل واسطی صاحب کے اس قول کی صداقت مجھے سید وقار عظیم میں ملی۔ سید صاحب ساری زندگی اپنے طالب علموں میں شفقت لٹاتے اور اُن کی محبت سمیٹتے رہے۔ شائد اُن کے منحنی جسم کی روحانی توانائی کا یہ بھی ایک راز تھا۔

میں 1956ء میں لاہور آیا تھا۔ اُس وقت کا لاہور بہت پرسکون تھا۔ اتوار کے دن شام کو کالجوں کے لڑکے مال روڈ پر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے 'میر اور غالب پر بحث کرتے' ایک دوسرے کو شعر سناتے چلتے تھے۔ اکا دکا موٹریں پاس سے گزر جاتی تھیں۔ میری محبوب سڑک کوئنز روڈ تھی جو اب فاطمہ جناح روڈ کہلاتی ہے۔ بالخصوص چھوٹی شملہ پہاڑی والا علاقہ۔ بہت سکون ہوتا تھا وہاں۔ وہ سڑک بھی اب شہر میں کہیں کھو گئی ہے۔ وہی زمانہ تھا جب میں سید وقار عظیم سے ملا تھا وہ بھی چھوٹی شملہ پہاڑی کی طرح پرسکون تھے۔ دھیما اور پُر اعتماد لہجہ۔ پُر وقار شخصیت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے جیسے منتشر لوگوں کا مامن و مسکن۔ اب نہ سید وقار عظیم دکھائی دیتے ہیں اور نہ چھوٹی شملہ پہاڑی۔ شور اور ہنگامہ بڑھ گیا ہے اور سکون کے منطقے تحلیل ہوتے جا رہے ہیں۔

سلسلۂ ملاقات، سید وقار عظیم کے ساتھ

کشور ناہید

بچپن اور جوانی کے بیچ جنون سوار ہوا کہ بڑے ادیبوں کے آٹوگراف لیے جائیں۔ پتہ پوچھتی پوچھتی، اُن کے دروازے پہ پہنچ جاتی۔ برقعہ پوش لڑکی کا یوں اکیلے گھومنا اور بھیک مانگنے والے کی طرح، آٹوگراف بک آگے کر دینا، ہمارے سارے ادیبوں کو بہت عجیب لگتا تھا۔ مگر میرے اندر تو جنون تھا، بس سے اُتری اِس گھر، بس سے اُتری دوسرے گھر۔ منٹو صاحب، حجاب امتیاز علی اور سید وقار عظیم سے ملاقات اور آٹوگراف دونوں ہی، یادیں، تعلق کا اساس یوں بنیں کہ میں اُن کی کتابوں کے بارے میں سوال کر ڈالتی اور اُنہیں اعتبار آتا کہ یہ دیوانی، واقعی کچھ پڑھنا چاہتی ہے۔ ایک اور شخص جنہیں ہم آلِ احمد سرور کے نام سے جانتے اور پہچانتے تھے، اُن کی کتاب نئے اور پرانے چراغ اور سید وقار عظیم کی کتاب افسانے پر تنقید مجھے اِس لیے بہت پسند تھیں کہ سرور صاحب کی کتاب میں جتنے اچھے شعر تھے، وہ بار بار پڑھ کر زبانی یاد ہو چکے تھے اور سید صاحب کی کتابوں میں جن افسانوں کے کلیدی کرداروں کا تجزیہ کیا گیا تھا، وہ کتابیں اور افسانہ نگاروں کے مجموعے میں خرید نہیں سکتی تھی۔ میں موجود اقتباسات سے کہانی مرتب کرتے ہوئے، خود ہی تانا بانا، بننے لگتی تھی۔

سید صاحب بہت نرم گفتار شخص تھے۔ جب بھی میں اورینٹل کالج جاتی، کسی

نہ کسی نقاد سے سید صاحب میری ملاقات کروا دیتے ، جو سوال میں کرتی ، اُن کے جواب میں بہت سی کتابوں کے نام بتا دیتے یا کوئی کتاب اورینٹل کالج لائبریری میں دستیاب ہوتی ، اس کے حصول میں میری مدد کرتے ۔

میں کالج کے تھرڈ ائیر میں پہنچی تو ملاقات میں سید صاحب کے ساتھ صوفی تبسم صاحب بھی شامل ہو گئے ۔ یہ دونوں حضرات ، لنگویج اتھارٹی کے ممبر تھے ہفتے میں دو دفعہ اس کے اجلاس ہوتے تھے ۔ ایک نہ ایک اجلاس کے بعد ، صوفی صاحب سید صاحب کو اپنے گھر دوپہر کے کھانے کے لیئے لیجاتے ۔ چونکہ صوفی صاحب کا گھر ہمارے گھر سے دو گھر پرے تھا ۔ صوفی صاحب سیڑھیاں چڑھ کر آتے ، میرا نام لے کر پکارتے اور کہتے : تمھاری اماں نے کیا پکایا ہے دال ہے تو دے دو ۔ اماں فوراً کنواں کناروں کی گہری پلیٹ میں تازہ بگھار لگا کر دال پکڑا دیتیں اور عموماً صوفی صاحب انگلی سے چاٹتے ہوئے نیچے اُتر کر جب اپنے گھر پہنچتے ، سید صاحب دال دیکھ کر کہتے ، کشور کی اماں یوپی کی ہیں ؟ صوفی صاحب گردن ہلاتے ہوئے کہتے : ''میں نے کشور کو کہا ہے کہ میری اماں کو سارے یوپی کے کھانے بنانا سکھادے ۔''

سید صاحب جیسے کم گو تھے ویسے ہی کم طعام کرتے ۔ صوفی صاحب چٹکلے چھوڑتے ، سید صاحب بس مسکراہٹ سے جواب دیتے ، اُن کا بولنا کھلا جب وہ پبلک سروس کمیشن کے ممبر بنے اور امیدواروں سے تہہ بہ تہہ سوال کرتے ۔ آرائشِ جمال سے غافل ، لڑکیوں کو بے ساختہ جواب دیتا دیکھ کر نجانے کیوں یہ یقین ہو جاتا کہ مستقبل خواتین کے ہاتھوں میں ہے ۔ میری کتاب ''لب گویا'' پر

آدم جی انعام کا اعلان کرتے ہوئے بھی، انہوں نے جج صاحبان کی جانب سے اسی اُمید کا اظہار کیا۔ نظم کا انعام مجھے اور نثر کا انعام بیگم اختر ریاض الدین کو اُن کے سفر نامے پر دیا گیا تھا۔ جمیل الدین عالی نے بھی کہا: ہم لوگ خواتین کی تحریروں پر ریشہ خطمی نہیں ہوئے، یہ لکھتی ہی بہت اچھا ہیں۔ سید صاحب یہ سن کر مسکرا دیے۔ میں نے اُنہیں کبھی قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ یکا یک اُسی مسکراہٹ کے ساتھ دنیا سے رخصت چاہتے ہوئے، ہماری گود میں اپنی یادیں چھوڑ گئے۔ مجھے علم کا چسکا، صوفی صاحب، سید صاحب اور احسان دانش نے ابتدا سے ایسا لگایا کہ بعد میں مختار صدیقی نے علم کی طلب کو سہارا دیا۔

سید صاحب کے جانے کے بعد، تعلقات کی دہلیز کو مستحکم۔ انور بھائی اور اختر وقار عظیم نے ایسے کیا کہ ہماری آپس میں چاہے تھوڑی دیر کو ہی ملاقات مگر ہوتی ضرور تھی یہ سلسلۂ ملاقات اب تک چلا آتا ہے۔

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

اُستادِ محترم

ڈاکٹر سہیل احمد خان

وقار عظیم صاحب ایسا طوفان نہیں تھے جس سے دریاؤں کے دل دہل جائیں لیکن وہ ایسی شبنم ضرور تھے جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک پیدا ہو جائے، کچھ شخصیتیں آتش فشاں پہاڑ کی طرح ہوتی ہیں جو ماحول کو زیروزبر کر کے چیزوں کی ترتیب بدل دیتی ہیں، کچھ لوگ بند قلعے کی طرح ہوتے ہیں جن کے باطن تک رسائی مشکل ہوتی ہے لیکن سنگلاخ فصیلوں سے پرے حیران کن مناظر بھی موجود ہوتے ہیں، وقار صاحب نہ تو آتش فشاں پہاڑ تھے اور نہ بند قلعہ اُن کی ذات سلیقے سے ترتیب دیئے گئے ایک باغ کی طرح تھی جس کے اندر جاتے ہوئے کسی قسم کی جھجک محسوس نہ ہو۔

وقار عظیم کی تنقید سے میری شناسائی اُن سے ملاقات سے بہت پہلے شروع ہوئی اور جب میں اورینٹل کالج میں ان کا شاگرد ہوا تو ان کی تنقید سے اپنی استطاعت کے مطابق استفادہ کر چکا تھا، افسانے اور داستان کے بارے میں اُن کے مضامین سے بہت کچھ سیکھا تھا لیکن ایم۔ اے میں پہنچنے تک میری دلچسپی محمد حسن عسکری اور فراق گورکھپوری کی تنقید سے زیادہ ہو چلی تھی۔ عسکری صاحب کے مضامین پڑھ کر مولانا حالی کا مفکر ہی نظر میں نہ جچتا تھا پھر وقار صاحب کا مفکر کس طرح نگاہوں میں سماتا۔ یہی وجہ تھی کہ شروع شروع میں میں وقار صاحب سے ذرا فاصلے پر ہی رہا اتنا ضرور تھا کہ اُن کی وضع میں ایک خاص قسم کا جو رکھ رکھاؤ تھا وہ اُس زمانے

CS CamScanner

میں بھی دل پر اثر کرتا تھا، جب دراز قد، دُبلے پتلے وقار عظیم شیروانی اور پانجامہ پہن کر ایک ہاتھ میں تھامی ہوئی کتابوں کو سینے سے چمٹائے ہوئے کالج کی سیڑھیاں چڑھتے تو یہ احساس ضرور ہوتا کہ ایک اُستاد جا رہا ہے ورنہ ہمیں پڑھانے والوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو کلاس کی طرف جاتے ہوئے یوں لگتے تھے جیسے کسی نیلام میں بولی دینے جا رہے ہوں۔

مجھے وقار صاحب کی کلاس میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا ہے اور میں اُن کے شاگردوں کی آخری نسلوں میں شامل ہوں کیونکہ ہماری کلاس کے بعد اُنہوں نے ایک دو ہی کلاسوں کو پڑھایا ہوگا۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہماری کلاس کا باقاعدہ آغاز ہوا تو وقار صاحب بیماری کی وجہ سے کئی روز تشریف نہیں لائے سردیوں میں اُنہیں سانس کی تکلیف رہتی تھی لیکن اُن کے معمولات سے اس چیز کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ جب پہلے پہل کلاس لینے آئے تو اُنہوں نے افسانے اور ناول کے مطالعے کی اہمیت پر زور دیا اور اِس مطالعے کے آغاز کے لیے ناول اور افسانے کے فن کی کئی جہتوں کا تذکرہ کیا بہت سی اُردو کتابوں کے نام لکھوائے اور تین انگریزی کتابوں کا نام بھی لیا اور کہا کہ یہ کتابیں ناول اور افسانے کی اچھی سمجھ پیدا کر سکتی ہیں۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ یہ کتابیں ایڈون میور کی سٹرکچر آف ناول، پرسی لبوک کی کرافٹ آف فکشن اور ای ایم فارسٹر کی آسپیکٹس آف ناول تھیں۔

وقار صاحب کا لیکچر اُن کے دھیمے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ تھا، کسی اُستاد کا لیکچر دینے کا انداز اُس کی ذہنی اور نفسیاتی ساخت کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا ہے۔ وقار صاحب کا لیکچر جھنجھوڑتا نہیں تھا، نہ ہی یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ خود کو ہم سے بہت بالا مخلوق سمجھ رہے ہیں وقار صاحب کا لیکچر ایسے ہوتا تھا جیسے کوئی سرگوشیوں میں راز کی بات بتا رہا ہو، وقار صاحب کے لیکچر میں انکشاف اور معلومات کی روشنی بھی ہوتی تھی لیکن

اس سے بھی زیادہ اُن کی تقریر کی حلاوت تھی جس سے طلبہ کو یہ احساس رہتا تھا کہ وہ مانوس ماحول میں بیٹھے ہیں۔ یہ حلاوت، وقار صاحب کی شخصیت کا خاص وصف تھی میں نے اُن کی گفتگو میں بعض لوگوں کا شکوہ بھی سُنا ہے لیکن ان کی گفتگو کبھی کڑوی نہیں ہوتی تھی اور ہلکی سی مسکراہٹ ہمیشہ اُن کے لبوں پر کھیلتی رہتی تھی۔ اپنی وضع اور حلاوت کی وجہ سے وقار صاحب ہمیشہ طالب علموں میں مقبول رہے وہ بیماری کے باوجود طلبہ کی سرگرمیوں میں خود شریک ہوتے اور اُن کی حوصلہ افزائی کرتے۔ کالج کی زندگی میں ہنگامے اور لطیفے تو ہوتے ہی رہتے ہیں وقار صاحب کے بارے میں لکھتے ہوئے بہت سی باتیں اور اُس زمانے کے بہت سے ہنگامے یاد آرہے ہیں اُن میں سے ایک دو باتیں آپ بھی سُن لیں۔

ایک بار کالج میں بعض طلبہ نے باڈی بلڈنگ کلب بنائی کالج کے عقب میں یہ طلبہ بہت دنوں تک مشق کرتے رہے اور پھر ایک دن اُنہوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا، وقار صاحب کو مہمانِ خصوصی کے طور پر بلایا گیا۔ نجانے اُن طلبہ نے تن سازی سے وقار صاحب کا کیا رشتہ ڈھونڈا تھا۔ خیر وقار صاحب نے ان تن سازوں کے درمیان بیٹھ کر تصویر اُتروائی بہت سے طالب علم چاروں طرف کھڑے تھے، تن سازوں نے وزن اُٹھانے کا مظاہرہ کیا اور تقریب ختم ہونے کو تھی کہ کالج کے سب سے دبلے طالب علم انوار الحق بخاری نے تماشائیوں کی صفوں سے نکل کر کوٹ پتلون پہنے ہوئے، کالج کے چیمپئن کے اٹھائے ہوئے وزن کو ایک دم سر کے اوپر اُٹھا کر زمین پر دے مارا تماشائیوں میں کھلبلی سی مچ گئی اور وقار صاحب زور سے ہنس پڑے۔ اُس دن کے بعد اورینٹل کالج کی باڈی بلڈنگ کلب ختم ہوگئی۔

وقار صاحب کالج کے اوقات کے بعد یونیورسٹی لائبریری کے سامنے ادارہ تالیف و ترجمہ میں بیٹھتے تھے وہ اس ادارے کے منتظم تھے کبھی پیدل اور کبھی کار پر کالج

سے اس ادارے میں آتے۔ ہم لوگ اکثر لائبریری کے باہر کھڑے ہوتے وہ رک کر خیریت پوچھتے سلام کا جواب دیتے اور پڑھائی کے بارے میں استفسار کرتے۔ ادارہ تالیف و ترجمہ میں اصطلاحات کے تراجم کا کام ہوتا تھا۔ ڈاکٹر محمد اجمل، محمود احمد خان، ڈاکٹر نذیر احمد، حمید احمد خان اور کئی دوسرے اصحاب آتے اور میٹنگ ہوتیں۔ اُسی زمانے میں ہمیں پتہ چلا کہ اصطلاحات کے ترجمے کے لیے تمام ممبروں کو فی اصطلاح کچھ پیسے ملتے ہیں۔ اس پر ہمارے ایک ساتھی نے یہ لطیفہ اختراع کیا کہ جب میٹنگ ہوتی ہے تو وقار صاحب چونیوں کی بھری ہوئی تھیلی لے کر بیٹھتے ہیں اور جب کسی اصطلاح کے لئے کوئی ترجمہ منظور کر لیا جاتا ہے تو وقار صاحب تھیلی کھول کر تمام ممبروں میں چونی چونی تقسیم کرتے ہیں اور اس کے بعد اگلی اصطلاح پر غور شروع ہو جاتا ہے۔

وقار صاحب کالج کے ہر مسئلے کی خبر رکھتے تھے طلبہ کے انفرادی مسائل کی اطلاع بھی انہیں ہوتی تھی کبھی کسی طالب علم کی شکایت اُن تک پہنچتی تو وہ اس انداز میں اسے سمجھاتے کہ پھر شرارت کی ہمت نہ رہتی۔ لکھنے پڑھنے والے طلبہ کی وہ ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے رہتے۔

شعبۂ اُردو میں ایم۔ اے اور پی ایچ ڈی کے لیے لکھے گئے مقالوں کی ایک بہت بڑی تعداد وقار صاحب کی نگرانی میں لکھی گئی ہے۔ وقار صاحب کو خصوصاً داستان، افسانے اور ڈرامے سے شغف تھا، داستان کے بارے میں اُنہوں نے اُس زمانے میں مضامین لکھے جب اس صنف کو محض بے کار خیال آرائی سمجھا جاتا تھا وقار صاحب نے داستانوں کی طرف توجہ دلائی اور کہا کہ داستانوں میں تخیل کی لامحدود اور رنگارنگ دنیائیں آباد ہیں، اُنہوں نے بتایا کہ داستان میں زبان و بیان کے اسالیب کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اس کے علاوہ ان داستانوں میں ایک خاص زمانے کی معاشرت کی خوب صورت

CS CamScanner

عکاسی ہے۔ اسی لئے داستانوں کو نظر انداز کرنے کا مطلب اس ذخیرے سے افسوسناک عدم توجہی کے مترادف ہے۔ نئے افسانہ نگاروں پر اُنہوں نے اُس زمانے میں مضامین لکھے جب ان کی طرف زیادہ لوگوں کی توجہ نہیں تھی اُنہوں نے افسانے کے جدید رُجحانات کی ترویج کے لئے فضا ہموار کی اور اپنی وفات تک وہ اُردو کے واحد نقاد تھے جنہوں نے فکشن کو اپنی تنقید کے لئے موضوع بنایا اور مربوط تصانیف کی صورت میں اپنے نقطۂ نظر کو سنجیدہ انداز میں پیش کیا۔ زندگی کے آخری برسوں میں اُن کی دلچسپی ''اقبالیات'' اور بعض دوسرے موضوعات کی طرف زیادہ ہوگئی تھی لیکن وہ داستانوں پر ہونے والی نئی تنقید اور افسانے کے جدید تر اسالیب کے بارے میں دلچسپی رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ اب ان اصناف کی تنقید کو نیا رُخ دیا جائے۔ خصوصاً ''آرائشِ محفل'' کے بارے میں اُن کا خیال تھا کہ حاتم کی مہمات کی کہانیوں میں اخلاق و دانش کا خزانہ چھپا ہوا ہے اُن کی خواہش تھی کہ ان کہانیوں پر زیادہ غور کیا جائے۔

وقار صاحب، نصاب سازی کی مختلف کمیٹیوں سے بھی وابستہ رہے اگر ان کی مرتب شدہ نصابی کتابوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بھی دلچسپ موضوع ہوگا۔ وقار صاحب نے اپنی شخصیت کی تنظیم کچھ اس ڈھب سے کی تھی کہ اُن کا کوئی لمحہ بے کار نہیں گزرتا تھا، مجھے طالب علم کے طور پر بھی انہیں دیکھنے کا اتفاق ہوا اور بعد میں وہ بزرگ رفیق کے طور پر بھی میرے سامنے رہے میں نے اُنہیں ہمیشہ محنت کرتے اور محنت کا درس دیتے دیکھا آخر وقت تک وہ خود اتنا کام کرتے تھے کہ بالکل محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ بیمار ہیں۔

اتفاق دیکھئے کہ اب میں اورینٹل کالج میں اُن موضوعات پر درس دیتا ہوں جو کبھی وقار صاحب پڑھاتے تھے، کبھی کبھار اُسی کمرے میں جہاں وقار صاحب نے ہمیں پہلا لیکچر دیا تھا، پڑھاتے پڑھاتے مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے وقار صاحب کہیں پاس ہوں اور

CS CamScanner

دھیمے انداز میں پوچھ رہے ہوں: ''کیوں بھئی ان طالب علموں کو ایڈون میور، پرسی لبوک اور ای ایم فارسٹر کی کتابیں بھی پڑھنے کے لئے کہا یا نہیں؟۔''

وقار عظیم سے میرے تعلقات کم و بیش 42 سال سے تھے۔ اُن کے اعلیٰ اخلاق، اخلاص اور لطافتِ طبع نے ان سے محبت و رأفت کے رشتے قائم کر دیئے تھے جو بحمد للہ آخر وقت تک رہے۔

وقار عظیم صاحب نے افسانوی ادب کا شروع ہی سے وسیع مطالعہ کیا تھا۔ بالآخر انہوں نے اس فن میں اس قدر کمال حاصل کیا کہ بلاتکلف ان کو اس کا مسلم الثبوت استاد کہا جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں اس فن میں جو مقام ان کو حاصل تھا وہ کسی کو بھی حاصل نہیں۔ آپ نے ادب کے لئے جو کچھ چھوڑا وہ تو یقیناً یادگار رہے گا۔ لیکن دلوں میں جو نقوش چھوڑے ہیں وہ بھی کیوں کر محو ہو سکیں گے؟

پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں

CS CamScanner

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

من موہنی شخصیت

ڈاکٹر پرویز پروازی

1958ء میں ہم تعلیم الاسلام کالج ربوہ سے عربی میں بی اے آنرز کر کے اورینٹل کالج میں ایم اے اُردو کرنے کے لیے داخل ہوئے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ پرنسپل تھے فرمانے لگے آپ عربی میں آنرز کر کے آئے ہیں عربی میں کیوں ایم اے نہیں کرتے؟ ہم نے کہا قبلہ: جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد۔ پر طبیعت ادھر نہیں آتی۔ سید صاحب مسکرائے فرمایا آپ کو ایم اے اُردو ہی میں ہونا چاہئے اور ہمیں داخل کر لیا۔ اس وقت شعبہ اُردو کے ہمہ وقت اساتذہ میں استاذی المکرم سید وقار عظیم اور استاذی المکرم ڈاکٹر عبادت بریلوی تھے۔ گورنمنٹ کالج سے قبلہ غلام محی الدین اثر اور اسلامیہ کالج سے ڈاکٹر وحید قریشی، سجاد باقر رضوی اور پروفیسر افتخار احمد صدیقی تشریف لاتے تھے۔ قبلہ سید وقار عظیم کے سپرد داستانوں اور افسانوی ادب کے پرچے تھے۔ کالج کی ادبی سرگرمیوں کے عمومی نگران بھی آپ ہی تھے۔ کچھ دنوں ہی میں آپ کو معلوم ہو گیا کہ ہمیں بین الکلیاتی مباحثوں میں دلچسپی ہے اور یہ کہ ہم اپنے کالج کے لیے بہت سی ٹرافیاں جیت چکے ہیں آپ نے ہمیں بین الکلیاتی مباحثوں میں شریک ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی اور اتفاق کہ پہلے ہی مباحثہ میں ہم نے دوسرا انعام حاصل کر لیا۔ ہمارے دوسرے ساتھی مباحثہ میں شریک ہی نہ ہوئے ورنہ شاید ٹرافی ہمیں مل جاتی۔ اس انعام کا فائدہ یہ ہوا کہ ہمیں پنجاب یونیورسٹی کی

طرف سے مختلف مباحثوں میں شریک ہونے اور بہت سی ٹرافیاں جیتنے کا موقع مل گیا۔ اورینٹل کالج میں کوئی دوسرا مقرر ہی ہمیں نہ ملا کہ ہم ٹیم بنا سکتے۔ اب آ کے وقار بن الٰہی کی خودنوشت سے معلوم ہوا کہ وہ کالجوں کے مباحثوں میں شریک ہوا کرتے تھے آپ نے اورینٹل کالج میں ہمیں تو اپنے اس گُن کا پتہ ہی نہ چلنے دیا۔ البتہ مشاعرہ میں ہمیں شبنم عابد علی کے ساتھ ایک ٹرافی جیتنے کا موقع ملا اس میں پہلا انعام شبنم کا تھا ہم تو اس کے تابع مہمل تھے (ہمارا دوست مرحوم ارشاد حسین کاظمی اس کو ہمیشہ "تابع محمل پڑھا کرتا تھا) "

وقار صاحب کو اس بات کا بھی پتہ چل گیا کہ ہم اپنے کالج کے اخراجات پورے کرنے کے لیے شام کو ٹیوشنیں پڑھاتے ہیں تو ان کی وابستگی میں محبت بھی شامل ہوگئی۔ ہر دوسرے چوتھے اِدھر اُدھر کی باتوں میں ہمیں پوچھ لیتے کہ ہمیں کوئی دقت تو نہیں؟ امتحان ہونے والا تھا ہم نے ٹیوشنیں وغیرہ چھوڑ رکھی تھیں رول نمبر حاصل کرنے کے لیے کالج کے سارے واجبات ادا کرنے تھے مگر سوئے اتفاق کہ ہمارے پاس پیسے نہیں تھے۔ ہمارے شعبہ اُردو کے کلرک جمیل الرحمٰن ہمیں ایک دو بار یاددہانی بھی کروا چکے تھے مگر ہمارے پیسوں کا انتظام ہی نہیں ہو پاتا تھا آخر ہم نے اپنے کمرے میں پڑے ہوئے انٹرکالجیٹ مباحثوں میں جیتے ہوئے نفیس کپ انارکلی میں جا کر بیچ دیے تو ہمیں رولنمبر لینے کے لیے رقم میسر آ گئی۔ ہم جمیل صاحب کے پاس پہنچے تو جمیل صاحب ہمارا رولنمبر ہاتھ میں لئے بیٹھے تھے فرمانے لگے یہ رہا آپ کا رولنمبر۔ ہم نے پیسے ان کی طرف بڑھائے تو فرمانے لگے ان کی ضرورت نہیں پیسے ادا ہو گئے ہیں۔ آپ جا کر تیاری کریں۔ ہم نے بہت پوچھا پیسے کہاں سے ادا ہوئے کس نے ادا کیے مگر جمیل صاحب نے

CS CamScanner

کچھ بتا کے نہیں دیا۔ امتحان کے بعد جمیل صاحب نے بتایا کہ ہمارے اخراجات کی رقم سیّد وقار عظیم نے ادا کی تھی۔ ہم نے وہ رقم واپس کرنے کی کوشش کی تو فرمایا بیٹا میں نے وہ رقم واپس لینے کے لئے نہیں دی تھی اگر آپ واپس ہی کرنا چاہتے ہیں تو کسی مستحق طالب علم کو دے دیا کیجئے۔ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے ہم نے مدتوں استاذی المکرّم کا یہ کارِ خیر جاری رکھا۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین۔

سیّد وقار عظیم پتلے دبلے قد وقامت کے آدمی تھے۔ شیروانی اور پاجامہ ان پر بہت سجتا تھا۔ گلے میں مفلر بھی لپیٹتے تھے جو ان کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گیا تھا۔ ان کو چلتا دیکھ کر غالب کی ترکیب سروِ خراماں سمجھ آتی تھی مگر اس میں کوئی لٹک مٹک نہیں تھی وقار اور اعتبار تھا۔ کلاس میں آتے تو ایک نظر ساری کلاس پر ڈالتے۔ رجسٹر میں حاضری لگاتے اور پھر آہستگی سے اپنا لیکچر شروع کرتے، بیان میں دلاویزی اور حلاوت تھی ان کی بات سننے کو جی چاہتا تھا ان کے لیکچر کے نوٹس بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ باتیں خود بخود ذہن نشین ہو جاتی تھیں۔ ان کے لیکچر پر فارسی کا یہ مصرعہ صادق آتا تھا
درسِ ادیب اگر بود زمزمہ محبتے۔ طلبا سنتے اور سر دھنتے!

سب اساتذہ کا اپنا اپنا انداز تھا۔ سیّد عبداللہ صاحب کا لیکچر باقاعدہ نوٹ کیا جا سکتا تھا عبادت صاحب جس طرح لکھتے تھے اسی طرح بولتے تھے لمبے لمبے عبارت آرائی سے بھرپور فقرے بیچ میں کوئی کوئی کام کی بات مگر وقار صاحب کا لیکچر پوری توجہ چاہتا تھا اس لئے ان کے لیکچر میں کانا پھوسی بھی نہیں ہوتی تھی لوگ ان کے چہرے کی طرف دیکھتے رہتے۔

میں شام کو چیفس کالج میں ٹیوشن پڑھانے جاتا تھا اور پیدل جاتا تھا کیونکہ جیب

میں کرائے کے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے۔ ایک روز استاذی المحترم وزیرالحسن عابدی لارنس باغ میں مل گئے۔ میں نے بڑھ کر سلام کہا۔ فرمانے لگے سیر ہو رہی ہے؟ میں نے کہا جی سر۔ مسکرائے اور فرمایا تنہا؟ کسی فارسی اُستاد کا مصرعہ کوندے کی طرح ذہن میں لپکا ہم نے کہا: ''گرفتہ ایم اجازت زباغباں تنہا'' قبلہ عابدی صاحب بیقرار ہو گئے اور ہمیں گلے لگا لیا۔ اگلے روز سارا اورینٹل کالج اس مصرعہ سے مہک رہا تھا معلوم ہوا قبلہ عابدی صاحب جس سے بھی ملے ہیں اسے یہ مصرعہ سنایا ہے اور حیرت کا اظہار کیا ہے کہ اردو کے ایک طالب علم نے کیسے اسے برمحل استعمال کیا ہے۔ یہ تھے ہمارے صاحب ذوق قدردان اساتذہ۔ ایم اے کے دو سال کے دوران تو عموماً اور پی ایچ ڈی کی تعلیم کے دوران خصوصاً ان کی محبت کا مورد رہے۔ ہمیں ریسرچ کے سلسلہ میں لائبریری سے جن کتب کی ضرورت ہوتی وہ قبلہ وقار صاحب دلوا دیتے اگر زیادہ مطلوب ہوتیں تو عابدی صاحب اپنے نام پر نکلوا دیتے کیونکہ ہم لاہور سے باہر رہتے تھے۔ غرض ان اساتذہ کی مہربانی سے ہمارا پی ایچ ڈی کا کام بخیر و خوبی وقت پر انجام پا گیا۔

ایم اے کے بعد میں نے تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں پڑھانا شروع کیا۔ یہ کالج اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں میں ملک کا جانا پہچانا کالج تھا۔ قبلہ و کعبہ سیّد وقار عظیم میری درخواست پر ہر سال ہماری تقریبات میں تشریف لاتے کبھی انٹرکالجیٹ مباحثوں میں منصف کے طور پر کبھی بزم اردو کے اجلاسوں میں صدارت کے لئے۔ ہماری کل پاکستان اُردو کانفرسوں منعقدہ 1964ء اور 1967ء میں تو بھرپور شرکت فرمائی اور ہر قدم پر ان کی رہنمائی میرے ساتھ رہی۔ ربوہ لاہور سے کوئی سو میل دور ہے اور سڑک کے ذریعہ سفر کوئی ایسا آسان نہیں ہم ان کی سہولت کے لئے جو گاڑی یا جیسی گاڑی بھیجتے بلاتکلف اس

CS CamScanner

میں سفر فرماتے بعض اوقات کئی کئی لوگوں کی ہمراہی میں سفر کرنا پڑتا مگر منغض نہ ہوتے۔ ایک بار جناب احسان دانش کے ہمراہ تشریف لائے فرمانے لگے کسی شاعر کی ہمراہی میں سفر کرنے کا پہلی بار موقع ملا ہے اور میں نے بہت حظ اٹھایا ہے۔ اُردو کانفرس منعقدہ 1967ء کے موقع پر تو ان کے ساتھ چار اور لوگ بھی تھے گاڑی والے نے سب سے پہلے ان کو بٹھالیا اور باقی لوگوں کو جمع کرتا پھرا۔ مجھے معلوم ہوا تو میں نے قبلہ سے اس تکلیف کے لئے معذرت کی فرمایا کوئی بات نہیں آخر کسی کو تو پہلے بیٹھنا ہی تھا۔

مجھے پرانی کتابیں جمع کرنے کا شوق ہے کچھ میرا موضوع ایسا تھا کہ پرانی کتابوں کو کھنگالنا لازمی تھا ایک بار مجھے ایک بہت پرانا ناول دستیاب ہوا ''خواب کلکتہ'' میں لپک جھپک قبلہ وقار عظیم کے ہاں پہنچا کہ انہیں مطلع کروں کہ ایک نایاب ناول مجھے دستیاب ہوگیا ہے۔ قبلہ و کعبہ علیل تھے اور سو رہے تھے۔ کسی ملاقاتی کو ملنے کی اجازت نہیں تھی میں نے ایک چٹ لکھ کر چھوڑ دی کہ ''خواب کلکتہ'' دستیاب ہوگیا ہے اگلی ملاقات پر پیش کر دوں گا اور ربوہ واپس آ گیا۔ اگلے روز علی الصبح برادر مکرم سید معین الرحمٰن ربوہ پہنچے کہ قبلہ وقار عظیم نے بھیجا ہے اور فرمایا ہے کہ میں ''خواب کلکتہ'' ان کے ہاتھ انہیں بھیج دوں وہ اس تاریخی اور نایاب ناول کو فوری طور پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک نایاب ناول کو دیکھنے کا وہ اشتیاق تھا کہ آپ نے خاص طور پر آدمی بھیج کر طلب فرمایا حالانکہ مطالعہ کے بعد وہ کوئی ایسا ناول ثابت نہ ہوا کہ جس کا ذکر کسی بھی طور سے ضروری ہوتا صرف تاریخوں میں اس کا نام مذکور تھا۔ میں ایک بار اپنے گھر کا خالص گھی ان کے لئے لے گیا آپ نے قبول فرمایا دو ہفتے کے بعد میں گیا تو سخت تکلیف میں مبتلا تھے فرمانے لگے میاں ہم تو بازار کا گھی کھا کھا کر اس کے عادی ہو گئے تھے خالص گھی استعمال کیا ہے تو سارے گھر والے ہی بیمار پڑ گئے اسلئے

آئندہ تکلیف نہ کیجئے۔

کالجوں کے لڑکے مختلف شہروں کو جاتے اور تاریخی مقامات کی سیر کرتے ہیں میں نے ایک جدت یہ کی اپنے طلبا کا ایک گروپ لے کر لاہور آیا اور مختلف ادبا شعراء سے انہیں ملایا۔ اورئینٹل کالج میں لے گیا' اتوار کو پاک ٹی ہاوس میں لایا حلقہ ارباب ذوق میں شرکت کروائی۔ غرض طلبا بہت خورسند ہوئے میں نے کہا اپنے اپنے تاثرات لکھیں نوے فیصد طلبا نے لکھا کہ انہیں سب سے زیادہ خوشی پروفیسر وقار عظیم سے مل کر اور ان کی باتیں سن کر ہوئی (اور سب سے زیادہ مایوسی حفیظ جالندھری سے مل کر)۔

1958ء میں فیض نئے نئے جیل سے رہا ہو کر آئے تھے ایک روز دیکھا کہ ہمارے اورینٹل کالج کے لان کے ایک کونہ پر کھڑے ہیں۔ میں لپک کر گیا ان سے پوچھا سر آپ ادھر کیسے؟ فرمانے لگے وہ ظفر اللہ پوشنی ہمارے ارباب بجن ہیں نا وہ یہاں لا کالج میں پڑھتے ہیں انہیں ملنے کو آیا ہوں بس آتے ہی ہوں گے۔ اتنے میں پوشنی صاحب آ گئے ان کے ساتھ ندرت الطاف تھیں ہم نے جلدی سے اورینٹل کالج کے سٹاف روم سے ہی ایک کرسی نکالی۔ فیض تشریف فرما ہوئے ہم ان کے ساتھ نیچے بیٹھ گئے۔ لڑکے ان کے اردگرد جمع ہو گئے کچھ لڑکے لا کالج کے تھے کچھ اورینٹل کالج کے۔ فیض اپنے دھیمے دھیمے لہجہ میں باتیں کرنے لگے۔ پھر اپنی غزل سنائی ''جنہیں جرم عشق پہ ناز تھا وہ گناہگار چلے گئے'' فیض صاحب تو چلے گئے سیّد عبداللہ صاحب کو کہیں اس بات کی بھنک پڑ گئی کہ فیض صاحب کالج میں تشریف لائے تھے۔ اگلے روز ہماری جواب طلبی ہو گئی کہ فیض صاحب کو کس نے بلایا تھا کیوں بلایا تھا کس کی اجازت سے بلایا تھا؟ ہم نے سارا واقعہ قبلہ وقار صاحب سے بیان کیا۔ وقار صاحب مسکرائے فرمایا آپ سیّد عبداللہ صاحب

سے معذرت کر لیجئے کہ آپ کو باریکیوں کا علم نہ تھا اور آئندہ ایسی بات نہیں ہو گی۔ ہم سیّد عبداللہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ کہہ سنایا سیّد عبداللہ صاحب خاموش سنتے رہے صرف یہ فرمایا۔ عزیزم احتیاط لازم ہے۔ ہم اپنی دانست میں بہت خوش تھے کہ کالج میں ایک عظیم الشان ادبی تقریب کا موقعہ میسّر آ گیا۔ مگر الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔ وقار صاحب کو بھی ہماری خفت کا خیال ہو گا کچھ ہی دنوں کے بعد فرمایا میاں دیکھو جوش ملیح آبادی لاہور تشریف لا رہے ہیں انہیں کالج میں مدعو کرو۔ وہ بڑی مجلسوں میں شعر نہیں سناتے اس لئے کالج کے سٹاف روم میں انتظام کرو اور اساتذہ کے علاوہ کچھ صاحب ذوق طلبا کو بلاؤ۔ وقار صاحب نے خود ہی جوش صاحب سے رابطہ کیا انہیں راضی کیا اور خود ہی ساتھ لائے۔ مجلس میں لا کر ہمیں ان کے ساتھ بٹھا دیا حالانکہ ہم کالج کی انجمن اُردو کے عہدیدار نہ تھے۔ کالج کے سٹاف روم میں جوش صاحب نے کوئی دو گھنٹے تک رباعیاں سنائیں۔ سبحان اللہ۔ اس طرح ہمیں اُردو کے دو عظیم شعرا کے قریب بیٹھنے اور ان کا کلام سننے کا موقع مل گیا۔

ایم اے کے دوسرے سال ہمیں کالج یونین کا انتخاب لڑنے کا شوق ہوا۔ ہمارے مقابلہ پر فارسی کے غلام عباس تھے جنہیں نہ تقریر کرنا آتی تھی نہ شاعر تھے بس امیدوار تھے۔ بڑا سخت مقابلہ ہوا آخر ہم صرف ایک ووٹ سے ہار گئے۔ قبلہ وقار صاحب نے نتیجہ کا اعلان کیا تو میر کا شعر پڑھا:

”شکست و فتح نصیبوں سے ہے و لے اے میر۔ مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا“

بلا کر گلے سے لگایا اور دیر تک سینے سے لگائے رکھا۔ انجمن اُردو کے انتخاب میں ہم پہلے ہی کامیاب ہو چکے تھے اسی کو ہم نے غنیمت جانا۔ البتہ اورینٹل کالج میں جو

بین الکلیاتی مباحثہ ہم کروانے کی آرزو رکھتے تھے وہ دل میں رہ گئی۔ ہماری انجمن اُردو کی سیکرٹری شبنم عابد علی تھیں۔ سید عبداللہ صاحب مصر تھے کہ سٹیج پر بیٹھتے ہوئے وہ دوپٹہ سر پر رکھیں مگر شبنم مان کے نہیں دیتی تھیں۔ مدتوں بعد ضیأالحق کے زمانے میں انہیں سر پر دوپٹہ اوڑھے مشاعرہ پڑھتے دیکھا تو اورینٹل کالج یاد آیا مگر شبنم عابد علی بھی تو شبنم شکیل بن چکی تھیں اور شکیل صاحب سرکاری ملازم تھے۔

ایم اے میں ہم نے فرسٹ کلاس حاصل کی اور کالج میں اول رہے۔ اس سال گورڈن کالج راولپنڈی سے فتح محمد ملک نے امتحان دیا تھا وہ اول تھے میں دوسرے نمبر پر تھا۔ سب اساتذہ نے خوشی کا اظہار کیا کہ کالج کے دو طلبا نے فرسٹ کلاس حاصل کی ہے دوسرے طالب علم اسرار احمد تھے (جو بعد کو گورنمنٹ کالج سے پروفیسر ہو کر ریٹائر ہوئے)۔ قبلہ وقار صاحب نے فرمایا بیٹا پی ایچ ڈی کے لئے کمر بستہ ہو جاؤ۔ چنانچہ میں نے کچھ عرصہ کے اندر قبلہ کی نگرانی میں اپنا سائناپسس تیار کر لیا اور کچھ مہینوں میں بورڈ آف سٹڈیز نے منظور کر کے ہمیں پی ایچ ڈی سکالر بنا دیا اپنے گروپ میں صرف ہمیں پی ایچ ڈی کرنے کی توفیق ملی۔ فالحمدللہ علیٰ ذالک۔ ہمارے پی ایچ ڈی کے مقالہ کے ایک خارجی ممتحن جناب محمد حسن عسکری تھے۔ آپ نے لکھا کہ مقالہ ڈگری کے قابل ہے مگر اس کا پہلا فقرہ ہی زندقہ کے زمرہ میں آتا ہے جب تک یہ فقرہ قلمزد نہ ہو ڈگری جاری نہ کی جائے۔ وہ فقرہ تھا ''خدا جنت فرشتے انسان سب زندگی کا حصہ ہیں۔'' یونیورسٹی کی طرف سے ہمیں خط ملا کہ یہ فقرہ قلمزد کریں تا کہ آپ کے نتیجہ کا اعلان کیا جا سکے۔ ہم وقار صاحب کے پاس پہنچے۔ یونیورسٹی کا خط دکھایا پریشانی کا اظہار کیا۔ وقار صاحب اسی وقت ہمارے ساتھ پروفیسر حمید احمد خاں وائس چانسلر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خط دکھایا۔

CS CamScanner

خان صاحب نے متعلقہ محکمہ سے ہمارا مقالہ منگوایا خارجی ممتحن کی رائے پڑھی مسکرائے فرمایا میرے سامنے اپنے نگران کی موجودگی میں یہ فقرہ قلمزد کر دیجئے۔ ہم نے تعمیل کی فقرہ قلمزد کر دیا قبلہ وقار صاحب نے تصدیق فرمائی کہ میری اور وائس چانسلر کی موجودگی میں فقرہ قلمزد کر دیا گیا ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں نے فرمایا۔ ایک دو دن میں آپ کو نتیجہ کی اطلاع مل جائیگی۔ دو دن کے بعد ان کے دستخط سے خط ملا کہ آپ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری جاری کر دی گئی ہے مبارک ہو۔ یہ تھی سید وقار عظیم اور حمید احمد خان دونوں کی مہربانی! ورنہ مروجہ طور طریقوں سے خط و کتابت میں مہینوں لگ جاتے۔

ہماری کلاس میں ایک ہمہ صفت موصوف طالب علم تھے سلیم رفیق۔ انہیں اساتذہ کی نقل کرنے کا شوق تھا وہ نقل بھی کمال کی اتارتے تھے مگر وقار صاحب کی نقل اتارنے سے عاجز تھے۔ کہتے تھے ان جیسی ملائمت کہاں سے لاؤں؟ عبادت صاحب کی نقل تو ایسی کمال کی اتارتے تھے کہ ان کے بھائی نبوت یار خاں اور بہن نسیم جو دونوں ہماری کلاس میں تھے نہ پہچان پاتے تھے کہ سلیم رفیق بول رہا ہے یا عبادت صاحب لیکچر دے رہے ہیں۔

سید وقار عظیم محنتی آدمی تھے کالج کا کام پھر ادارہ تالیف و ترجمہ کا کام پھر رائٹرز گلڈ کا بکھیڑا۔ پتہ نہیں کیا کیا روگ ان کی جان ناتواں کو لگے ہوئے تھے مگر وہ خندہ پیشانی سے ہر کام کئے جاتے تھے کسی نے ان کو تھکتے نہیں دیکھا۔ درجنوں پی ایچ ڈی سکالر ان کے ساتھ کام کر رہے تھے کسی کو بے اعتنائی یا عدم توجہ کا شکوہ کرتے دیکھا نہ سنا۔ جو بھی ملتا یہی تاثر لے کر اٹھتا کہ جیسے وہی ان سے قریب تر اور ان کو عزیز تر ہے۔ ان سے ملنے کو وقت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی جب جی چاہا چلے گئے صرف اس بات کا خیال رکھنا ضروری تھا کہ ان کے آرام کا وقت نہ ہو۔ ملتے تو ایسے خندہ پیشانی سے

ملتے جیسے آپ ہی کے انتظار میں بیٹھے ہوں۔

وقار صاحب حلقہ ء ارباب ذوق میں نہیں جاتے تھے نہ اس قسم کی دوسری تقریبات میں شرکت فرماتے تھے مگر ان کے گھر پر ایسی تقریبات ہوتی رہتی تھیں۔ ان کے شاعر دوست تشریف لاتے تو ان کے اعزاز میں اپنے گھر ہی میں نشست برپا کرتے اور مقامی شعراء کو مدعو کر لیتے۔ ہم نے کالج میں مشاعرہ کرنے کی اجازت مانگی تو فرمایا نہیں مشاعروں میں ہڑبونگ بہت ہوتی ہے ہاں چھوٹی نشست ہو تو کوئی ہرج نہیں۔ اور جوش صاحب والی نشست کا میں ذکر کر چکا ہوں جو خود ان کے ایماء سے منعقد ہوئی تھی۔ ہمارے ہاں کی ادبی نشستوں میں شرکت ہی نہ فرماتے باقاعدہ بچوں کو تنقید کرنے کے آداب بھی سمجھاتے۔ ربوہ آتے ہوئے چنیوٹ رستہ میں پڑتا تھا مگر کبھی وہاں نہ رکتے فرماتے منزل پر پہنچنا ضروری ہے چنیوٹ آنا ہوگا تو علیحدہ سے آئیں گے۔ قبلہ شیخ عطاءاللہ اور ڈاکٹر عبیداللہ خاں انہیں ملنے کو ربوہ آ جاتے تھے۔ یہی حال عبادت صاحب کا تھا ان کے تو عزیز بھی چنیوٹ میں رہتے تھے مگر وہ بھی سفر قطع نہیں کرتے تھے۔ یہ ان بزرگوں کی وضع داریاں تھیں جو ان کے ساتھ گئیں۔ غرض سیّد وقار عظیم کی شخصیت من موہنی تھی جو بھی ان سے ملتا انہی کا ہو کر رہ جاتا۔ ہمارے تو وہ اُستاد تھے اور محسن ہم تو ان کے احسان مند ہیں ہم نے بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو صرف ایک آدھ بار وقار صاحب سے ملے ہیں مگر مدت العمر ان کے اوصاف کے باب میں رطب اللسان رہے ہیں۔ ایسے انسان روز روز پیدا نہیں ہوتے۔

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

دُھند میں چلتا آدمی

احمد عقیل روبی

میں جن دنوں کی بات کر رہا ہوں اُن دنوں زندگی اپنے فطری حُسن اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ چلتی پھرتی تھی۔ اُس کی ابھی بناوٹی دوشالوں اور ملبوسات سے شناسائی نہیں ہوئی تھی۔ 5 روپے میں شریف آدمی پورا لاہور گھوم پھر لیتا تھا۔ رکشے کا کرایہ 20 پیسے فی کلومیٹر تھا۔ تانگہ کا کرایہ 12 آنے گھنٹہ، دوسرا گھنٹہ 8 آنے اور پھر اسی طرح تانگہ چلتا رہتا تھا اور پیدل چلنے والے اُسے تانگے میں بیٹھا دیکھ کر اُس پر رشک کرتے تھے۔

میں 1962ء میں لاہور آیا۔ ملتان سے نکلا۔ ناصر کاظمی کی معرفت اورینٹل کالج میں پہنچا اور پروفیسر سجاد باقر رضوی اور ناصر کاظمی کے درمیان کھڈی کے شٹل کی طرح دائیں سے بائیں دوڑتا پھرتا رہا۔ اس دوران میں کئی نامور لوگوں سے نیاز حاصل کیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ناظر حسن زیدی، افتخار صدیقی، ڈاکٹر سیّد عبداللہ اور سیّد وقار عظیم سے تعلق رہا۔

سیّد وقار عظیم اور مولانا الطاف حسین حالی میں داڑھی اور ٹوپی کا فرق تھا۔ باقی بہت سی چیزیں دونوں میں مشترک تھیں۔

سیّد وقار عظیم کی میرے سب بڑے عزت کرتے تھے اور انہوں نے مجھے اُن کی عزت کرنا سکھائی۔ سجاد باقر رضوی، وقار صاحب سے دو قدم پیچھے چلتے۔

باقر صاحب کا قد چھوٹا تھا۔ تکریم میں جھک کر چلتے تو قد اور بھی چھوٹا ہو جاتا تھا۔ کئی دفعہ چلتے چلتے وقار صاحب مفلر گلے میں ڈال کر دائیں طرف دیکھ کر پوچھتے:

"باقر صاحب آپ کہاں ہیں؟"

تو باقر صاحب آگے ہو کر کہتے:

"میں یہاں ہوں وقار صاحب۔"

ناصر کاظمی اور باقر صاحب نے وقار صاحب کا ذکر اتنی عزت اور احترام سے کیا کہ میں گھبرا گیا اور اُن کے پاس جانے میں بہت تاخیر سے کام لیا۔ اور جب انتظار حسین صاحب نے انہیں مسلسل احترام دیا تو تاخیر میں اور دیر ہو گئی۔ بہر حال اُن کی کلاس میں باقاعدہ جاتا رہا اور دھیمے لہجے میں اترتے علم کو اپنی جھولی میں احترام سے رکھا۔

وقار عظیم ہمیں دو پرچے پڑھاتے تھے۔ پڑھاتے ہوئے طالب علموں کی آنکھ سے آنکھ نہیں ملاتے تھے۔ بات کرتے ہوئے نظر طالب علموں کے سر پر سے گزر جاتی۔ نپے تلے لفظ، ڈھلے ڈھلائے فقرے۔ ارنسٹ ہیمنگوے کہا کرتا تھا: "فقرہ ہمیشہ چھوٹا ہونا چاہیے اور آسان الفاظ کی بندش والا ہونا چاہیے۔ سننے والا جلد گرفت میں آتا ہے۔"

وقار صاحب کے فقرے بھی بہت چھوٹے ہوتے تھے۔ مثلاً مثنوی پڑھاتے ہوئے وہ کچھ ایسی گفتگو کرتے تھے:

"شہزادہ آیا۔ شہزادی کو دیکھا۔ شہزادی شرمائی۔ سمٹ کر چھوئی موئی بن گئی۔ شہزادہ آگے بڑھا۔ شہزادی چھپر کھٹ پر سمٹ گئی۔ شہزادہ اور قریب گیا۔"

یہ کہہ کر رک گئے۔ پھر بولے:

"پھر کیا ہوا؟"

لڑکے اور لڑکیاں بہت مایوس ہوئے۔ وقار صاحب کی طرف دیکھا۔

وقار صاحب مسکرا کر بولے:

''یہ کل دیکھیں گے۔''

میرے دو دوست مرحوم انوار انجم اور سلیم بے تاب، وقار صاحب کے بہت قریب تھے۔ وہ جب بھی وقار صاحب کے پاس جاتے میں ساتھ ہوتا تھا۔ وہ باتیں کرتے رہتے تھے۔ میں خاموشی سے سُنتا رہتا تھا۔ ایک بار وقار صاحب نے میری طرف دیکھ کر کہا:

''یہ کچھ نہیں بولتے۔''

انوار انجم نے کہا: ''بولتے ہیں۔''

وقار صاحب کہنے لگے: ''صرف ترنم میں بولتے ہیں۔''

میں ترنم میں غزل پڑھتا تھا۔ اور میرا ترنم بقول شخصے بہت زوردار تھا۔ اور اس زوردار ترنم کی زد میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ بھی آ چکے تھے۔ عبداللہ صاحب سے ایک بار میں ناراض ہو گیا (یہ سیّد صاحب نے کہا تھا) یہ ناراضی جائز تھی۔ ہاسٹل کے واجبات کے سلسلے میں ہوسٹل وارڈن نے میرا سامان کمرے سے نکال کر باہر رکھ دیا۔ باقر صاحب دوڑے۔ سیّد صاحب سے ملے۔ سیّد صاحب نے کہا:

''سامان اندر سے باہر اور باہر سے اندر رکھنے کا اختیار میرا نہیں وارڈن کا ہے۔''

سامان تو خیر باہر سے اندر چلا گیا، میں سیّد صاحب سے ناراض ہو گیا۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ صاحب کو میری ایک غزل بہت پسند تھی۔ اس کی بڑی وجہ میرا ترنم تھا اور بقول سیّد صاحب شاعری بھی اچھی تھی۔ ایک بار کلاس میں ولی دکنی پڑھاتے ہوئے ولی کا شعر پڑھا:

ولی اُس گوہر کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی
میرے گھر اس طرح آوے ہے جوں سینے میں راز آوے

ولی کا شعر پڑھ کر کہنے لگے:

''اب ہمارے ایک خوش گلو شاعر کا شعر بھی سُنیں:''

نہ کوئی شور، نہ آہٹ، نہ کوئی ہنگامہ
یہ کون آج میرے دل میں آ گیا چپ چاپ

یہ میرا شعر تھا اور میں دو چار دن خوش و خرم پھرتا رہا اور پانچویں دن میرا سامان کمرے سے باہر رکھ دیا گیا اور میں سید صاحب سے ناراض ہو گیا۔ ناراضی کے ٹھیک چار دن بعد مشرقی پاکستان سے پروفیسر عندلیب شادانی لاہور آئے۔ سید صاحب نے انہیں گھر کھانے پر بلوایا۔ سید صاحب میری غزل اور ترنم کو پسند کرتے تھے۔ وہ مجھے بھی گھر بلانا چاہتے تھے لیکن راستے میں ناراضی کا پتھر رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ سید صاحب بیگم صاحبہ کے ساتھ ہاسٹل میں آ گئے۔ راج خاکروب کو کہا: ''عقیل روبی کو بلواؤ۔''

راج بھاگا ہوا میرے کمرے میں آ گیا۔ اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ کہنے لگا:

''روبی بادشاہ! نیچے سید صاحب آئے ہیں۔''

میں ہڑ بڑا کر اٹھا اور نیچے آ گیا۔ سلام کیا اور کہا: ''حکم؟''

سیّد صاحب نے بیگم صاحبہ سے کہا:

''یہ ہم سے ناراض ہیں۔ انہیں ہماری طرف سے کھانے کی دعوت دے دیجیے۔ اگر آ جائیں تو مہربانی ہو گی۔''

میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے سیّد صاحب کا ہاتھ پکڑا اور

چوم لیا: ''میں سر کے بل آؤں گا۔''

سیّد صاحب کے گھر کھانے کے بعد شاعری کا دور شروع ہوا۔ شادانی صاحب شعر کہتے تھے۔ اُن سے پہلے مجھے خاص غزل سُنانے کے لئے کہا گیا۔ میں نے غزل پڑھی۔ وقار صاحب میرے ساتھ بیٹھے تھے۔ جب میں نے مقطع پڑھا:

تمہاری یاد کی مشعل سے اب تلک روبی
بنا رہا ہوں اندھیروں میں راستہ چپ چاپ

پہلا مصرعہ پڑھتے ہوئے میں نے مشعل پر ''زبر'' دے دی۔ وقار صاحب میرے کان کے قریب ہو کر کہنے لگے:

''مَشعل نہیں مِشعل۔''

میں نے فوراً مصرعہ دُہرایا اور مشعل پر زیر دے دی۔ وقار صاحب نے اپنا ہاتھ میرے کاندھے پر رکھ دیا۔ جس کی حرارت شاید آج تک میں محسوس کر رہا ہوں۔

گئے دن ہمیشہ اچھے اور رنگین دن ہوتے ہیں اور اُن کی یادیں اُن دِنوں سے بھی اچھی۔ زمانہ حال میں ماضی کا یہ رنگین سرمایہ حبس زدہ ماحول میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بن جاتا ہے۔ ان گئے دِنوں کی شرارتیں اب بھی دل و دماغ میں یوں سرسراتی ہیں کہ ساری اُلجھنیں دم توڑ دیتی ہیں۔ لاء کالج اور یونیورسٹی کے طالب علموں کی آپس میں بہت لگتی تھی۔ پڑھائی اور شرارتوں میں وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے بازی لینے میں سرگرم رہتے تھے۔ یکم اپریل بہت تیاری کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ ایک سال یونیورسٹی کے لڑکوں نے یونیورسٹی کی چھت پر گدھا چڑھا دیا۔ رسوں کی مدد سے گدھا کیسے اوپر گیا یہ بات چڑھانے والے ہی جانتے ہیں.... لاء کالج کے لڑکے آنے والے سال کا انتظار کرتے رہے۔ نیا سال آیا تو میٹنگ میں یہ طے ہوا کہ گاڑی اُوپر چڑھائی جائے۔ چنانچہ

طفیل محترم (جو لاء کالج کی کینٹین چلاتے تھے) کی مدد سے ایک فوکسی لائی گئی۔ اور پھر ساری گاڑی نیچے کھولی گئی اور مستری کی مدد سے چھت پر جا کر دوبارہ جوڑی گئی۔ دن طلوع ہوا تو چھت پر گاڑی سٹارٹ کر دی گئی اور دیکھنے والوں کا ایک ہجوم نیچے کھڑا اُس گاڑی کو دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ حیران ہونے والوں میں سید وقار عظیم بھی تھے۔ میں ساتھ کھڑا تھا۔ مجھ سے پوچھنے لگے:

"یہ سب کیسے ہو گیا بھئی۔"

میں نے کہا: "وقار صاحب پہلے ساری گاڑی پرزہ پرزہ کی گئی پھر پرزے اوپر لے جا کر جوڑ دیئے گئے۔"

"واہ۔ واہ۔ یہ تو بڑا کام ہے۔ یہ صرف لاء کالج کے لڑکے ہی کر سکتے ہیں۔"

"نہیں وقار صاحب۔ اورینٹل کالج کے لڑکے بھی کر سکتے ہیں۔"

طفیل محترم نے کہا۔

"وہ کیسے محترم صاحب؟" وقار صاحب بولے۔

یہ جو گاڑی کا ہارن ہے ناں، بھوں بھوں، یہ ہارن اُوپر عقیل روبی لے کر گیا تھا۔"

وقار صاحب نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر چلے گئے۔

وقار صاحب بہت کم گو تھے۔ مطلب کی بات کرتے تھے اور بہت مختصراً۔ میں نے کبھی اُنہیں غصے میں نہیں دیکھا اگر کبھی کسی طالب علم پر ناراض بھی ہوتے تھے تو ناراضی کا اظہار چند لمحوں کے لیے کرتے اور پھر کہتے:

"آپ جائیے"۔

میرے ساتھ ایک بار اُنہوں نے ناراضی کا اظہار بہت خاموشی سے کیا۔ اتنی خاموشی سے کہ مجھے بھی خبر نہ ہوئی۔ افسانے کا امتحان ہوا۔ میں نے پرچہ حل کیا۔ 5 سوال تھے صرف

ایک سوال کا جواب دیا۔ دماغ میں یہ تھا کہ وقار صاحب منٹو پر میرا یہ مضمون نما مقالہ پڑھ کر بہت خوش ہوں گے۔ امتحان کے بعد وہ پرچے طلباء اور طالبات کو واپس کر رہے تھے۔ سب کے پرچے واپس کر دیئے۔ میز پر صرف ایک پرچہ رہ گیا اور وہ میرا پرچہ تھا۔ میری طرف دیکھا اور آنکھ کے اشارے سے مجھے بلایا۔ میں اُٹھ کر قریب گیا۔ اور پرچے کی طرف اشارہ کر کے دھیمے الفاظ میں کہا: ”آپ پرچے میں فیل ہیں۔ اس لیے کہ ایک سوال کے صرف 20 نمبر تھے۔ میں نے 20 دے دیئے۔ 40 نہیں دے سکتا تھا۔ سالانہ امتحان میں یہ حماقت نہ کیجیے گا۔ جائیے، پرچہ میرے پاس رہے گا۔ آپ کو دے دیا تو آپ کے دوست دیکھ لیں گے۔ ’’

علی گڑھ کٹ پاجامہ، شیروانی اور گلے میں مفلر، وقار صاحب کا پسندیدہ لباس تھا۔ میں نے اُنہیں اس کے علاوہ کسی اور لباس میں نہیں دیکھا۔ ان کی ساری شخصیت ان تین کپڑوں میں رچی بسی تھی۔ اپنی اس شخصیت سے انہوں نے بڑے بڑے معرکے سرانجام دیئے اور بڑے بڑے معرکوں میں ثابت قدم رہے۔ اورینٹل کالج میں ایک گروپ ان کے خلاف بھی سرگرم رہا۔ کسی جائیداد، زمین یا گھر یا محل میناروں کا جھگڑا نہ تھا بس نظریات یا پالیسیوں کی جنگ تھی۔ وقار صاحب نے اپنی نرم طبیعت اور وضع داری کو ڈھال بنا کر ان کا مقابلہ کیا اور ثابت کیا کہ جنگیں شور اور غل غپاڑہ مچا کر نہیں جیتی جاتیں۔ ٹھنڈے سبھاؤ اور شانتی سے بھی جیتی جاتی ہیں۔

میں نے 1964ء میں ایم اے کا امتحان دیا 1965ء میں رزلٹ آیا۔ اس کے بعد پبلک سروس کمیشن کا امتحان دیا کامیابی نہ ہوئی۔ سجاد باقر رضوی اور ناصر کاظمی ٹی۔ ہاؤس میں مجھے لے کر بیٹھ گئے۔ سجاد باقر رضوی نے کہا:

’’عقیل روبی تمہاری فرسٹ کلاس جعلی تو نہیں؟‘‘

CS CamScanner

ناصر کاظمی نے حسبِ معمول سگریٹ کی راکھ چائے کی پیالی میں پھینک کر کہا:

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ مغربی ادب کے کونے کونے میں گھومنے پھرنے والے کی فرسٹ کلاس جعلی کیسے ہوسکتی ہے۔''

''تو پھر یہ پبلک سروس کمیشن میں ناکام کیسے ہوگیا؟''

ناصر کاظمی نے کہا: ''ناکامیابی جہالت کی نشانی تونہیں۔''

''میں اس سال پھر انٹرویو دے رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے، اس سال سیّد وقار عظیم انٹرویو میں بیٹھیں گے۔ اُن سے کہتے ہیں' معاملات کا خیال کریں۔''

میں سر جھکائے دونوں کے ساتھ سیّد وقار عظیم کے پاس چلا گیا۔

سجاد باقر رضوی، وقار صاحب سے کہنے لگے:

''اس سال عقیل روبی پبلک سروس کمیشن کا امتحان دے رہا ہے۔ وقار صاحب آپ ذرا اس کا خیال رکھئے گا۔''

وقار صاحب نے حسبِ معمول دھیمے لہجے میں مسکرا کر کہا:

''یہ تو اپنا خیال خود رکھ سکتے ہیں۔ میں ان کا خیال کیا رکھوں۔''

''پچھلے سال انہوں نے اپنا خیال خود رکھا۔ ناکام ہو گئے۔ اِس سال خیال آپ ہی رکھیئے۔'' ناصر کاظمی بولے۔

دوسرے دن میں انٹرویو دینے شملہ پہاڑی کمیشن کے دفتر میں چلا گیا۔ سبجیکٹ کے ممبر سیّد وقار عظیم تھے۔ صدارت کی کرسی پر والئی سوات، صدر ایوب خان کے داماد اورنگزیب تھے۔ میں جا کر اُن کے سامنے بیٹھا تو میرے ہاتھ میں میری

پہلی شاعری کی کتاب "سوکھے پتے بکھرے پھول" تھی۔ اورنگزیب کہنے لگے:

''یہ کیا ہے۔''

''یہ میری شاعری کی کتاب ہے۔''

''دکھائیے''۔

میں نے کتاب ان کو پیش کردی۔ انہوں نے پہلا ورق پلٹا تو فرانسیسی دانشور روسو کی دو سطروں پر اُن کی نظر ٹھہر گئی۔ میں نے یہ سطریں روسو کی سوانح عمری سے لی تھیں اورنگزیب کو شاید روسو بہت پسند تھا۔ میری طرف دیکھ کر بولے:

''آپ نے پڑھا ہے روسو کو؟''

''جی تھوڑا بہت پڑھا ہے۔''

''کیا کیا پڑھا ہے؟''

میں نے وقار صاحب کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اجازت دے کر کہا:

''ہاں، ہاں بتلائیے۔ انہوں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے۔''

میں نے وقار صاحب کی اجازت پا کر روسو کے بارے میں بات چیت شروع کردی۔ نیچر کے بارے میں اُس کے خیالات، تعلیم کے بارے میں اُس کے نظریات، سوانح عمری میں لکھی چونکا دینے والی باتیں۔ اُس کے بے شمار عشق اور والٹیئر سے اُس کی نوک جھونک۔ پورے 25 منٹ میں اُلٹی سیدھی باتیں کرتا رہا جو اورنگزیب کو بہت پسند آئیں اور وہ ہاتھ میری طرف بڑھا کر کہنے لگے:

''بہت خوب۔ آپ جا سکتے ہیں۔''

میں اُٹھنے ہی والا تھا کہ سید وقار عظیم مسکرا کر کہنے لگے:

''اورنگزیب صاحب۔ یہ ایم اے اُردو میں سلیکشن کے لیے آئے ہیں۔ سارا فرانس زیرِ بحث آ گیا۔ ان سے اُردو کی تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔''

بات بالکل ٹھیک تھی۔ اورنگزیب صاحب نے وقار صاحب کی طرف دیکھا اور کہا:

''آپ سوال پوچھیے۔''

وقار صاحب نے اپنا مفلر درست کیا اور کہا:

''بہت دیر ہو گئی ابھی اور بھی امیدوار ہیں۔ میں غالب کا ایک شعر پڑھتا ہوں۔''

اور پھر وقار صاحب نے مرزا غالب کا یہ شعر پڑھا۔

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں دو چار ہوں تو پھر کیا ہو

میں نے کہا: ''جی سُن لیا میں نے شعر۔''

''تو پھر بتایئے 'دو چار ہوں ہے یا دو ایک ہوں ہے؟''

میں اچانک یہ سُن کر چکرا گیا۔ اُلجھن میں پڑ گیا کہ درست دو چار ہے یا دو ایک۔ میری خوش قسمتی کہ اورنگزیب درمیان میں آ گئے۔ بات وقار صاحب اور اورنگزیب کے درمیان ہونے لگی۔ میں بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر پتہ نہیں دونوں میں سے کسی ایک نے کہا:

''ٹھیک ہے آپ جایئے۔''

میں فوراً باہر آ گیا۔ میں نے جو جواب سوچا تھا وہ بالکل غلط تھا۔ اس سال میں انٹرویو میں کامیاب ہو گیا اور میری دوسری پوزیشن آئی۔ میں خوش تھا کہ فرانسیسی دانش ور نے میری جان بچالی۔

سیّد وقار عظیم سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔ بعد میں اُن سے کئی بار ملاقات ہوئی لیکن دُور دُور سے جو صرف سلام تک محدود تھی۔ آمنے سامنے بیٹھ کر مکالمہ نہیں ہوا۔ وہ اپنی قسم کے مثالی آدمی تھے۔

سیّد وقار عظیم آج ہم میں نہیں۔ مگر اُن کے نرم دھیمے لب و لہجہ اور گفتگو کی سرگوشیاں کبھی کبھی کانوں میں سرسراتی ضرور ہیں۔ وقار صاحب نے زندگی کا سفر بہت محتاط اور سست قدموں سے طے کیا۔ بالکل اُس شریف محتاط اور مہذب آدمی کی طرح جو دُھند میں بہت سلیقے سے نپے تلے قدموں سے چلتا ہے تاکہ کہیں ٹھوکر نہ کھا جائے۔ کوئی اُس سے ٹکرا نہ جائے۔ اُس کے پیروں تلے کوئی روندا نہ جائے۔ اور پھر وہ بڑی ہنرمندی سے اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ وقار صاحب نے ساری زندگی کچھ ایسا ہی کیا اور میر تقی میر کے شعر پر عمل کیا:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اِس کارگہہ شیشہ گری کا

* * *

وقار عظیم صاحب ایک ایسے ادیب تھے جو فکشن کے اوپر بڑی اچھی رائے رکھتے تھے اور ان کی نظر میں داستانوں سے لے کر ناولوں اور افسانوں تک ایک بہت وسیع اور سیر حاصل منظر نامہ موجود تھا۔
اُنہوں نے نہ صرف طلبہ کی رہنمائی کی بلکہ اُردو ادب کے قارئین کو جو فائدہ پہنچایا وہ آج بھی مستند حوالوں کے لحاظ سے زندہ ہے اور آئندہ بھی زندہ رہے گا۔

ڈاکٹر آغا سہیل

* * *

CS CamScanner

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

وقار عظیم صاحب

پروفیسر نظیر صدیقی

وقار عظیم صاحب کا نام پہلے پہل میں نے اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں سُنا اور دیکھا۔ وہ اس زمانے میں رسالہ ''آج کل'' دہلی کے ایڈیٹر تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب میرا طالب علمانہ ذہن انسان کی تمام قسموں میں ادیبوں، پروفیسرز اور ایڈیٹرز کو سب سے زیادہ قابل احترام سمجھنے لگا تھا۔ یہ تصور مجھے نہ تو ورثے میں ملا تھا نہ میرے ماحول نے مجھے دیا تھا۔ نہ جانے یہ تصور میرے ذہن میں کہاں سے آ گیا تھا۔ بہر حال میں ان تمام لوگوں کو جو ادیب یا پروفیسر یا ایڈیٹر ہوتے تھے۔ انتہائی رشک کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور حد درجہ خوش نصیب سمجھتا تھا۔ ان تینوں طبقوں کے متعلق میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ یہ لوگ علم وفضل کا مجسمہ ہوتے ہیں اور دنیا میں علم وفضل سے بڑھ کر کوئی اور شے قابلِ احترام نہیں ہے۔

ابھی میں اسکول ہی کا طالب علم تھا کہ رسالہ ''آج کل'' دہلی میں سیّد وقار عظیم کی جگہ یعقوب دواشی کا نام آ گیا۔ اور وقار عظیم صاحب کسی کسی رسالے میں محض ایک مضمون نگار کی حیثیت سے نظر آنے لگے۔ یہ باتیں 1940ء اور 1946ء کے درمیان کی ہیں۔ اگست 1947ء میں پاکستان بن گیا۔ جون 1948ء میں جب میں گورکھپور میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان دے کر ڈھاکے آیا تو اس

زمانے میں، میں نے وقار عظیم صاحب کا نام پھر ایک مرتبہ ایڈیٹر کی حیثیت سے ''ماہِ نو'' کراچی میں دیکھا۔ کچھ عرصے کے بعد ''ماہِ نو'' میں بھی وقار عظیم کی جگہ حسن عسکری کا نام آگیا۔ اور جب حسن عسکری صاحب نے اپنی ادارت میں شائع ہونے والے پہلے پرچے کے اداریے میں وقار عظیم صاحب کی مدیرانہ خدمات کو خراج تحسین پیش کیا تو چونکہ میں اس وقت تک حسن عسکری صاحب کا بڑا پرستار بن چکا تھا۔ اس لئے ان کے خراجِ تحسین کی بناء پر میرے دل میں وقار عظیم صاحب کی وقعت اور بڑھ گئی۔ وقار عظیم صاحب ''ماہِ نو'' کی ادارت سے سبک دوش ہو کر اور کراچی سے نکل کر پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں جا پہنچے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے ''نقوش'' کی ادارت بھی سنبھال لی تھی۔ اب ان کی ذات میں۔ وہ تینوں حیثیتیں جمع ہو گئی تھیں۔ جنہیں میں حد درجہ رشک اور احترام سے دیکھتا تھا۔ یعنی وقار عظیم ادیب تو تھے ہی اب نہ صرف پروفیسر (اُردو میں لیکچرار کو بھی تعظیماً پروفیسر ہی کہتے ہیں) بن چکے تھے بلکہ ادیب اور پروفیسر ہونے کے علاوہ ایڈیٹر بھی۔ اس زمانے میں شاید ہی کوئی اچھا رسالہ ایسا ہو جس کے ہر تیسرے شمارے میں وقار عظیم کا کوئی نہ کوئی مضمون نہ چھپتا ہو۔ میں ہر کثرت نگار ادیب اور پر گو شاعر کو حیرت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ جب میری سمجھ میں کچھ اضافہ ہوا تو میں ایسوں کو افسوس کی نظر سے دیکھنے لگا۔

جنوری 1950ء میں جب میں بی اے کا طالب علم تھا مجھ سے ایک عجیب حرکت سرزد ہوئی۔ اس زمانے میں معیاری اور ممتاز رسالوں میں ''ادبِ لطیف'' (لاہور) بھی تھا۔ جس کی امتیازی حیثیت نسبتاً زیادہ پرانی تھی۔ اس زمانے میں اس

کے ایڈیٹر میرزا ادیب تھے۔ ''ادبِ لطیف'' کے ایک پرچے میں ایک نئے شاعر کی ایک غزل دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ایسی بے جان غزل "ادبِ لطیف" میں کیونکر جگہ پا گئی۔ اس حیرت اور کوفت کے دوسرے دن جب صبح کے وقت میری آنکھ کھلی تو اس مایوس کن غزل کی زمین میں قافیوں کی تبدیلی کے ساتھ ایک مطلع میرے ذہن میں آ گیا:

ہمدم ابھی نہ چھیڑ مہ وکہکشاں کی بات
فرصت زمیں سے ہو تو کریں آسماں کی بات

اس مطلع نے مجھ سے کچھ اور شعر کہلوا لئے۔ اس طرح میری پہلی غزل وجود میں آئی۔ جب میں نے اپنی غزل کا ''ادبِ لطیف'' والی غزل سے مقابلہ کیا تو دل نے کہا کہ اگر ''ادبِ لطیف'' والی غزل 'ادبِ لطیف' میں شائع ہو سکتی تھی تو کوئی وجہ نہیں کہ اس میں میری غزل شائع نہ ہو سکے۔ میری غزل یقیناً بدرجہا بہتر ہے اور اگر یہ غزل چھپ گئی۔ تو 'ادبِ لطیف' میں چھپنے والے غزل گو کو معلوم ہو جائے گا کہ

دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

چنانچہ میں نے اپنی غزل میرزا ادیب صاحب کی خدمت میں بھیج دی۔ ان کا خط آیا کہ غزل کا شکریہ۔ لیکن بعض وجوہ کی بنا پر ہم اسے شائع کرنے سے معذور ہیں۔ دل نے اس معذرت پر یہ تبصرہ کیا کہ

سخن شناس نہ ای دلبرا خطا ایں جاست

اس زمانے میں اوم پرکاش پنڈت کی ادارت میں دلی سے ایک معیاری

رسالہ نکلتا تھا جو ترقی پسندوں کا ترجمان تھا۔ اس وقت رسالے کا نام یاد نہیں آ رہا ہے۔ میں نے اپنی غزل اس رسالے کو بھیج دی۔ وہاں سے بھی ٹکا سا جواب آ گیا کہ اس غزل کا شکریہ، لیکن آپ کوئی دوسری غزل بھیج دیں۔ میں نے انہیں دوسری غزل (جو ابھی تک نہیں کہی گئی تھی) بھیجنے کی بجائے وہی غزل اس زمانے کے بہترین رسالہ ''نقوش'' لاہور کے ایڈیٹر سید وقار عظیم کو بھیج دی۔ ایک مدت تک ان کی طرف سے نہ کوئی رسید آئی نہ کوئی جواب۔ اس دوران ایک دوست کے ساتھ مجھے کلکتے اور بمبئی کا سفر کرنا پڑا۔ بمبئی میں ایک دن وہاں کے ایک بک سٹال پر کتابوں کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ نقوش کا تازہ شمارہ نظر آ گیا۔ نا اُمیدی کے ساتھ اس کی ورق گردانی شروع کی تو دیکھا کہ اس میں میری غزل موجود ہے۔ اپنی غزل کو وقت کے ایک نہایت ممتاز رسالے میں دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ لیکن یہ معمہ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہی غزل باقی دو رسالوں کی طرف سے مسترد کیوں کر دی گئی۔ جبکہ ان دو رسالوں کا معیار کسی اعتبار سے ''نقوش'' سے برتر نہ تھا اور خصوصاً جبکہ میری غزل اس غزل سے یقیناً بہتر تھی۔ جس کے جواب میں وہ کہی گئی تھی۔

بہرحال ''نقوش'' میں غزل کی اشاعت کے باوجود نہ تو ''نقوش'' سے میرے تعلقات پیدا ہوئے نہ وقار عظیم صاحب سے، برسوں بعد جب پاکستان رائٹرز گلڈ کا قیام عمل میں آیا اور غالباً اس کا پہلا سالانہ اجلاس ڈھاکے میں ہوا تو پاکستانی ادیبوں کی سب سے بڑی انجمن پاکستان رائٹرز گلڈ کے اس اجلاس کی صدارت کے فرائض وقار عظیم صاحب نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں قرۃ العین حیدر سمیت پاکستان کے بیشتر ممتاز ترین ارباب قلم موجود تھے۔ اُردو، بنگلہ

اور انگریزی میں پڑھے جانے والے مقالات کے بعد جب وقار عظیم صاحب صدارتی تقریر کے لئے مائک پر آئے تو انہوں نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ بڑے سلجھے ہوئے انداز میں اُردو میں تقریر کی۔ اس تقریر کے متعلق مارننگ نیوز ڈھاکہ کے ایک ممتاز صحافی خطیب صاحب جو انگریزی کے شاعر اور ادیب بھی ہیں (نہ جانے ابھی تک وہ ڈھاکے میں ہیں یا اپنے وطن سیلون چلے گئے) اور جو نہایت نازک مزاج نقاد واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آج کے اجلاس کا حاصل صرف وقار عظیم صاحب کی تقریر ہے۔ ورنہ باقی تمام چیزیں بکواس تھیں۔ ممکن ہے یہ رائے مبالغے سے خالی نہ ہو۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ وقار عظیم صاحب کی تقریر اپنے خلوص اور وقت کی مناسبت کے اعتبار سے مؤثر تھی۔ اس اجلاس کے بعد رائٹرز گلڈ کی طرف سے کتابوں کی نمائش بھی منعقد ہوئی تھی۔ ان تقریبات میں وقار عظیم صاحب سے میری صاحب سلامت ضرور ہوئی۔ لیکن تعارف کے بغیر۔

صحیح معنوں میں ان سے میری ملاقات غالباً 1968ء میں ہوئی۔ جب وہ زبانی امتحان کے سلسلے میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی دعوت پر ڈھاکے آئے اور اپنے چھوٹے بھائی پروفیسر اقبال عظیم کے یہاں قیام پذیر ہوئے۔ جب اقبال عظیم صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا تو انہوں نے میرا نام سنتے ہی بڑی مسرت کا اظہار کیا اور فرمایا کہ آپ کی تحریروں سے میری دلچسپی کا حال یہ ہے کہ اگر سفر کے عالم میں بھی مجھے کوئی ایسا رسالہ مل جائے۔ جس میں آپ کا مضمون موجود ہو تو میں باقی لوگوں کو چھوڑ کر سب سے پہلے آپ کا مضمون پڑھ لیتا ہوں۔ ماشاءاللہ آپ کی تحریروں میں۔ اب مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے میری تحریروں پر اظہار خیال

CS CamScanner

کرتے ہوئے کیا کچھ کہا۔ لیکن انہوں نے جس فیاضی اور دیانت داری کے ساتھ کہا اُس کی تمنا تو کی جا سکتی ہے لیکن توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی۔

وقار عظیم صاحب کو جب میں نے اپنی کتاب میرے خیال میں بھیجی تو انہوں نے اس پر ریڈیو پاکستان لاہور سے تبصرہ نشر کیا جو نہ صرف موافقانہ تھا بلکہ مداحانہ بھی۔

ڈھاکے کی اس ملاقات کے بعد جس میں ان سے میرا تعارف صحیح طور پر ہو سکا ان سے تین چار سرسری ملاقاتیں کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں ہوئیں۔ جب میں پہلی مرتبہ لاہور گیا تو وقت کی کمی کے باعث ان سے صرف فون پر گفتگو ہو سکی۔ انہوں نے بے حد اصرار کیا کہ میں ان کے گھر آ کر ملوں۔ میری یہ تمنا دل کی دل ہی میں رہ گئی کہ کبھی لاہور جاؤں تو ان کے گھر جا کر ان سے جی بھر کر مل سکوں۔ جب تک وہ زندہ رہے میں صرف اس بات کے امکان سے اپنے آپ کو مطمئن کرتا رہا کہ ایک دن یہ تمنا پوری ہو ہی جائے گی۔ لیکن جب اچانک ان کے انتقال کی خبر نظر سے گزری تو امید اور امکان کی یہ عمارت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آن کی آن میں ڈھے گئی۔

وقار عظیم صاحب سے میری دیرینہ اور طویل ملاقاتیں نہیں تھیں کہ میں ان کا شخصی خاکہ لکھ سکوں۔ ان کی خامیاں اور کمزوریاں ان کے قریبی جاننے والے جانتے ہوں گے۔ میں نے تو صرف یہ دیکھا اور پایا کہ آدمی بہت خوش مزاج، خوش اخلاق، اور نرم گفتار تھے۔ ان کی شخصیت میں توازن بھی تھا، وقار بھی اور وزن بھی۔ لاہور کے تعلیمی، علمی، ادبی اور ثقافتی حلقوں میں وہ بڑے سے بڑے منصب پر

CS CamScanner

فائض رہے اور اس منصب تک پہنچنے کے لئے انہیں سیاست اور سازش کی راہ کبھی اختیار نہیں کرنی پڑی۔ زندگی میں وہ جس قدر محترم رہے اس سے کہیں زیادہ ان کی موت نے ان کے ہر دل عزیز ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ جب انہیں بچانے کے لئے ٹیلی وژن پر خون کا عطیہ دینے کا اعلان کیا گیا تو ہسپتال میں خون دینے والوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ گئے۔ جن میں بڑے اونچے رتبے کے لوگ بھی موجود تھے۔

مجموعی طور پر ان کے شریف النفس اور شائستہ انسان ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور ادب میں ان سے کسی کو ہزار اختلافات ہوں ان سے ان کا یہ اعزاز نہیں چھینا جا سکتا کہ وہ داستان، ناول اور مختصر افسانے کے پہلے خصوصی نقاد تھے۔ انہوں نے ان اصنافِ ادب کے مطالعے کے لئے اپنی زندگی کا جتنا حصہ صرف کیا اتنا کوئی اور نہ کر سکا۔

سید وقار عظیم ہمارے ان اساتذہ میں شامل ہیں جنہوں نے ایک سے زائد نسلوں کی تربیت کی۔ ان کا خاص مطالعہ فکشن تھی۔ جس میں ہماری کلاسیکی داستانیں، ناول اور جدید افسانہ سبھی کچھ شامل ہے۔ اُنہوں نے ایک طویل عرصے تک طلبہ کی جو تربیت کی تھی اس نے بہت سے نقاد اور افسانہ نویس پیدا کئے۔

شہزاد احمد

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

ڈاکٹر یونس جاوید

پروفیسر حمید احمد خان جب مجلس ترقی ادب کے ناظم ہوئے تھے عین وقت پر دفتر پہنچتے تھے۔ ان کا فرمان تھا کہ نو بجے کا مطلب ہے آٹھ بج کر ساٹھ منٹ۔

اگر کوئی ملاقات پہلے سے طے نہ ہوتی تو دفتر میں ان کا پہلا کام تھا سیّد وقار عظیم کو ٹیلی فون کرنا۔ گزشتہ دن کی تحقیقی گتھیاں اور گرہیں، کسی لفظ کے صحیح تلفظ یا اعراب میں کسی شک کو رفع کرنے کے لئے یہ فون ہوا کرتا تھا۔ وہ غالب اور اقبال کے اشعار کو اس قدر احتیاط اور توجہ سے پڑھتے، درج کرتے اور ان کی صحت کے لئے وقار صاحب کا مشورہ کرنا ان کا روز کا معمول تھا۔ اگر مسلہ حل نہ ہوتا یا توثیق کی ضرورت پیش آتی تو پروفیسر حمید احمد خاں اپنے بڑے بھائی مولانا حامد علی خاں صاحب کو فون کرتے اور ان کی سند یا مشورے کو بعد میں وقار صاحب تک پہنچایا کرتے۔ تب وقار عظیم صاحب دفتر میں موجود نہ ہوتے ہوئے ہمارے درمیان ہوا کرتے تھے۔ پھر ایک روز حمید احمد خاں صاحب صبح نو بجنے میں پندرہ منٹ پر جب دفتر جانے کے لئے بالکل تیار تھے کہ سوا نو بجے ان کی ملاقات مولوی عبداللہ قریشی سے طے تھی یکا یک بے چین ہو گئے کہ وہ وقت پہ دفتر نہیں پہنچ پائیں گے یہی بے قراری انہیں گاڑی سے اُتر کر دوبارہ گھر کے اندر لے آئی۔ پہلے بیٹھے، پھر لیٹ گئے اور پھر ملک عدم کو روانہ ہو گئے۔ جنازے پر قیوم نظر بے چین اس لیے

CS CamScanner

تھے کہ کوئی انہیں بتا نہیں رہا تھا کہ مجلس کا آئندہ ناظم کون ہو گا ؟ مجھ سے وہ تین مرتبہ سرگوشیوں میں سوال کر چکے تھے ۔ میں رنجیدہ ، دکھی ایک طرف کھڑا تھا کہ وزیر اعلیٰ پنجاب محمد حنیف رامے آ گئے ۔ انہوں نے میرے سامنے سیّد وقار عظیم صاحب سے گزارش کی کہ آپ مجلس کو سنبھال لیجیے۔ سید صاحب نے بے حد انکسار سے اثبات کیا تھا۔ رامے کے جانے کے بعد وقار صاحب نے چند ہدایات بھی جاری کیں اور حمید احمد خاں کا ڈیٹا دفتر سے منگوایا۔ اس کام کے لیے میرا ہی انتخاب ہوا۔ تب ساری معلومات میں ہی دفتر میں بیٹھ کر مرتب کرتا رہا۔

شام کے بعد ریڈیو پاکستان لاہور سے حمید احمد خاں پر خصوصی پروگرام براہ راست نشر ہونا قرار پایا ۔ جس میں لا کالج کے پرنسپل پروفیسر امتیاز علی، اسلامیہ کالج سول لائن کے پرنسپل خواجہ اسلم ، انتظار حسین اور میں شامل تھے ۔ یہ نشست ہر چند کے براہ راست تھی مگر اس قدر مربوط اور مکمل تھی کہ اس کی بابت دنوں تک تعریف کی جاتی رہی ۔ بلکہ اخبارات نے بھی اسی گفتگو اور معلومات سے استفادہ کیا تھا اور اپنے اپنے مختصر فیچر مکمل کیے تھے۔

میں کچھ لکھنا چاہ رہا تھا پروفیسر سیّد وقار عظیم صاحب پر بات کدھر سے کہاں چلی گئی۔ یاد کرتا ہوں کہ وقار صاحب سے سب سے پہلی بھرپور ملاقات کہاں ہوئی تھی تو فوراً وہ سہ پہر یاد آ جاتی ہے ۔ کس قدر سحرزدہ ماحول تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اورینٹل کالج میں داخل ہوا تھا۔ یہ راستہ مجھے اپنے والد کی دکان جو اس وقت کے سب سے مشہور اور ٹاپ بازار انارکلی میں تھی سے ہوتا ہوا یہاں تک لایا تھا۔ میرے والد اعلیٰ ترین قلموں کے بڑے امپورٹر تھے۔ اہل دانش اور لفظوں کے شناور ان قلموں کو محبت سے انتخاب

کرتے اور اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے کیسے کیسے قلم تھے جن سے میں بھی آشنا ہو چکا تھا۔ جرمنی کے ''مونٹ بلانک'' اور ''پیلی کن'' پھر ''شیفرز لائف ٹائم گارنٹی والا'' ''پارکر 51 ''، ''پارکر 61 ''، ''بلیک برڈ''، ''سوان''، ''ایور شارپ'' اور بے شمار دوسرے۔ سونے کی نب والے ان قلموں کا پوائنٹ پلاٹنم کا ہوتا۔ ہر قلم اعتبار سے مزین ہوتا تھا اور بہترین رزلٹ دیتا تھا اور دادا جان اگر خرید کر اس سے لکھنا شروع کر دیں تو پڑپوتے تک آتے آتے زیادہ فائن ہو جاتا تھا اور کئی نسلوں کو سیراب کر دیتا.... میں نے ان مشاہیر اور اہل علم و دانش کو اپنی اس دکان پر ہی دیکھا تھا جب والد مجھے بتاتے کہ یہ فیض ہیں .... یہ ڈاکٹر عنایت اللہ ہیں اور یہ عبادت بریلوی اور یہ سیّد وقار عظیم ہیں۔ تمام اہل ادب یعنی احسان دانش سے سیّد عابد علی تک اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی سے ساغر صدیقی تک میں سب سے یہیں ملا تھا۔ (میں نے ساغر صدیقی کو صاف ستھرے روپ میں بھی دیکھا تھا وہ اس وقت ''ادب لطیف'' کا تازہ سالنامہ جو اس کی غزل کی اشاعت کے بعد اعزازی ملا تھا اور ابھی مارکیٹ نہ آیا تھا۔ ہمارے قریب کاشانۂ ادب کے مولوی صاحب کے پاس بیچنے آیا تھا۔ پرچے کی قیمت تین روپے تھی۔ ساغر ایک روپیہ مانگتے تھے مولوی صاحب بارہ آنے سے آگے نہ بڑھتے تھے۔ جب ساغر پرچہ بیچے بغیر واپس چلا گیا تو مولوی صاحب نے میرا تجسس دیکھتے ہوئے مجھے بتایا: ''یہ شاعر ہے ساغر صدیقی .... ایک روپیہ میں سالنامہ بیچنے آیا تھا۔'' میرے دل میں ان دنوں بھی ٹیس سی اٹھی .... میں بھاگ کر پیچھے گیا اور اس سے پہلے کہ ساغر سڑک کا موڑ مڑ جائے میں نے اس سے کہا ''یہ لیجیے ایک روپیہ .... پرچہ مجھے دے دیں۔'' بے دلی سے ساغر نے ایک روپیہ لے لیا اور پرچہ مجھے دے دیا.... وہ چلا گیا۔ وہ سفید پاجامہ کرتہ پہنے تھا اس

پر ہلکے نیلے رنگ کا ہاتھ سے بنا ہوا سویٹر پہنے وہ پرشکوہ شخصیت دکھائی دیتا تھا۔ بس اس کا وہی روپ میں نے ایک ہی مرتبہ دیکھا تھا پھر تو اس میلی اور کالی دنیا کے طفیل وہ مجھے مٹی میں اور فقیرانہ حلیے میں ہی دکھائی دیا۔

جس دن میں پہلی مرتبہ اورینٹل کالج کسی وسیلے سے پہنچا تھا۔۔۔ کالج کی اوپر کی منزل کے آخری بڑے کمرے میں کوئی ادبی نشست تھی۔ کمرا بہت کھلا اور وسیع تھا۔ لڑکیوں، لڑکوں سے بھرا ہوا۔ ادبی نشست کے دونوں مہمانوں کے نام کالج کے نوٹس بورڈ پر لکھے تھے۔ افسانہ: اے حمید غزل: شہرت بخاری صدارت: سیّد وقار عظیم

سیّد صاحب کو اس سے پہلے بھی میں دیکھ چکا تھا۔ والد صاحب نے میری اردو ادب سے دلچسپی دیکھتے ہوئے مجھے آج شاہین نامی ایک ادب دوست کے ساتھ کالج بھجوایا تھا۔ حالانکہ انگلش سکول سے اُٹھا کر اُنہوں نے مجھے قرآن پاک حفظ کرنے پہ لگا دیا تھا اور قرآن پاک حفظ کر لینے کے بعد مجھے ادبی دنیا جوائن کرنے کی اجازت انعام کے طور پر دے دی تھی۔ ورنہ ایک عرصہ تک میرے گھر میں تو کتاب کا داخلہ تک ممنوع تھا۔ میں نے جو کچھ پڑھا چاندنی راتوں خصوصاً پورنماشی کی چاند راتوں میں چھپ چھپا کر پڑھا یا پھر سرما کی خنک دانت بجاتی راتوں میں لحاف کے اندر ٹارچ جلا کر۔ اب ان کا دل نرم ہو گیا تھا کہ اُنہوں نے ایک روز غائبانہ طور پر سیّد وقار عظیم کے مرتبے کے بارے میں بتایا تھا۔ کہا۔۔۔ ’’میرے اندازے غلط تھے سیّد وقار عظیم کو دیکھ کر میرے سامنے علی گڑھ کی مکمل تہذیب اور اس کی تاریخ تصور ہو جاتی ہے میں سمجھتا تھا کہ ادب و شعر کے تخلیق کار بیکار لوگ ہوتے ہیں مگر .... ‘‘انہوں نے بات بدل کر کہا تم جایا کرو، اورینٹل کالج .... یہ کئی تہذیبوں سے جڑی ہوئی آماج گاہ ہے۔ امتزاج ہے ‘علم اور ادب سے بہرہ ور دانشوروں کا

ایک پورا شہر سمجھ لو۔"

مجھے کچھ سمجھ نہ آیا۔ اس وقت ان کی باتیں میری سمجھ سے بالا تھیں۔ جن کے اثرات بعد میں میرے لہو میں بہت آہستہ آہستہ اُترنے لگے تھے۔ آج بھی ان کی بات آگے نہ چل سکی تھی کہ ڈاکٹر عنایت اللہ تشریف لے آئے تھے اور اپنے دو قلم جو وہ کسی شکایت کے تحت درست کرنے کے لئے دے گئے تھے۔ لینے آئے اور لے کر چلے گئے۔ تو والد صاحب نے بتایا "دیکھو.... ڈاکٹر عنایت اللہ نو زبانیں جانتے ہیں۔ ہر زبان لکھنے کے لئے ان کے پاس الگ قلم ہے۔ عالم شخص ہیں۔"

اورینٹل کالج کے کھچا کھچ بھرے کمرے میں افسانہ پڑھنے کا اعلان ہوا تو اے حمید اپنے لہراتے بالوں پر ہاتھ پھیرتے اور اپنے مفلر کو ادا سے گردن کے گرد لپیٹتے، ڈائس پر آئے۔ انہوں نے کوٹ کی جیب سے افسانہ نکالا، مخمور آنکھوں سے سامعین کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت ایک شہزادہ سا لگا تھا۔ کاغذوں کا پلندہ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ کافی ضخیم افسانہ ہے۔ سید وقار عظیم صاحب نے جو قارئین اور طلبا کی نگاہوں کے صحیح نباض تھے، فرمایا: "اے حمید ہمارے تازہ اور تاثیر والے افسانہ نگاروں میں بہت گہرے نقش کے ساتھ اُبھرے ہیں اور دلوں پر اپنی شناخت کی مہر ثبت کرتے چلے جا رہے ہیں۔ بعض لوگ انہیں منظر نگار کہتے ہیں، منظر نگار تو وہ ہیں اور انہوں نے اس صدی کی سب سے بڑی اور المناک ہجرت کے زخموں کو مندمل کرنے کے لیے اسی منظر اور پس منظر سے کام لیا ہے اور زخم خوردہ انسانوں کے درد کا درماں کیا ہے۔ وہ ایک نہایت صاف ستھرے لکھنے والے ہیں۔ اُن کا ستھرا پن مکمل بھی ہے اور منفرد بھی.... لیجیے ملاحظہ فرمایئے۔"

سید صاحب کی اس تمہید کے بعد سب ہمہ تن گوش تھے۔ اے حمید نے افسانہ

شروع کیا۔ محسوس ہوتا تھا ایک طلسماتی دنیا ہے جس نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اس کہانی کا نام تھا" جاگ ایراوتی ": (بنگال کی ایک ندی)

ایک طویل کہانی کب شروع ہوئی، کب ختم ہوگئی خوابیدہ منظر نگاری سے مزین اور بوجھل دلوں کے کواڑ کھولنے والی یہ کہانی سب سننے والوں کو خصوصاً مجھے اے حمید کا گرویدہ بنا گئی اور سید صاحب کی تہذیبی شخصیت نے تو ہم سب پر ایسے اثرات مرتب کر دیے تھے کہ میں نے "ستھراپن اور ستھراؤ" کے الفاظ انہیں کے لیے مخصوص کر دیے تھے کہ آواز آئی اب غزل پیش کریں گے سیّد شہرت بخاری۔ شہرت بخاری کو میں بالکل نہیں جانتا تھا۔ ایک منحنی سے دبلے پتلے شخص نے جس بلا کے ترنم سے غزل سرشاری سے پڑھی میں تو سر سے پاؤں تک سرشار ہوگیا۔ سرشاری کے ثبوت کے طور پر دو شعر آج بھی مجھے یاد ہیں۔

دھوپ کتنی کڑی ہے کیا ہوگا   راہ ساری پڑی ہے کیا ہوگا
دن تو جوں توں گزر گیا شہرت   رات ساری پڑی ہے کیا ہوگا

سہل ممتنع کی اس غزل کے ترنم نے مجھے تادیر مسحور کیے رکھا۔ میں بے چین ہوا۔ واقعی رات سر پر کھڑی تھی اور کاٹے نہ کٹتی تھی۔ میں نے گھر آ کر شور مچایا کہ میں تو اسی کالج میں پڑھوں گا۔ والد صاحب نے سمجھایا ابھی قرآن کے دو تین دور اور ہوں گے۔ تم سب کیسے کرو گے؟

میں نے سوچے ہوئے منصوبے کے تحت فوراً کہا: "رات کو قرآن پاک کا دور، صبح کو اورینٹل کالج، دوپہر کے بعد ڈان کالج کی آٹھویں کلاس۔"

"اتنا کچھ کر لو گے؟"

"جی۔۔۔ میں کرلوں گا۔" اور میں رات کو دکان کے اندرونی کمرے میں سویا

کروں گا۔"

دوسرے دن والد نے دو تین اساتذہ سے خود بھی مشورہ کیا تو معلوم ہوا کہ ادیب عالم ادیب فاضل کی کلاسیں موجود ہیں۔ ادیب عالم میں داخلہ مل سکتا ہے۔ پانچویں دن میں ایک نئی اور خوابناک دنیا میں تھا جہاں سیّد وقار عظیم صاحب تھے، مشرف انصاری صاحب تھے، ابواللیث صدیقی صاحب تھے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ صاحب، عبادت بریلوی صاحب، ڈاکٹر وحید قریشی صاحب اور بے شمار عالم اور فاضل لوگ جن کے پورے نام میں یاد تک نہ رکھ سکتا تھا۔ یہ ایک نئی زندگی تھی۔ لڑکیاں ایک طرف پردے میں بیٹھی تھیں.... اور لڑکے دوسری طرف۔

مجھے محسوس ہوا کہ میں چڑیا کا وہی پہلوٹھی کا بچہ ہوں جسے چڑیا نے گھونسلے کی قید سے آزاد کر کے کھلی فضا میں پَر چلانے سکھا دیے ہیں اور میں نیلے آسمان کی گہرائیوں میں اپنے کمزور پروں کے باوجود اُس کی وسعتوں میں کھو رہا ہوں۔ ہر چند کہ دوسروں سے زیادہ شرمیلا تھا مگر لڑکپن اور کلاس میں پڑھنے والی لڑکیوں نے اس فضا کو "ست رنگی" بنا دیا تھا۔ فضا متحرک تھی۔ مگر کسی کی مجال نہ تھی کہ پاؤں رپٹ جائے۔ باقی طلبا مجھ سے کافی بڑے تھے اور کلاس کے علاوہ جاب بھی کرتے تھے۔ میرے ساتھ جعفر عباس بیٹھتا جو بے حد شرارتی تھا۔ ایک روز اس نے شرارت سے درمیان والے پردے میں تھوڑا سوراخ بنا لیا اور پردے کی دوسری طرف "آوارہ نگاہی" کرنے لگا۔ سیّد وقار عظیم صاحب نے اندازہ کرتے ہوئے خاموشی اختیار کی اور کلاس کے اختتام پر حاضری لیتے ہوئے جعفر عباس اور میرے نام پر رُک گئے۔ کلاس سے باہر نکل کر انہوں نے جعفر عباس سے نہایت مشفقانہ انداز میں کہا: "آپ دونوں اساتذہ کے لیے مخصوص کامن روم میں مجھ سے مل لیں۔" اور وہ

چلے گئے۔

جعفر عباس نے اپنی کھلکھلاتی ہنسی میں اس بات کو اُڑا دیا۔ مگر مجھے خوف کی چادر نے چاروں طرف سے لپیٹ لیا تھا۔

میں نے جعفر سے کہا ''سب قصور تمہارا ہے۔ میں نے تو کبھی پردے کے پار دیکھا تک نہیں۔''

''زیادہ سے زیادہ کالج سے نکال دیں گے نا۔'' جعفر عباس نے ہنسی کے فوارے کے درمیان یوں کہا جیسے یہ بات اس کے لیے نہ ہونے کے برابر ہے۔ میں لرز گیا۔ مجھے بے حد مشکل سے اس کالج میں داخل ہونے کی اجازت ملی تھی ورنہ میرے والد تو مجھے مصر بھیجنے کے لیے ضد کر رہے تھے کہ یہ جامعہ ازہر میں دینی تعلیم حاصل کر کے عالم بنے گا۔ وہ تو نانا جی حکیم محمد شفیق کی سفارش کام آ گئی۔ سودا اس طرح طے ہو گیا کہ چینیانوالی مسجد اندرون موچی دروازہ میں قرآن پاک حفظ کروالو اور جامعہ ازہر نہ بھیجو کہ اکلوتا ہے.... سو میں کن ساجتوں کے بعد گھر کے قریب رہا تھا۔ ماں کا کلیجہ بھی اس سودے سے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

''تم چلو تو....'' جعفر نے مجھے کھینچ کر آگے کیا اور چمکدار برآمدوں سے ہوتا ہوا اساتذہ کے لیے مخصوص کیے گئے کامن روم کی چک اُٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ لمحے بھر کو میں رُکا رہا.... پھر میں نے دو قدم بڑھائے سامنے سیّد صاحب تھے۔ وہ ایک کونے والے صوفے پر بیٹھے ہمارے ہی منتظر تھے۔ جعفر عباس آگے تھا۔

''جی سر.... ہم حاضر ہیں۔'' اسی نے کہا تو سیّد صاحب گلا صاف کرتے ہوئے کہنے لگے: ''میں کئی دنوں سے نوٹ کر رہا ہوں کہ تم لوگ پردے میں سے دوسری

طرف دانستہ دیکھنے کی کوشش میں ہوتے ہو۔ کتاب یا لیکچر کی طرف تمہاری توجہ نہ ہونے کے برابر ہے۔''

بڑی جرأت سے جعفر نے کہا ''سر! آپ درست فرما رہے ہیں سارا قصور میرا ہے۔ یہ تو.... ''اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''سر جی! یہ تو گائے ہے بالکل.... لڑکیوں سے بھی کمزور اور شرمیلا۔''

''آپ کو کیا سزا دی جائے؟''

''سر! میرا ابھی زیادہ قصور نہیں ہے۔ کبھی کبھار نگاہ بھٹک بھی جاتی ہے.... سر! یہ نیچرل قسم کی حرکت ہے.... آپ ہمارے اُستادِ گرامی ہیں۔ آپ سے بہتر کون جانتا ہوگا کہ نیچر کیا کیا گل کھلا دیتی ہے۔''

جعفر تسلسل سے بول رہا تھا ''سر! ہماری شاعری ان لوازمات سے بھری پڑی ہے۔ میرے ماموں بتا رہے تھے کہ قلندر بخش جرأت نے زنان خانے سے حظ اُٹھانے کے لیے خود پر نابینا ہونے کا ایسا روپ طاری کیا کہ بینائی جاتی رہی۔''

''کون ہیں تمہارے ماموں؟'' برجستہ سیّد وقار عظیم نے پوچھا۔

''سر.... عبدالحمید عدم'' جعفر نے بے ساختہ کہا۔ ''وہ بھی شاعر ہیں۔''

''وہ تمہارے سگے ماموں ہیں؟''

''جی سر جی.... میں شام کو انہیں ڈرائیو کر کے ''انگلش وائن'' پر لے جاتا ہوں.... وہاں سے وہ اپنا سودا خرید لیتے ہیں تو پھر انہیں بیڈن روڈ لے جاتا رہا جب تک منٹو صاحب زندہ رہے۔ دونوں نے مل کر شام گزاری۔ اب انہیں حکیم یعسوب الحسن کے ڈیرے پر چھوڑ آتا ہوں اور شاعروں کے بہت سے قصے بھی سنتا رہتا ہوں۔''

حیرت سے سیّد وقار عظیم کی آنکھیں پھیل رہی تھیں" ارے.... تم تو واقعی سیّد عبدالحمید عدم کے بھانجے ہو.... لیکن بیٹے یہ کوئی سفارش نہیں ہے.... یہ کالج ایک حرم کی طرح ہے نہایت پاکیزہ اور آدمی کو انسان بنانے والا.... وہ جو غالب نے کہا تھا نا:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا....
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا....

تو آدمی اور انسان کا فرق واضح کر دیا تھا۔ میں عدم صاحب کی وجہ سے نہیں تمہاری جرأت، سچائی کی بدولت درگزر کرتا ہوں۔ مگر میرے بیٹو! غور کرو، پرندہ ہو، درندہ ہو، انسان ہو، نر کو قدرت نے زیادہ خوبصورت اور باوقار بنایا ہے۔ شیر کو دیکھو، مور کو دیکھو، مرغا دیکھو، یقین ہوتا ہے کہ نر ہمیشہ خوبصورت ہوتا ہے تو پھر آپ کو کیا ضرورت ہے کہ اس قسم کی حرکت کرو۔ تمہیں اپنی خودداری، عزت نفس اور انا عزیز کیوں نہیں....؟ تم خود کو کیوں پامال کرتے ہو اور رُسوا بھی....؟"

پروفیسر وقار عظیم صاحب نے گلا صاف کرنے کو توقف کیا تو جعفر عباس نے فوراً کہا: "سر! میں حلفیہ کہتا ہوں آئندہ شکایت کا موقع نہیں دوں گا اور اپنی خودداری کی حفاظت کروں گا۔ اس دفعہ مجھے"....رک کر اس نے میری طرف دیکھ کر کہا.... ہمیں معاف کر دیجیے...."

جواب میں پروفیسر وقار عظیم نے فرمایا "آپ لوگوں کے لئے چائے منگواؤں؟"

اس جملے سے ہم شرمندہ بھی ہوئے اور دونوں ان کے سامنے بچھ سے گئے اور بہت شکر گزار ہونے کے لیے ان کے سامنے کئی مرتبہ جعفر نے اور میں نے آداب

کیا۔ انہوں نے ہمارے کندھوں پر یوں تھپکی دی جیسے وہ انور اور اختر کے کندھوں کو تھپک کر ان کا حوصلہ بڑھایا کرتے ہوں گے۔ ہم کامران لوٹے مگر ہمارے دل ان کی محبت میں۔۔۔ لبریز ہو ہو گئے۔ کامن روم سے نکلتے ہی جعفر عباس نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ پھر وہ مجھے قریبی چمن میں لے گیا اور سہگل کی گائی ہوئی مرزا غالب کی غزل "آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک" سنائی۔ ظالم غضب کا گائیک تھا۔ مجھے تو مسحور کر گیا....

جعفر عباس سے دوستی گزشتہ سالوں تک رہی۔ اس کی بیگم ایئر ہوسٹس تھی۔ وہ گھر (کراچی) میں خوش و خرم تھا۔ چند سال پہلے دفتر مجلس ترقی ادب میں مجھ سے ملنے آیا تو گلے گلے تصوف، معرفت، عشق حقیقی میں ڈوبا ہوا تھا۔ دیگر دقیق مسائل مجھے سمجھاتا رہا۔ موت اور اس کی حقیقت، روح اور اس کا سفر۔ میرے پلے کچھ نہ پڑتا تھا جیسے سید وقار عظیم کی وہ باتیں جو انہوں نے سمجھائی تھیں، کم ہی پلے پڑتی تھیں کہ میرا انٹینا درست نہ تھا۔

یہی وجہ تھی میری جھولی میں کچھ تھا ہی نہیں۔ جعفر عباس مجھ سے کافی بڑا اور تجربہ کار تھا۔ شام کو وہ بلئیر ڈ کھیلنے جاتا تھا۔ جو لوگ اکیلے ہوتے تھے ان کے ساتھ بلئیر ڈ کھیل کر ان کی پریکٹس کراتا اور معاوضہ لیتا تھا۔ وہ ہر فن مولا اور خوش آواز، خوش شکل اور خوش مزاج تھا۔ دفتر میں مجھ سے ملنے کے بعد وہ شبیر شاہد کی طرح غائب ہو گیا اور جس طرح تلاش کے باوجود شبیر شاہد آج تک نہیں ملا جعفر عباس بھی مہاتما بدھ کی داستان پڑھتا ہوا اوجھل ہو گیا اور شبیر شاہد بھی سدھارتھ پڑھتا پڑھتا ایم اے کرنے اور حلقہ ارباب ذوق ادبی کا جوائنٹ سیکرٹری ہونے کے بعد تمام لوگوں کو ان سے لیا ہوا قرض لوٹا کر ہر ایک کی امانتیں پہنچا کر روپوش ہو گیا تھا....

میں برسوں سے اسے مس کر رہا ہوں اور اب تو جعفر عباس کو بھی۔ ان دونوں کی روح رب قدیر آسودہ رکھے۔ پرسکوں رکھے۔ وہ دونوں آدمی سے انسان بننے کی جستجو میں رہنے لگے تھے۔ کائنات کی وسعتوں میں انسان کی حیثیت، صحراؤں میں محض ریت کے زرّے سے بھی کم کم ہے مگر فنافی اللہ کی بحث میں وہ اکثر قطرے کو سمندر میں جذب ہو جانے ہی کو موت کہتے تھے۔ اس موت کو جعفر عباس نے اکثر وصال کہا تھا۔

اس درسگاہ میں بڑی عمر کے تجربہ کار لوگوں کا طالب علم بن کر داخلہ لینے کا راز بہت جلد مجھ پر کھلا۔ ایک تو انہیں اپنے حالات کی تصویر کشی کر کے سکالرشپ یا وظیفہ حاصل کرنے کا گُر آ گیا تھا۔ دوسرا یہاں بہترین ہوسٹل کی سہولت موجود تھی لہٰذا ان میں سے بہت سے سٹوڈنٹ مختلف جگہوں پر ملازمت بھی کرتے تھے۔ ہوسٹل میں رہتے تھے اور وظیفہ اور تعلیم بھی حاصل کر لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے انہیں امتحان پاس کرنے کی کوئی جلدی نہ تھی اور اگر کوئی پاس ہو جاتا تو میں نے سنا تھا کہ وہ منشی فاضل یا مولوی فاضل میں داخلہ لے لیتا تھا۔ اسی سلسلے میں بار بار داخلہ لینے والوں میں آتش لدھیانوی کا نام اس لیے ذہن میں نقش ہو گیا تھا کہ وہ مترنم شاعر تھا۔ کالج کی ضرورت بن گیا تھا۔ ایک مشاعرے میں جب اس نے غزل شروع کی تو صدارت عابد علی عابد فرما رہے تھے۔

گزر گئی ہے مگر بے قرار گزری ہے....
وہ زندگی جو سرِ کوئے یار گزری ہے....

میں نے عابد صاحب کو جھوم کر داد دیتے ہوئے دیکھا۔ غزل کے دیگر اشعار بہت عمدہ تھے جو اَب یاد نہیں۔ سچی بات ہے میرے اندر کی پیاس نے مجھے ادیبوں، شاعروں سے قریب تر کر دیا تھا۔ میرے کورس میں امراؤ جان ادا نہیں تھی۔ مگر میں

CS CamScanner

اسے پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا جسے ادارہ فروغ اُردو (محمد طفیل نقوش والے اس ادارے کے مالک تھے) نے شائع کیا تھا.....

پڑھتے پڑھتے صفحہ ۱۸۰ پر مولوی صاحب کا سراپا لکھتے ہوئے مرزرُسوا نے لکھا تھا مولوی صاحب کا ''سر منڈا ہوا تھا'' مگر صفحہ ۱۸۶ پر وہ اسی مولوی صاحب کے سراپے کو دہراتے ہوئے یہ لکھ گئے کہ ''سر پہ لمبے لمبے بال تھے'' پہلے تو میں نے کئی مرتبہ ان تحریروں کو پڑھا دونوں کے فرق کو بار بار آمنے سامنے نوٹ کر کے رکھا۔ سنا ہے مرزا رُسوا نے یہ ناول بہت جلدی میں کسی ضرورت کے تحت لکھا تھا اور شائد قلم برداشتہ بھی ''سر منڈا ہوا تھا'' لکھ کر شاید انہوں نے توقف کیا ہو.... اور دوبارہ لکھتے ہوئے گزشتہ تحریر کو پڑھنے کا ان کے پاس وقت ہی نہ ہوگا۔ بہرحال میں بڑی ریہرسل کے بعد سیّد وقار عظیم صاحب کے پاس پہنچا۔ پہلے تو خورشیدالاسلام کے لکھے ہوئے دیباچے کی بہت تعریف کی۔ (یہ دیباچہ خورشید الاسلام کی کتاب تنقید میں بھی شامل ہے اور اعلیٰ ترین تخلیقی تنقید کا عمدہ نمونہ ہے) اس کے بعد میں نے مولوی کے سراپے میں تضاد کا ذکر کیا۔ انہوں نے صفحہ ۱۸۰ اور ۱۸۶ دونوں کو دیکھا۔ پڑھا اور مسکرا دیے۔ ''آپ کا کیا خیال ہے ایک کو حذف کر دیا جائے؟''

''نو سر.... ''میں نے بڑی جرات سے عرض کیا: ''سر! یہ لمبے بالوں کے تذکرے پر حاشیہ چڑھانا چاہیے۔ اگر یہ مرزا رسوا کی تحریر ہے تو اسے رہنا چاہیے۔ حاشیے میں البتہ.... ''میں رک گیا تو وقار صاحب نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

''آپ کا مزاج تحقیق و جستجو کا مزاج ہے'' وہ رکے تو مجھے فخر سا ہوا ایک انہوں نے دو مرتبہ میرے لیے آپ کا لفظ استعمال کیا تھا اور دوسرے تحقیقی مزاج کی سند عطا کی

CS CamScanner

تھی۔ انہوں نے اپنی بات بڑھاتے ہوئے کہا ''طلبا میں یہی تحقیق اور جستجو انہیں کامران کرتی ہے۔ میں خوش ہوں کہ ہمارے درمیان ایسے طالب علم بھی موجود ہیں۔''

مجھے یاد ہے جب امتحان ہوا تو اتنی بڑی کلاس میں صرف تین لوگ کامیاب ہوئے.... ان میں.... ایک میں بھی تھا۔

کئی برسوں بعد مجھے بتایا گیا کہ اس رزلٹ کے پیچھے بھی سیاسی عناصر کے کمالات تھے۔ مثلاً آقا بیدار بخت ایک بہت بڑا ادارہ چلاتے تھے جہاں السنہ شرقیہ کی تیاری کرائی جاتی تھی۔ اور یونیورسٹی کے عالم فاضل کے پرچوں کو مارک کرنے والوں میں ان کے بعض اساتذہ بھی شامل تھے۔ وہ لوگ پنجاب یونیورسٹی کے رزلٹ کو کمتر دکھانے کے لیے دانستہ کسی ایک پرچے میں کم نمبر لگا کر طلبا کو فیل کر دیا کرتے.... لہٰذا یونیورسٹی کا رزلٹ خراب ہو جاتا۔ ہر چند کہ یہ داستان میں نے بار ہا سنی تھی مگر بڑی شہادتوں کے بعد معتبر لوگوں نے اس کی توثیق کر دی۔ بہر حال میرا کامیاب ہونا میرے لیے تو خوشی کا باعث تھا ہی .... سید وقار عظیم صاحب نے بھی مجھے پیار بھری تھپکی کے ساتھ شاباش دی تھی....

سید وقار عظیم اپنے رہن سہن اور تمدن کے اعتبار سے مکمل تہذیب کا سمبل تھے۔ بردبار، قانع اور خاموش طبع۔ کھل کر ہنستے ہوئے میں نے انہیں کم ہی دیکھا ہے.... ہاں جب محمد طفیل (محمد نقوش) کالج میں ان کے پاس بیٹھ کر بے آواز مشورے کر رہے ہوتے تھے تب بھی ان کی مسکراہٹ ان کی آنکھوں سے جھلکتی تھی۔ ان دنوں محمد طفیل صاحب بہت دبلے پتلے (بالکل سید وقار عظیم صاحب کی طرح) ہوتے تھے۔ وہ نقوش کے لیے وقار صاحب کے پاس آتے تھے اور شائد آپ کے علم میں ہوگا کہ

ان دنوں وہ نقوش کے خوش نویس بھی تھے۔ مگر بلا کے خوش خط۔ بعض شروع کے شماروں کے سرورق بھی انہوں نے بنائے تھے۔ ہم، یا کم از کم میں سمجھتا تھا کہ وہ نقوش کے مضامین حاصل کرنے آتے ہیں۔ یہ راز تو ایک روز مشرف انصاری صاحب نے افشا کر دیا۔ جب کسی طالب علم نے انصاری صاحب سے کہا "سر وقار صاحب آج کلاس لینے نہیں آئے۔"

ایک دو مرتبہ مشرف انصاری صاحب نے درگزر کیا اور اپنے کام میں مصروف رہے جب اس لڑکے نے بار بار اپنا گلہ دہرایا تو مشرف صاحب کو جیسے لڑکے کے لہجے سے دکھ ہوا۔ انہوں نے برملا کہا "تب کیا ہوا؟ کوئی وجہ ہوگی اور وہ پرنسپل یا دفتر والوں کو اگر جواب دہ بھی ہوں گے تو انہیں مطلع کر دیا ہوگا۔ کئی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ آدمی بیمار ہو سکتا ہے، کوئی ایمرجنسی بھی ہو سکتی ہے۔ آپ کے مزاج کی حاکمیت اُستاد کے مرتبے کا احاطہ کر سکی ہے نہ اس کے مسائل اور وسائل کی۔

آپ کے علم میں کب ہوگا کہ وقار صاحب نے چوبیس گھنٹوں میں پانچ گھنٹے آرام کے لیے مخصوص کیے ہیں۔ چھ سو روپے ان کی کل تنخواہ ہے۔ (یہ رقم ان دنوں اچھی خاصی معقول تھی۔ آج کے ہزاروں روپے کے برابر)

اور یہ ساری رقم وہ اپنے بچوں کے تعلیمی اخراجات کے لیے دے دیتے ہیں۔ گھر کے اخراجات کے لیے انہیں دن رات محنت کر کے مضامین اور کتابیں لکھنا پڑتی ہیں۔ نجی رسالوں کی ادارت کرنا پڑتی ہے۔ وہ دن رات آپ سب کے لیے بھی فکرمند رہتے ہیں حتیٰ کہ کلاس کے بعد بھی آپ لوگوں کے لیے وقف رہتے ہیں...."

معترض شخص بے حد شرمندہ ہوا اور ہمارے دلوں میں وقار صاحب کا ایک اور روپ آن اُترا جس کے چاروں اور احترام کی سفید چادر احاطہ کیے ہوئے تھی۔ بہت دن

مہینے سال گزر گئے۔ میں مجلس ترقی ادب میں ملازم تھا۔ دوپہر کو میں چھٹی ہونے پر ''مطبع عالیہ'' کے اظہار الحسن رضوی صاحب کے ساتھ ان کے ''لمریٹا'' میں فٹ ہو جاتا۔ ان کا پریس ''مطبع عالیہ'' ٹمپل روڈ نزد عابد مارکیٹ پہ تھا۔ وہاں کچھ گپ شپ کے بعد میں گھر کے لیے روانہ ہو جاتا تھا۔ ان دنوں اظہار صاحب وقار صاحب کی کتاب ''اقبال شاعر اور فلسفی'' کمپوز کرا رہے تھے۔ سید وقار عظیم اس کتاب کا فائنل پروف دینے آئے تھے۔ چند منٹ بعد.... اور ان چند منٹوں میں میرے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکلا وہ واپس چلے گئے....

اظہار صاحب نے بہت روکا .... مگر وہ بار بار ایک ہی جملہ دہراتے رہے.... ''تھوڑا وقت بچانے لیے جاتا ہوں۔ ضائع ہو جائے گا۔'' ان کے جانے کے بعد ہم نے کھل کر باتیں کیں۔ چائے پی، آنے والی نئی کتابوں کی فہرست تیار کی۔ مشکل سے آدھا گھنٹہ گزرا ہوگا کہ وقار صاحب اچانک آ گئے۔ اظہار اور میں دونوں نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ وہ بغیر کسی تمہید کے بولے: ''معذرت خواہ ہوں مخل ہوا۔ جو پروف میں دے گیا ہوں وہ فائنل ہیں مگر گھر پہنچ کر کاغذات دیکھنے پر کھلا کہ ایک شذرہ غلط جگہ پر شائع ہو رہا ہے۔ ساری عبارت بے معنی ہو جائے گی۔ آپ وہ فائنل مسودہ منگوائیے.... بس ایک منٹ کے لیے۔''

اظہار نے دراز سے مسودہ نکال کر سامنے رکھا۔ انہوں نے متعلقہ صفحات نشان زدہ کر کے تصحیح کر دی اور اجازت چاہی۔

اظہار نے کہا'' آپ مجھے فون کر دیتے.... میں گھر حاضر ہو جاتا۔''

''اس تجربے سے مجھے سیکھنے کا موقع ملا ہے۔ فائنل پروف دیتے ہوئے.... کس

توجہ کی ضرورت ہوا کرتی ہے اب یہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ خدا حافظ۔”

اظہار بولا “ایک وزیر الحسن عابدی صاحب ہر ہر لفظ، شعر، مصرع پر توجہ کرتے ہیں یا پھر وقار صاحب۔”

میں نے جواب دیا “جب میں اورینٹل کالج میں لڑکپن میں پڑھتا تھا۔ کلاس میں بڑی عمر کے لڑکے اس لیے بھی داخلہ لیے ہوئے تھے کہ انہیں سکالرشپ ملا ہوا تھا۔ ہوسٹل کا کمرہ بھی نہایت سستے داموں.... اکثر ان میں سے دفتر میں ملازم تھے۔ میں اکیلا ہی ریگولر تھا۔ ایک روز جوش جذبات میں کلاس میں سیٹی بجانے میں مصروف تھا۔ پوری کلاس شور شرابے سے لتھڑی تھی کہ وقار عظیم صاحب آ گئے۔ انہوں نے شور کو تو نظر انداز کیا مگر سیٹی کو ناپسند کیا۔ انہیں پہلے سے لڑکیوں کی طرف سے شکایت ملی تھی کہ لڑکے ان کی موجودگی پر سیٹی بجا بجا کر متوجہ کرتے ہیں (حالانکہ مجھے اس بات کا علم بعد میں ہوا تھا) سو انہوں نے اندر آتے ہی رجسٹر دھپ سے میز پر پھینکا.... جو سراسر ناراضگی کا اظہار تھا اور کہا.... “سیٹی کون بجا رہا تھا؟”

سب دائیں بائیں اور پیچھے دیکھنے لگے۔ میں بھی ڈر کر پیچھے دیکھنے لگا۔ جیسے سیٹی کسی اور نے پچھلی صف سے بجائی ہو، سناٹا چھا گیا۔

“اس سے پہلے کہ میں آپ سب کو کلاس سے باہر کھڑا کر دوں اور اتنے بڑے بڑے لوگوں کی عزت نفس پامال ہو جائے فوراً بتایئے یہ کون بے ہودہ شخص ہے جو سیٹیاں بجاتا ہے....” گہرا سناٹا سب خاموش....

“مجھے یقیناً یہ تلخ فیصلہ کرنا پڑے گا۔ اگر آپ لوگوں کو اپنی عزت اور وقار کا خیال نہیں.... تو پھر....”

CS CamScanner

''سر میں تھا۔ میں بجا رہا تھا سیٹی .... مگر سر .... پہلی بار....اور سر شائد آخری بار بھی۔''

وقار صاحب کی پیشانی پر ساری شکنیں ایک نارمل مسکراہٹ میں پھیل گئیں۔

''بہت اچھا ہوا آپ نے سچ بول دیا....اور پوری کلاس کی عزت بچا لی۔ اسی خاطر آپ کی یہ حرکت نظر انداز کی جا رہی ہے۔ آئندہ احتیاط کیجیے گا''

انہوں نے حاضری کے رجسٹر کو کھول کر میرے نام کے سامنے ایک نشان لگایا تھا۔ پتہ نہیں کیوں؟''

''کہو تو میں پوچھ لوں کسی دن؟'' اظہار نے شرارت سے پوچھا۔

''نونو.... نہیں.... بھرم رہنے دو پلیز....'' اور پھر وہ دن کیسے بھول سکتا ہوں جب پی ٹی وی پر اعلان ہوا کہ سید وقار عظیم صاحب زیر علاج ہیں، ان کے لیے خون کی ضرورت ہے.... مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ علیل ہیں.... میں نے اچانک پی ٹی وی سے اعلان سنا کہ سید وقار عظیم علیل ہیں اور حاجرہ میموریل کلینک جیل روڈ میں زیر علاج ہیں۔ انہیں خون کی اشد ضرورت ہے۔''

مختصر اعلان نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔ حاجرہ میموریل کلینک میرا دیکھا ہوا تھا سب سے پہلے وہاں انتظار حسین بستر اور کئی دنوں کا سامان لے کر گردے کی پتھری کے لیے گئے تھے.... مگر معالج نے کہا: ''اتنے سامان کی ضرورت ہے نہ بستر کی۔ آپ کو گھنٹے بھر میں فارغ کر دیا جائے گا۔''

گردے کی بیماریوں کے لیے یہ پہلا مستند کلینک تھا جو لیزر سے علاج کرتا تھا۔ یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ ہماری جدید اور معروف افسانہ نگار خالدہ حسین کے بھائی نے

یہ کلینک بنایا تھا۔ جو چھوٹے سے ہوسپٹل کی طرح تھا۔ سو میں خون دینے کے لیے حاجرہ میموریل کلینک پہنچا۔

خون دینے والوں کی لمبی قطار پہلی دفعہ اس قدر ڈسپلن میں دکھائی دی۔ میرا نمبر تقریباً اٹھائیسواں تھا۔ میرے لائن میں لگنے کے چندمنٹ کے بعد خون دینے والوں کی قطار مزید لمبی ہو کر دور تک چلی گئی تھی۔ جب میرا نمبر چودہ پندرہ ہوا تو اعلان کر دیا گیا۔

''سید صاحب کو جس قدر خون کی ضرورت تھی اس سے کہیں زیادہ خون جمع ہو گیا ہے۔ اب ان کے لیے مزید خون کی ضرورت نہیں۔ آپ حضرات کا شکریہ۔''

خون نہ دے سکنے کا افسوس تو ہوا.... لوگ بکھر گئے مگر میرا دل وقار صاحب کو دیکھنے کے لیے بضد ہو گیا۔ میں نے گھوم گھام کر ان کا کمرا تلاش کر لیا۔ تمام راستے بند تھے مگر ایک کھڑکی کا پردہ سرک گیا تھا۔ میں نے دونوں ہتھیلیوں کی دوربین بنا کر شیشے سے اندر دیکھا.... وقار صاحب بہت لمبے لمبے سانس لے رہے تھے۔ انہیں آکسیجن لگی ہوئی تھی اور سانس لیتے ہوئے مشینی ربڑ کا غبارہ بھی پھول رہا تھا.... اور کبھی پچک رہا تھا۔ میں واپس مڑ آیا.... بس یہی ان کا آخری دیدار تھا۔

CS CamScanner

زندہ ہے

خلش مُظفر

کئی دنوں سے مجھے یہ خیال آتا ہے
یہ تو نے کون سی دنیا بسائی ہے آخر
جہاں میں تجھ کو کوئی خط بھی لکھ نہیں سکتا

مگر میں آج تجھے خط ضرور لکھوں گا
اُس ایک بدنما سائے کی معرفت جس نے
جدا کیا ہے تجھے تیرے ہم نشینوں سے

میں لکھ چکا ہوں تو اِک شخص مجھ سے کہتا ہے
یہ خط لکھا ہے ابھی جس کی معرفت تو نے
وہ ایک سایہ نہیں، موت کا فرشتہ ہے
وہ زندگی کی مہکتی ہوئی کتابوں کو
جلا کر جشن مناتا ہے، رقص کرتا ہے
اور ان مہکتی کتابوں کے سامنے پگلے

ترے بجھے ہوئے خط کی بساط ہی کیا ہے

یہ بات سُن کے مری ان خموش آنکھوں میں
گئے دنوں کے سبھی قافلے سمٹ آئے
وہ مجلسیں، وہ تری قربتوں کے شب و روز
جو مجھ سے روٹھ گئے تھے، وہ سب پلٹ آئے

تو میں بھی تیرے تصور میں، اُس جگہ پہنچا
جہاں پہ کل سبھی احباب جمع ہوتے تھے
جو تیری یاد دلاتا ہے، اب بھی وہ کمرہ!
مہک رہا ہے، ترے قہقہوں کی خوشبو سے
ترے خلوص کا ہر سمت اب بھی چرچا ہے
تو میرے واسطے اے دوست اب بھی زندہ ہے

CS CamScanner

سیّد وقار عظیم کے خطوط، انور سدید کے نام

ڈاکٹر انور سدید

سیّد وقار عظیم کا شمار اُردو ادب کے ان نقادوں میں ہوتا ہے جو اپنے وسیع مطالعے سے زیرِ تنقید ادب پارے پر بحث کرتے اور تہذیبی رکھ رکھاؤ سے اس کے داخلی محاسن اجاگر کرتے تھے۔ اور خوبی کی بات یہ کہ ان کی تنقید سے جو روشنی کی جوالا پھوٹ پڑتی تھی اس سے ان کی اپنی وضعدار شخصیت کا زاویہ بھی نمایاں ہوتا تھا، بعض لوگوں نے انہیں مارکسی تنقید کا نقاد شمار کیا ہے لیکن ان کی کشادہ نظری اس حقیقت کی غماز ہے کہ وہ ادب میں کسی خاص نظریے یا جامد وابستگی کو ضروری خیال نہیں کرتے تھے۔ ان کے ہاں ادبی تجربہ، زندگی کے تجربے ہی کا پرتو قرار دیا جاتا ہے وہ تنقید میں اس پرتو کو دریافت کرنے کی کاوش کرتے تھے۔ اور فن پارے پر اس انداز میں ہمدردانہ نظر ڈالتے تھے کہ اس کے فن اور جمالیاتی زاویے آشکار ہوتے چلے جاتے۔

اگلے روز پرانے کاغذات میں سے کوئی گم شدہ چیز تلاش کر رہا تھا کہ ناگاہ سید وقار عظیم صاحب کے چند خطوط پر نظر پڑ گئی۔ وقار صاحب نے یہ خطوط مجھے اس وقت لکھے تھے جب میں ''اُردو زبان'' سرگودھا کا مخفی مدیر تھا۔ یعنی پرچے کے سرورق پر عصمت اللہ صاحب کا نام چھپتا تھا۔ لیکن اس کی ترتیب و تدوین اور

نشرواشاعت میں نے اپنے ذمے لے رکھی تھی، سجاد نقوی جو بعد میں ''اوراق'' کے مدیرمعاون بنے اس کام میں میرا ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔

ماہنامہ ''اُردو زبان'' کے جولائی اگست 1968ء کے پرچے میں سید وقار عظیم کا مقالہ ''اُردو ادب کے بیس سال'' شامل اشاعت کیا گیا تو میں نے ''چہرہ بہ چہرہ'' کے مستقل عنوان کے تحت ''اُردو زبان'' کے قارئین سے ان کا تعارف کرانے کے لئے ایک چند سطری خاکہ لکھا جو حسبِ ذیل ہے۔

''سیّد وقار عظیم نے اُردو تنقید کو مشرقی وضعداری عطا کی ہے۔ داستانی ادب پر ان کی نظر بڑی گہری ہے۔ اُردو افسانے پر ان کی رائے حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ ان دنوں اورینٹل کالج لاہور کے شعبہ اُردو کے صدر ہیں جہاں ان کی حیثیت اس سایہ دار درخت کی سی ہے جس کی ٹھنڈی، نرم اور میٹھی چھاؤں سے ہر شخص فائدہ اٹھاتا ہے۔ دُور دُور سے علم وادب کے پیاسے آتے ہیں، سال دو سال، اس گھنے درخت کے خنک سائے تلے گاؤ تکیہ لگا کر آرام کرتے ہیں، جاتے ہوئے ازراہِ محبت شجرِ علم کی دو چار ٹہنیاں توڑتے ہیں۔ پھر ملک کے گوشے گوشے میں بکھر جاتے ہیں۔ سید صاحب نئے طلبہ و طالبات کا استقبال کرنے کے لئے چشم براہ ہو جاتے ہیں۔''

سید صاحب سے مجھے رسمی ملاقات کرنے کا موقعہ پہلے کبھی نہیں ملا۔ تاہم میں ان سے غیر متعارف نہیں تھا۔ 1946ء میں وہ پندرہ روزہ رسالہ ''آج کل'' جو دلی سے مرکزی حکومت کی نگرانی میں چھپتا تھا کے مدیر اعلیٰ بنے تو انہوں نے میرا ایک افسانہ ''پرچھائیاں'' اس پرچے میں شائع کیا تھا۔ اس افسانے کا معاوضہ مجھے

منی آرڈر سے مبلغ 25 روپے ملا اور بے پایاں خوشی کا باعث بنا۔ میں نے سید صاحب کے وہ مضامین پڑھ رکھے تھے جو ''آج کل'' میں ترقی پسند افسانہ نگاروں مثلاً کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک اور سعادت حسن منٹو پر شائع ہو رہے تھے۔ میں ان کے تنقیدی مضامین کا باقاعدہ قاری تھا۔ لیکن ان سے ملاقات کا کبھی شرف حاصل نہیں ہوا تھا۔ یوں بھی میں ان دنوں لاہور میں طالب علمی کی منزل سے گزر رہا تھا اور سید وقار عظیم جامعہ ملیہ دہلی میں تھے، یونیورسٹی میں دو ایک مختصر سی ملاقاتیں ہوئیں لیکن یہ غیر رسمی نوعیت کی تھیں، انہیں ''اردو زبان'' موصول ہوا تو سید صاحب نے خط لکھ کر میری عزت افزائی کی۔ ملاحظہ کیجیے۔

پہلا مکتوب: سید وقار عظیم۔ نگران، ادارہ تالیف و ترجمہ۔ پنجاب یونیورسٹی۔
17 اگست 1968ء۔ محبی انور سدید صاحب۔

''اردو زبان'' کے تازہ شمارے (جولائی اگست 1968ء) میں آپ نے میرے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کے لیے بے حد شکر گزار ہوں۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں آدمی کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کو جرم سمجھا جاتا ہے آپ کا بڑے خلوص اور محبت سے وہ سب کچھ کہنا جو آپ نے کہا ہے آپ کی بڑائی کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اعلیٰ رتبے عطا فرمائے اور حق کی حمایت میں آپ کا قلم اسی طرح اپنا منصب ادا کرتا رہے۔ زیادہ کیا لکھوں۔ آپ کی شخصیت کا جو اثر پہلی ملاقات میں قبول کیا تھا، آپ کے طرز عمل سے اس میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوئی ہے۔ مجھے اپنا دعا گو سمجھئے۔ والسلام۔ بندہ محبت۔ وقار عظیم۔

پس نوشت: دعا کیجیے کہ وہ مجھے ویسا بننے کی توفیق عطا فرمائے جیسا آپ

نے مجھے سمجھا ہے۔

سیّد وقار عظیم سے پہلی ملاقات پنجاب یونیورسٹی کے کانووکیشن پر ہوئی تھی، میں نے ایم اے اردو اکسٹرنل میں اول بدرجہ اول رہ کر گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔ اس لیے یونیورسٹی طلبہ سے جن میں امجد اسلام امجد، گلزار وفا چودھری، عطاالحق قاسمی شامل تھے میرا اعزاز زیادہ تھا۔ عطائے ایوارڈ کے بعد میں سیّد صاحب کو سلام پیش کرنے کے لیے حاضر ہوا اور اعتراف کیا کہ وہ میرے غائبانہ اُستاد ہیں اور میں نے ایم اے کی تیاری میں ان کی کتابوں سے بہت استفادہ کیا ہے۔ سیّد صاحب یہ سُن کر بہت خوش ہوئے اور میری پیٹھ تھپک کر کہا۔

''ایک پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت میں اول آکر اور ریکارڈ قائم کرکے آپ نے یونیورسٹی کی سابقہ تاریخ میں اضافہ کیا ہے؟'' میں نے عرض کیا: ''غالباً قلم سے میرا طویل رشتہ اس کامیابی میں معاون بنا ہے۔ میرا ایک افسانہ ''پرچھائیاں'' آپ نے 'آج کل' دہلی میں 1946ء میں شائع کیا تھا''۔

یہ سُن کر تو سیّد صاحب کِھل اٹھے۔ بولے: ''دیکھا، میں نے ہونہار بروا کے پات پہچان لیے تھے!''

اتنے میں رشید امجد، امجد اسلام امجد اور اقبال منہاس ممتاز حسن صاحب کو لے آئے اور ان سب کے ساتھ ہم نے تصویر کھنچوائی۔ میں پچھلی صف میں کھڑا ہونے لگا تو سیّد صاحب نے مجھے اگلی صف میں ممتاز صاحب کے ساتھ جگہ دی۔

اتنی شفقت اور محبت کے باوجود میں سیّد وقار عظیم صاحب سے قربت کا یا خط کتابت کا تعلق قائم نہ کر سکا۔ تا آں کہ نومبر 1968ء میں ان کا ایک اور خط ملا

جو درج ذیل ہے۔

دوسرا خط: سید وقار عظیم۔ نگران، ادارہ تالیف و ترجمہ۔ پنجاب یونیورسٹی

21 نومبر 1968ء۔ محبی سلام مسنون۔

اُردو زبان کا تازہ شمارہ دیکھا۔ آپ ایک ایسے زمانے میں جب حق پسندی اور حق گوئی کو گناہ کبیرہ سمجھا جاتا ہے حق بات کہنے میں کسی تامل سے کام نہیں لیتے۔ اللہ جزائے خیر دے۔

اس مرتبہ میری ایک کتاب ''اقبال، شاعر اور فلسفی'' میرے بچوں نے خود چھاپی ہے۔ اس کے دو نسخے ارسال کر رہا ہوں۔ ایک آپ کے لیے اور ایک محبی وزیر آغا کے لیے۔ قبول فرمائیے۔

سرگودھا میں اگر کوئی دکاندار اس کے چند نسخے فروخت کے لیے منگانا چاہے تو اسے 25 فیصد کمیشن پر بھیجے جا سکتے ہیں نسخے خواہ تعداد میں کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں، بھیجنے میں عذر نہیں ہوگا۔ مثلاً جو صاحب 5 نسخے منگائیں گے انہیں 45 روپے پہلے بھیجنے ہوں گے۔ اس سلسلے میں آپ زیادہ تردد نہ کیجیے۔ چلتے پھرتے یہ کام ہو جائے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ جانے دیجیے۔

سرگودھا کے احباب کو سلام۔

ایک صورت اور ذہن میں آئی۔ چند طلبہ یا شائقین ادب مل کر اگر کچھ نسخے ایک ساتھ منگا لیں تو انہیں بھی کتاب بارہ روپے کے بجائے نو روپے میں بھیج دی جائے گی۔ اس صورت میں پیشگی منی آرڈر آنا ضروری ہے۔ بھیجنے کا خرچ ناشر برداشت کرے گا۔ منی آرڈر بھیجنے کا پتہ یہ ہوگا۔ اطہر وقار۔ ناظم تصنیفات 17 ای،

بلاک سی، سرہندی روڈ، سمن آباد لاہور۔ مخلص۔ وقار عظیم

سیّد صاحب کا یہ مکتوب سجاد نقوی نے پڑھا تو وہ فوراً تعاون پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے نہ صرف اپنے کالج کے لیے کتابیں منگوائیں بلکہ رشید بک ڈپو کے لیے بھی آرڈر بھجوایا۔ سیّد صاحب نے مزید شفقت یہ کی کہ دوسرے ناشرین کی مطابقت میں کمشن 33 فیصد کر دیا۔ میں نے 1970ء میں اپنے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''فکر و خیال'' کے عنوان سے مرتب کیا تو اس پر سیّد وقار عظیم صاحب سے دیباچہ لکھوانے کی خواہش پیدا ہوئی، میری گزارش کے جواب میں انہوں نے فرمایا:

تیسرا خط: سیّد وقار عظیم۔ نگران، ادارہ تالیف و ترجمہ۔ پنجاب یونیورسٹی

16 ستمبر 1970۔ مجی سلام مسنون۔

میں 14 اگست کو ایک مہینے کے لیے کراچی گیا تھا۔ کل شام واپسی ہوئی، آپ نے 15 اگست کو جو خط مجھے لکھا تھا۔ وہ آج دیکھا۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ میں نے جواب نہیں دیا۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ کے مضامین کا مجموعہ چھپ رہا ہے۔ میں بڑی خوشی سے پیش لفظ لکھوں گا۔ اگر دیر نہ ہوئی ہو تو مسودہ بھجوا دیجیے۔ تاکہ اسے پڑھ کر اس پر کچھ لکھ سکوں۔ والسلام۔ مخلص۔ وقار عظیم

حسبِ ارشاد میں نے سیّد صاحب کو مسودہ بھجوا دیا اور مناسب وقت تک پیش لفظ کا انتظار بھی کیا۔ مجھے گمان تھا کہ سیّد صاحب اپنی مصروفیات کی بنا پر شاید پیش لفظ لکھنے کے لیے وقت نہ نکال سکیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ پیش لفظ بروقت نہ ملا تو میں نے کتاب کی اشاعت میں تاخیر نہ کی۔ سیّد وقار عظیم صاحب کو کتاب پہنچی تو

انہوں نے بے حد حوصلہ افزا خط لکھا۔

چوتھا خط: 7ای، بلاک سی، سمن آباد، لاہور، فون: 69319۔

30 جنوری 1972ء۔ عزیزی و مشفقی سدید صاحب۔ سلام مسنون، کتاب ملی۔ ساتھ ہی خط بھی، کتاب دیکھ کر جی خوش ہوا اور شرمندگی کا شدید احساس بھی، آپ نے ایک خدمت میرے سپرد کی تھی۔ لیکن ان دنوں مجھے قطعاً یکسوئی نہیں تھی۔ اس لیے آپ کی خوشی پوری نہ کر سکا۔ جو یقیناً آپ کی طرح میری خوشی بھی تھی۔

آپ کے اسلوبِ تنقید کی صفائی، خلوص اور دیانت داری کو ہمیشہ سراہتا رہا ہوں اور ان مضامین سے کبھی کبھی کچھ سیکھا بھی ہے۔ آپ کے مضامین کا یکجا ہو کر چھپ جانا اُردو ادب کے طالب علموں کے لیے خوشی کا موقع ہے۔ نوجوان طالب علم اور اُردو کے عام قاری کو اس کتاب میں بہت سی کام کی باتیں بھی ملیں گی اور بعض چیزوں میں اس کی رہنمائی بھی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو زیادہ فرصت دے کہ آپ زیادہ لکھ سکیں۔ دعا گو وقار عظیم۔

یہ ایک ایسے بالغ نظر اور کشادہ فکر ادیب کے خطوط ہیں جو نئے لکھنے والوں کی ادبی صلاحیتوں کو پہچاننے کا سلیقہ رکھتا ہے اور جب اپنے سے نسبتاً کم عمر ادبا سے بات کرتا ہے تو مخاطب کے احساس انا کو توانائی اور اعتماد عطا کرتا ہے۔ سید صاحب سے میری ملاقاتیں نسبتاً کم تھیں، میں نے زیادہ وقت لاہور سے بیرون سرگودھا، فیصل آباد، جڑانوالہ اور کوٹ ادو جیسے دور افتادہ مقامات پر گزارا لیکن جب کبھی لاہور میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقعہ ملتا تو ان کی

CS CamScanner

تہذیبی شخصیت، وضعداری اور بے انا گفتگو بے حد متاثر کرتی اور ان سے ملاقات کے بعد اپنا دامن بھرا ہوا نظر آتا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

* * *

دبلے پتلے تو اور لوگ بھی ہیں مگر دبلا پتلا ہونا سید وقار عظیم پر جچتا تھا۔ وہ کبھی کمزور نہ لگے وہ ایسے ہی بنائے گئے تھے۔ شیروانی تو اور پروفیسر صاحبان بھی پہنتے تھے اور سفید پاجامہ مگر جیسے یہ لباس وقار عظیم کے لئے بنا تھا۔ ان کے سراپے کے لئے یہی لباس خاص تھا۔ ایک بڑا مفلر بھی ان کے گلے میں ہوتا تھا۔ اب تو مفلر کا رواج اتنا نہیں۔ تب تھا۔ یہ مفلر کی شان تھی کہ اسے سید وقار عظیم نے اپنے لباس کا حصہ بنایا۔

وہ آہستگی اور آسودگی سے بولتے تھے۔ نرم خو جوئے رواں کی طرح۔ ان کی آواز پورے ماحول میں سرایت کرتی تھی۔ کہ ان کی باتیں سرگوشی کی طرح دل میں گونجتی تھیں۔ جن لوگوں نے انہیں دیکھا اور سنا۔ وہ خوش نصیب ہیں۔

وہ ہمارے ساتھ کبھی بے تکلف نہ ہوئے مگر ایک گہری اپنائیت ان کی آنکھوں میں سوئی رہتی تھی۔ وہ اسم بامسمہ انسان تھے۔ اپنے نام کے سارے معانی جانتے تھے۔ ان کے نام اور کام میں کوئی فرق نہ تھا۔ اتنا باوقار آدمی۔ ایسا عظیم آدمی اور کون ہوگا۔ وہ تعلیم و تدریس کے شعبے کے یکا و تنہا آدمی تھے۔

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی

* * *

CS CamScanner

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

ایک عظیم انسان

اصغر سودائی

شخصیات پہ قلم اُٹھاتے ہوئے کچھ ڈر سا لگتا ہے کیوں کہ شاذ ہی ایسی شخصیات ملتی ہیں جن میں کوئی نہ کوئی خامی موجود نہ ہو اور جب اُن کی نشان دہی کر دی جائے تو وہ چیں بجبیں نہ ہوں۔ آج کل حلقہ بندی اور گروہ پروری کی وجہ سے کچھ لوگ تو طلسماتی طور پر اُس منارہ عظمت کی زینت بنا دیے جاتے ہیں جس کی بلندی کے پیش نظر اُن کے زمین بوس ہونے کا گمان تک نہیں گزرتا لیکن زمانے کی ایک کروٹ کے ساتھ ہی شخصیاتی طلسم کا یہ تمام حصار فوراً شکست و ریخت کی نظر ہو جاتا ہے۔ بعینہ کچھ شخصیات ایسی بھی ہیں جن کی شخصی اور انفرادی خوبیاں تو اظہر من الشمس ہوتی ہیں لیکن طائفہ پرست اُن کو یا تو اُبھرنے نہیں دیتے یا پھر اُن پر قلم اُٹھاتے ہوئے اُن کی انصاف پسندی کو زنگ لگ جاتا ہے۔ وقار صاحب کی شخصیت میں نہ تو "طائفہ پرستوں" کے لئے کوئی مقام تھا اور نہ وہ اُن لوگوں کو درخور اعتنا سمجھتے تھے جو اپنی مخصوص منصوبہ بندی کی وجہ سے کسی اور اہل قلم کو اُس کا صحیح مقام دینے میں بخل سے کام لیتے تھے۔ وقار صاحب ایک فقید المثال ادیب تھے۔ ایک اعلیٰ پائے کے تنقید نگار تھے ایک شفیق و مکرم اُستاد تھے اور ان تمام خوبیوں پر مستزاد ایک عظیم انسان تھے۔ وہ جس سے بھی ملے اور جہاں بھی گئے اپنی ژرف نگاہی، عالی حوصلگی اور بیدار مغزی کی داستانیں چھوڑ آئے۔ یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ انہوں نے زندگی کے کسی دور

CS CamScanner

میں بھی اپنی وضع داری پر آنچ نہیں آنے دی۔ وہ بحیثیت ایک مقرر کے تقریر میں مصروف ہوں یا بحیثیت ایک ناقد کے تنقید میں، ایک معلم کے روپ میں تدریس میں منہمک ہوں یا ایک دوست کے پردے میں دوستوں کی مشکلات کی گرہ کشائی میں وہ وہی وقار صاحب ہوتے تھے جنہیں مقرروں، ناقدوں، معلموں اور دوستوں کے حلقوں میں اُن کی مربیانہ گفتگو اور بے پایاں اخلاص سے صاف پہچانا جاسکتا تھا۔ بڑے لوگوں کے متعلق اکثر بہت سی الف لیلوی داستانیں مشہور ہوتی ہیں۔ اکثر لوگ اُن کے پرستار ہوتے ہیں لیکن اُن سے مل کر اُن کا تاثر بدل جاتا ہے اور شخصیت پرستی کا وہ بُت جو اُن کے ذہن میں استوار ہوتا ہے پاش پاش ہوجاتا ہے اُس کی بہت سی وجوہات ہیں لیکن ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ یہ لوگ اپنی ذات کو کئی غلافوں میں چھپا کر رکھتے ہیں اور اُن کے مداح جب آہستہ آہستہ ان مصنوعی غلافوں کو ہٹانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو حقیقت کا تلخ چہرہ دیکھ کر کانپ جاتے ہیں۔ میں زندگی میں بہت سے ایسے آدمیوں سے ملا ہوں اور اکثر اوقات خوابوں کے سنہرے تانے بانے بُن لینے کے بعد جب حقیقت تک رسائی حاصل کرتا ہوں تو سوائے مایوسی کے اور کچھ حاصل نہیں کر پاتا۔ وقار صاحب اِن برخود غلط قسم کے اکابرین میں سے نہیں تھے۔ وہ جو ظاہر میں تھے وہی اُن کا باطن تھا۔ اُن کو آپ ایک بار نہیں دو بار نہیں سینکڑوں بار ملیں پھر بھی آپ کو وہی وقار صاحب ملیں گے جنہیں آپ نے پہلی بار دیکھا ہو۔ وہی پتلا دبلا سا انسان، وہی مسکراتا چہرہ، وہی لہروں کی طرح رواں دواں گفتگو، وہی طبیعت کا انکسار، وہی شفقت، وہی محبت اور وہی اُردو زبان سے وابستگی اور محبت کا اظہار آپ کو قدم قدم پر ملے گا۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگر وہ آپ کے مخالف کوئی بات بھی کریں تو لہجے کا میٹھا پن اور زبان کی نرماہٹ آپ کو اِس امر کی اجازت ہی نہیں دے گی

کہ آپ اپنے مخالف کو دشمن سمجھ بیٹھیں وقار صاحب بھی لوگوں سے مختلف موضوعات پر اختلاف کرتے تھے اور کئی بار ایسی محفلوں میں جانے کا اتفاق بھی ہوا جہاں وقار صاحب نے اپنی روایتی صاف گوئی کو قائم رکھتے ہوئے اہل مجلس سے اختلاف رائے کیا لیکن وہ ناپسندیدگی کا تاثر جو اکثر اوقات ایسی صحبتوں کا طرہ امتیاز ہوا کرتا ہے کبھی پیدا نہ ہوا۔ اس میں وقار صاحب کی شرافت، بلند اخلاقی اور حسن گفتار کا بہت سا عمل دخل ہوتا تھا کہ دشمن بھی اُن کو اپنا دشمن نہیں دوست تصور کرتے تھے۔

وقار صاحب سے بالمشافہ بات ہو یا اُن کی تصانیف کی ورق گردانی اُن سب کے پسِ منظر میں ایک ایسا انسان دکھائی دے گا جس میں وضع داری، ٹھہراؤ، سلیقہ مندی اور انسان دوستی کی جھلکیاں صاف دکھائی دیں گی۔ لطف یہ ہے کہ اُن کی ضخیم سے ضخیم کتاب کو بھی آپ ایک نشست میں پڑھ جانے کا تہیہ کر لیں گے اور اُس وقت تک کسی اور چیز کی طرف طبیعت کا انعطاف ہی نہیں ہوگا جب تک کتاب کا آخری لفظ تک نہ پڑھ لیا جائے۔

اس میں تحریر کے جادو کا شائبہ تو ضرور ہے مگر مصنف کی انصاف پسندی اور بے داغ اظہار رائے کا بھی کافی حصہ ہے۔ مجھے اُن کی تحریروں پر پُرسکون لہروں کا سا احساس ہوتا ہے جن کا مقصد وحید یہ ہوتا ہے کہ وہ مسافروں کی کشتیوں کو بغیر ہچکولوں کے ساحل مراد تک پہنچا دیں۔ میں نے اُن کی جو کتاب بھی پڑھی۔ بغیر کسی اُلجھن، بغیر کسی اٹکاؤ اور بغیر کسی زیر و بم کے تحریر کے متن اور اُس کی روح تک پہنچ گیا اور مجھے کسی مقام، کسی موڑ اور کسی پڑاؤ پر کوئی بھی دشواری پیش نہ آئی۔ صاحب کتاب کے لئے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہو سکتا ہے کہ قاری اُس نصب العین اور اُس نقطۂ معراج تک فوراً رسائی کرے جو مصنف کا مقصود نظر ہے۔

سیالکوٹ سے وقار صاحب کو ایک خاص اُنس تھا۔ یوم اقبال کی تقریبات پر وہ جب بھی گذارش کی گئی ضرور تشریف لائے بلکہ انہوں نے بار بار شرکت فرما کر اتنی اپنائیت کا اظہار کیا کہ بعض اوقات یہ باور کرنا مشکل ہو گیا کہ آیا ان تقریبات کو وقار صاحب منعقد کرواتے تھے یا اہلیان سیالکوٹ۔ حقیقت یہ ہے کہ سیالکوٹ نے آج تک اقبال کے پیغام کی نشر و اشاعت میں جو بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اُس کا سہرا وقار صاحب ہی کے سر ہے۔ اور شہر اقبال کے رہنے والے اُن کی اقبال شناسی اور سیالکوٹ دوستی پر جتنے بھی شکر گزار ہوں کم ہے۔

وقار عظیم صاحب کی انسانیت، وضع داری اور ادبی انہماک کی میرے دل میں بڑی قدر تھی۔ انتقال سے کچھ ہی دیر پہلے وہ چند کتابیں لے کر جو میں نے اُن سے مانگی تھیں۔ میرے گھر پر تشریف لائے اور دیر تک اپنی طالب علمی کے علی گڑھ، اپنے بعض تجربات اور حالیہ مشاغل کی باتیں کرتے رہے۔ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کی شائستہ دھیمی آواز آخری بار سُن رہا ہوں۔ انہوں نے بڑی بامعنی زندگی گزاری، جو چیزیں انہیں عزیز تھیں۔ ان کا حق پورے لگاؤ اور لگن کے ساتھ آخر دم تک ادا کرتے رہے اور بڑا پاک صاف نقش لوگوں کے دلوں پر چھوڑ گئے۔

پروفیسر خواجہ منظور حسین (علیگ)

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

ایک تہذیبی دبستان

ڈاکٹر غلام حسین اظہر

وقار صاحب مجھے تنہا یاد نہیں آتے۔ ان کی یاد کی کسک کے ساتھ ایک پورا عہد آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ وقار صاحب یقیناً اپنی ذات میں ایک تہذیبی دبستان تھے۔

غالباً چھٹی یا ساتویں جماعت میں اُردو کی جو کتاب ہمیں پڑھائی گئی ان کے مرتبین میں ان کا نام بھی تھا۔ اس کتاب کا ایک مضمون مجھے کبھی نہیں بھولا۔ یہ مضمون مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت پر تھا۔ یہ مضمون کس کا لکھا ہوا تھا یاد نہیں۔ لیکن مجھے یہ یقین محکم ہے کہ میرے اور وقار صاحب کے درمیان قرب کی بنیاد یہی شخصیت بنی۔ ایم اے میں جب میں اپنے مقالہ کی منظوری کے لئے اورینٹل کالج کے ان اساتذہ کے بورڈ کے سامنے پیش ہوا جنہیں مقالہ لکھنے کی منظوری دینا تھی، تو وقار صاحب نے میرے مطبوعہ مقالات کی فہرست پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا: آپ نے تو خاصے مضامین لکھے ہیں، ان مضامین میں ایک مضمون ‘‘جوہر کی غزل’’ بھی تھا، جوہر کے نام کو پڑھ کر وقار صاحب چونکے اور فرمایا: ‘‘یہ جوہر مولانا محمد علی جوہر ہیں؟’’ میں نے عرض کیا: ‘‘جی ہاں۔’’ اس پر انہوں نے فرمایا: ‘‘مولانا جوہر کا کوئی شعر سنائیں۔’’ میں نے یہ شعر سنایا:

CS CamScanner

یقین آنے کو آ جائے گا تیرے عہد و پیاں کا
تیری آنکھ اے بُت وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے

وقار صاحب نے یہ شعر سن کر مجھے زندانی شاعری کے موضوع پر مقالہ لکھنے کی اجازت دے دی۔ اور عنوان یہ تجویز کیا ''اُردو کی جیہ شاعری'' اس مقالہ کی تکمیل کے لئے میں انجمن ترقی اُردو اور جامعہ کراچی کے کتب خانوں سے استفادہ کرنا چاہتا تھا، اس غرض کے لئے میں نے جب ان سے کراچی جانے کا ذکر کیا۔ تو وقار صاحب نے مجھے دو تعارفی خط دیئے۔ ایک ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب اور دوسرا مشفق خواجہ صاحب کے نام، یہی دو خطوط ان حضرات سے میری شناسائی کا ذریعے بنے۔ جب میرا مقالہ مکمل ہو گیا، تو ایک روز کینٹین کے پاس مجھے اور اُستاد گرامی ڈاکٹر افتخار صدیقی کو کھڑے دیکھ کر وقار صاحب ہمارے پاس آئے۔ ڈاکٹر افتخار صدیقی صاحب سے چند باتیں کرنے کے بعد آپ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا: '' آپ کا مقالہ بہت اچھا ہے۔'' پھر آپ نے افتخار صاحب سے مقالہ کی تکمیل کے لئے میری محنت کی تعریف کی، ان کا شاگردوں اور عزیزوں کی حوصلہ افزائی کا یہ مخصوص انداز تھا۔ وہ ہر محنتی اور باصلاحیت شاگرد کا حوصلہ بڑھاتے تھے اور بڑے بڑے مشکل مراحل میں عملاً مدد کرتے تھے، کئی طلبا اور طالبات کو وقار صاحب پبلشرز سے مفت کتابیں دلواتے، اورینٹل کالج کے متعدد طلباء کے داخلے کی رقم اپنی گرہ سے دیتے، ان کا کئی برس تک یہ معمول رہا کہ وہ اپنے سبھی ساتھیوں سے ہر ماہ معمولی سی رقم لے کر مستحق طالب علموں کی مدد کرتے تھے۔

آج کے اُستاد میں وہ شفقت، محبت، دلنوازی اور دلجوئی کا عنصر غائب

ہے، جو ماضی میں اس کی شخصیت کا جز و لاینفک تھا۔

ایک دن باتوں ہی باتوں میں، میں نے اورینٹل کالج میں ہندی کی کلاسز کے اجراء کا ذکر کرتے ہوئے اس خواہش کا ذکر کیا کہ میں ہندی پڑھنا چاہتا ہوں لیکن اب داخلہ لینا ممکن نہیں۔ وقار صاحب نے فوراً کہا: ''ہندی کے دو تین ابتدائی سبق مجھ سے پڑھ لیں۔ پھر آپ خود چل نکلیں گے۔'' چنانچہ اس کے بعد میں دو تین روز شام کو ان کے ہاں ہندی پڑھنے جاتا رہا، وہ خود ہی فرماتے: ''اب اگلا سبق چلائیں۔'' پھر وہ کاغذ اور قلم لے کر مجھے ہندی کے حروف کی پہچان کرواتے، ہندی زبان کی اس تدریس نے ہندی کی شُد بُد پیدا کردی، اورینٹل کالج میں ہندی کی تدریس کے آغاز پر وہ بے حد خوش تھے، ان کا موقف یہ تھا کہ اُردو پڑھنے کے لئے بھی ہندی کا جاننا ضروری ہے اور ملکی حالات کا تقاضا بھی یہ ہے کہ ہندی سے واقفیت پیدا کی جائے۔ تاکہ ہم بھارت کی سرگرمیوں سے باخبر رہ سکیں۔

ان کی نگرانی میں پی ایچ ڈی اور ایم اے کے متعدد تھیسس لکھے گئے۔ ان کی نگرانی میں جو کام ہوا، وہ پورے افسانوی ادب پر محیط ہے، شاید ہی افسانوی ادب کا کوئی ایسا موضوع ہوگا، جس پر انہوں نے کام نہ کروایا ہو، جس محبت، شفقت، خلوص اور لگن سے وہ ریسرچ اسکالرز کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کرتے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ان کا کتب خانہ طالب علموں کے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا، طالب علموں کی سہولت کے لئے وہ تنقیدی کتابیں، نچلی منزل میں اپنے سونے کے کمرے میں یا قریب کے کمروں میں رکھتے تھے تاکہ جب بھی کوئی طالب علم آئے تو وہ کتاب نکال کر اسے دے سکیں۔ پریم چند کے ''سوزِ وطن'' کی

مجھے تلاش تھی، وقار صاحب سے ذکر کیا، تو وہ کافی دیر تک یہ کتاب تلاش کرتے رہے، لیکن جب یہ کتاب نہ ملی، تو دوسرے دن انہوں نے وہ الماری مجھے دکھا دی جن میں افسانے کی کتابیں تھیں اور مجھے کتاب تلاش کرنے کی اجازت دے دی۔ میں کتاب تلاش کرتا رہا اور وہ یہ کہہ کر نیچے چلے گئے ''میں کام کر رہا ہوں، آپ جب کتاب ڈھونڈ لیں۔ تو نیچے آجائیں۔'' ایک گھنٹے کی تلاش کے بعد میں نیچے گیا۔ ''سوز وطن'' مجھے نہ مل سکی، لیکن اور نایاب کتابیں میرے ہاتھ میں تھیں، پھر یہ معمول بن گیا کہ جب بھی کسی کتاب کا ذکر کیا، تو وہ فرماتے: ''خود تلاش کر لیجیے۔'' ان کے یہاں سے میں خالی ہاتھ کبھی نہیں لوٹا، پی ایچ ڈی کے مقالہ کے خاکے کی تیاری کا میں نے آغاز کیا، تو دوسرے دن وہ خود ہی میرے لئے دو کتابیں لے آئے، ان میں ایک

A hero with thousand faces. اور دوسری

An assesment of twentieth century literature. تھی۔

کبھی یہ نہیں ہوا۔ ان کے ہاں جو کتاب ہو، وہ کوئی طالب علم مانگے، تو وہ نہ دیں، بہت سے کاموں میں مصروف ہونے کے باوجود وہ یہ کبھی نہیں بھولتے تھے کہ آج مجھے فلاں طالب علم کے لئے کون سی کتاب لے کر جانی ہے۔ اگر ان کے پاس ذاتی لائبریری میں کتابیں نہ ہوتیں۔ تو دوسرے کتب خانوں سے دلواتے، اپنا کارڈ دیتے، ان کے کارڈ پر میں نے یونیورسٹی سے کئی کتابیں نکلوائیں، جہاں کہیں کتاب کی موجودگی کا علم ہوتا، اس جگہ کی نشاندہی کرتے۔

کتابوں کی فراہمی کے علاوہ وہ اپنی نگرانی میں لکھے جانے والے مقالے

کی ایک ایک سطر کو بغور پڑھتے تھے۔ عدیم الفرصت ہونے کی وجہ سے وہ مقالہ اپنی گاڑی میں ساتھ رکھ لیتے، اور گھر سے یونیورسٹی پہنچنے تک جو وقت ملتا۔ اس میں مقالہ کی اصلاح کرتے، بعض طالب علموں کو وہ تھیسس Dictate تک کرواتے تھے۔ بولتے وہ ہمیشہ دھیمی آواز سے تھے پہلے دن جب وہ ہماری کلاس میں آئے۔ تو پوچھا: ''میری آواز سنائی دے رہی ہے؟'' اور پھر مسکراتے ہوئے فرمایا: ''دو سال ایسے ہی سنائی دے گی''۔ لیکن دھیمی آواز کے باوجود ان کے پڑھانے کے انداز میں جاذبیت تھی، وہ افسانوی ادب اور اقبال پڑھایا کرتے تھے، سب سے پہلے وہ مصنف اور زیر بحث کتاب اور نظم کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالتے، اور اس کے بعد فنی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے۔ وہ سوالات کو خوش آئند تصور کرتے تھے، لیکن ایک بات پر زور دیتے تھے کہ ایک مصنف پر ان کے لیکچر ختم ہونے کے بعد طالب علم ان سے سوالات پوچھیں، لیکچر کے دوران سوال کرنے سے ان کا خیال تھا کہ لیکچر کا تسلسل اور لطف ختم ہو جاتا تھا۔ جب کسی مصنف کے بارے میں ان کا لیکچر ختم ہو جاتا تو خود سوال کرنے کی اجازت دیتے اور تلفظ کی صحت اور صحیح الفاظ کے استعمال پر بہت زور دیتے تھے۔

اُستاد اور شاگرد کے بارے میں ان کا تصور یہ تھا کہ اُستاد صحیح معنوں میں وہ ہے جو طالب علم کی تعلیمی زندگی سے ہٹ کر اس کی نجی زندگی میں بھی شریک ہو۔ اسے شاگرد کے دُکھ درد کا علم ہو، اور ان کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ اُستاد کے بارے میں شاگرد کو یہ یقین ہونا چاہیئے کہ وہ اس کا علمی حیثیت سے ہی رفیق نہیں بلکہ زندگی کی الجھنوں کو سلجھانے میں بھی معاون ثابت ہوگا، صرف اسی صورت میں ہی

CS CamScanner

اُستاد اور شاگرد کا رشتہ مضبوط رشتہ ہوتا ہے۔ وہ اسی وجہ سے اپنے طالب علموں سے ذاتی سطح پر تعلقات استوار کرتے تھے۔ اور ان کی عملی زندگی میں بھرپور مدد کرتے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ان کا اپنے شاگردوں سے تعلق اور بڑھ جاتا تھا بلا جھجک بہت سے طالب علم ذاتی کام لے کر ان کے پاس جاتے اور کبھی مایوس نہ لوٹتے، وہ یہ خیال کرتے تھے کہ کون سی ملازمت، کون سے طالب علم کے لئے موزوں ہے، میں تعلیم کے بعد بے روزگاری کے ایام میں ان کے پاس حاضر ہوا۔ انہوں نے فرمایا: ”جگہ تلاش کیجیے، میں سفارش کردوں گا۔ جامعہ ملیہ کراچی میں ایک جگہ خالی تھی۔ وہاں میں نے ایک شخص کا تقرر کروا دیا ہے۔“ ان کی مراد انیس احمد اعظمی صاحب تھے۔ اس کے بعد میں پھر ملا اور بتایا کہ ترقی اُردو بورڈ میں ایک جگہ نکلی ہے۔ یہ سُن کر فرمایا: ”ہاں یہ کام آپ کے مزاج کے مطابق ہے۔ میں انہیں لکھوں گا۔“ لیکن مجھے کچھ دنوں بعد انبالہ کالج سرگودھا میں ملازمت مل گئی۔ تو میں نے یاددہانی نہ کرائی جب انیس اعظمی صاحب نے انہیں بتایا کہ انبالہ مسلم کالج سرگودھا میں مجھے ملازمت مل گئی ہے۔ تو وہ بے حد خوش ہوئے۔

انبالہ کالج میں دورانِ ملازمت ایک بار یوں ہوا کہ بورڈ نے انیس اعظمی صاحب کو پرچوں کے دو پارسل بھیج دیئے۔ جن میں سے ایک کی واپسی ضروری تھی۔ میں اور انیس صاحب، وقار صاحب سے ملے کہ دوسرا پارسل بورڈ مجھے دے دے۔ اس وقت میرا دو سال کا تجربہ نہ تھا۔ وقار صاحب نے مدد کرنے کی حامی بھرلی۔ چنانچہ بورڈ نے مجھے ممتحن مقرر کر دیا، دوسروں کے کاموں کو وہ ذاتی کام سمجھ کر ان میں دلچسپی لیتے تھے، اپنے شاگردوں کے مسائل و مصائب کے

بارے میں اکثر دریافت کرتے رہتے تھے۔ ہمارے ایم اے کے ساتھیوں میں سے اکرم جلیلی صاحب، 1964ء کے بعد غالباً ایک بار بھی وقار صاحب سے نہ ملے، لیکن جب بھی اُن کا ذکر آتا یہ ضرور پوچھتے کہ ان کے سر کی تکلیف کا کیا حال ہے۔ حالانکہ اس بیماری کو دور ہوئے کئی سال ہو گئے۔ ایک بار میں نے بتایا کہ سر درد کی انہیں تکلیف نہیں لیکن بعض دیگر بیماریوں کی وجہ سے وہ پریشان ہیں۔ ان کی علالت کا سُن کر پوچھا: ''اُن کا گھر کہاں ہے؟'' پھر کہنے لگے: ''وہاں جانا مشکل ہے، کسی روز ان کے ہاں کالج میں ان کا پتہ کرنے جاؤں گا۔'' اسی خوئے دلنوازی کی وجہ سے انہوں نے اپنے طالب علموں اور ساتھیوں کے دلوں میں گھر کر لیا تھا، اور جب ان کی بیماری کی خبر ان کے شاگردوں اور دیگر ملنے والوں تک پہنچی تو متعدد افراد فوراً ہسپتال اور ان کے گھر پہنچے۔ تعلقات نبھانے میں بے حد وضعدار تھے۔ ان کے جنازے سے واپس آکر شام گئے تک ان کے گھر جو افراد بیٹھے تھے، ان میں حمید احمد خان صاحب کے صاحبزادے بھی تھے۔ وہ وقار صاحب کے بیٹے اظہر صاحب سے کہہ رہے تھے کہ جب میرے والد وائس چانسلر تھے تو اکثر یونیورسٹی کے اساتذہ عید کے موقع پر ہمارے ہاں آیا کرتے تھے لیکن یونیورسٹی سے الگ ہونے اور ان کی وفات کے بعد ہر عید کے موقع پر جو صاحب لازماً آتے رہے، وہ صرف وقار صاحب تھے۔

بچوں کی نفسیات سے آگہی اور ان کی تربیت کے گہرے احساس کی وجہ سے وہ اپنے بچوں کی اعلیٰ تربیت کرنے کے کام میں کامیاب رہے۔

وہ شائستگی جو ان کی تمام اولاد میں موجود ہے۔ وہ بہت کم گھرانوں کو

CS CamScanner

نصیب ہو سکی، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وقار صاحب کی ذات میں خود اتنی جاذبیت تھی کہ ان کی عملی مثال نے ان کے بچوں کو متاثر کیا، وہ اقدار کی تلقین نہیں کرتے تھے، وہ خود اعلیٰ اقدار کی تجسیم تھے، فکر و نظر اور قول و عمل کی وحدت نے ان کی اولاد کو ان کی زندگی کو عملی نمونہ کے طور پر قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ اس تربیت میں وقار صاحب کی اہلیہ کے مقام کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، وقار صاحب کے سبھی بچوں سے مل کر طمانیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ وقار صاحب کی وفات کی خبر سُن کر جب میں حاضر ہوا، تو میاں (وقار صاحب کے سب سے بڑے بیٹے) سے لپٹ کر میں دیر تک روتا رہا میاں، مجھے تھپکی دے رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے: ''بھائی صبر کیجیے صبر کیجیے۔'' مجھے یوں لگا، جیسے میرے والد فوت ہو گئے ہیں اور میاں میری دلجوئی کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میاں پوچھ رہے تھے: ''آپ کا قیام کہاں ہے؟'' میں نے انہیں بتایا: ''میرے ٹھہرنے کی فکر نہ کیجیے۔'' وہ اُٹھ کر اور کاموں میں مصروف ہو گئے۔ پھر اندر سے پیغام بھیجا کہ اظہر صاحب کو بلا لائیں۔ میں اندر گیا تو معذرت کے بعد کہا: ''معاف کیجیے، میں ذرا مصروف تھا۔'' اب میں اس برآمدے میں بیٹھا تھا۔ جہاں وقار صاحب چارپائی پر بیٹھ کر لکھا کرتے تھے۔ میری آنکھوں سے پھر آنسو جاری ہو گئے۔ میاں تسلی دے رہے تھے۔ ''(Please) روئیے نہیں۔ چائے پیجیے، آپ سردی میں بہت دور سے چل کر آ رہے ہیں۔'' میں چائے پی چکا تو کہنے لگے: ''اب آپ آرام کیجیے، کل قُل ہے تین بجے۔'' میں جب رخصت ہوا، تو گڈو (وقار صاحب کے بیٹے اظہر کو وہ پیار سے گڈو ہی کہا کرتے تھے) نے کہا بس

دعا کیجیے۔ ان دونوں بھائیوں کی گفتگو میں وہی خلوص، محبت، تہذیبی رچاؤ اور شائستگی تھی، جس کی خوشبو وقار صاحب کی شخصیت میں رچی بسی ہوئی تھی۔ انتہائی مصروفیت کے باوجود بچوں کی تربیت کا دھیان اور اس میں کامیابی اس امر کا نتیجہ ہے کہ وقار صاحب نے عملاً ان اقدار کو برتا جن کا اکثر حضرات صرف ذکر ہی کرتے ہیں۔ وقار صاحب جیسی آسودہ گھریلو زندگی کم حضرات کو ہی نصیب ہوئی ہوگی۔ وہ گھریلو ضروریات کا از حد خیال رکھتے تھے۔ وہ بیشتر ادیبوں کی طرح گھریلو زندگی اور اس کی ضروریات سے صرف نظر نہیں کرتے تھے، اسی وجہ سے ان کی گھریلو زندگی بڑی پُرسکون رہی۔

وقار صاحب کو معاملات کے سلجھانے اور باہمی اختلافات کو دور کرنے کا سلیقہ بھی عطا کیا گیا تھا، اسی وجہ سے انہیں رائٹرز گلڈ میں ہمیشہ ممتاز حیثیت حاصل رہی ہے۔ جب بھی دو فریقوں کے درمیان نزاع شدت اختیار کرتی، تو یہ اس نزاع کو بڑے احسن طریقے سے سلجھا دیتے۔ ریڈیو اور ٹی وی کے وہ پروگرام جن میں ان کی ''میزبان'' کی حیثیت ہوتی۔ ان کا یہ جوہر کھل کر سامنے آتا، وہ بڑی عمدگی سے بحث کو سمیٹتے تھے۔ اور بحث میں شریک حضرات کو اصل موضوع سے ہٹنے نہیں دیتے تھے۔ ان کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ ان کی وسیع النظری اور کشادہ دلی تھی۔ ان میں کسی قسم کا تعصب نہیں تھا۔ علاقائی زبانوں اور علاقائی تہذیب وثقافت کے بارے میں ان کا انداز نظر بڑا خوش آئند تھا۔ وہ اُردو زبان اور قومی تہذیب وثقافت کی ترقی کے لئے علاقائی زبانوں اور تہذیب وثقافت کی ترقی کو لازمی خیال کرتے تھے۔

قدیم اور جدید ادب پر بھی وہ یکساں نظر رکھتے تھے۔ وہ ہر قدیم چیز کو محترم جاننے اور جدت کو ٹھکرانے کے قائل نہیں تھے۔ وہ ہر اس جدت کو بہ دل و جاں قبول کرتے تھے جو زندگی کو آگے بڑھائے۔ جس سے اخوت و مساوات' وسیع النظری اور رواداری کی اقدار کو فروغ حاصل ہو۔ اسی وجہ سے طالب علمی کے زمانے سے ہی انہوں نے ترقی پسند تحریک سے اپنا تعلق پیدا کیا اور آخری وقت تک جدیدیت کے ان تمام مثبت پہلوؤں کی ہم نوائی کی جن میں معروضی حالات کے سائنسی تجزیے سے پاکستان کے عوام کو فلاح و بہبود کی منزل سے ہم کنار کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسی وجہ سے وہ فکری اور نظری اعتبار سے کبھی جمود کا شکار نہ ہوئے، انہوں نے ماضی کی زندہ اور احسن روایات سے اپنا علاقہ قائم رکھتے ہوئے حال اور مستقبل کے تقاضوں پر بھی گہری نظر رکھی۔ ان سے مل کر احساس ہوتا تھا کہ ان کے یہاں روایت کا تسلسل جاری ہے رُکا نہیں، ورنہ ان کی عمر کے اکثر لوگ ماضی کی لاش کو اُٹھائے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لئے مجھے یہ گمان گزرتا ہے کہ کہیں ان کے اُٹھ جانے سے ہمارا ماضی اور حال کا وہ رشتہ ٹوٹ تو نہیں گیا جسے وہ اپنی ذات سے بحال رکھے ہوئے تھے۔

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

وقار عظیم صاحب سے ہوش کی دنیا میں میری آخری ملاقات 6 نومبر 1976ء کو ہوئی اس شب میں دیر گئے تک، ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کے ہمراہ وقار عظیم صاحب کے ہاں رہا۔ پہلے ہماری نشست اس کمرے میں رہی جو وقار صاحب کے لئے خواب گاہ کا کام بھی دیتا تھا۔ اور جس میں وہ لکھنے پڑھنے کا سارا کام بھی کرتے تھے۔ یہ ہفتے کا روز تھا، ٹی وی پر امرتسر سے ایک فلم شروع ہوگئی اور کمرے میں ہجوم ہونا شروع ہوگیا تو ہم ڈرائنگ روم میں اُٹھ آئے، یہیں ''گڈو'' (اظہر وقار عظیم) ہمارے لئے پُر تکلف چائے لائے۔ وقار صاحب، فرمان صاحب سے کراچی کے احباب کی خیریت اور کیفیت پوچھتے رہے، بالخصوص ترقی اُردو بورڈ کراچی کے معاملات کا دیر تک تذکرہ رہا۔ وہ بورڈ کی تازہ ترین صورتِ حال سے نا مطمئن بلکہ افسردہ اور رنجیدہ تھے۔ 8 نومبر کو ملتان یونیورسٹی شعبۂ اُردو کے لئے اساتذہ کی ایک انتخابی کمیٹی میں شرکت کی غرض سے ملتان جانے والے تھے، وہاں کے مسائل پر گفتگو رہی۔

وقار عظیم صاحب کی صحت اچھی تو کبھی نہیں رہی، بہت سے امراض ان کے لئے معمول کا درجہ اختیار کر گئے تھے۔ لیکن اپنے بارے میں اس شام انہوں نے

تازہ بات یہ بتائی کہ پیشاب میں خون آیا ہے۔ اس پر میری تشویش اور پریشانی کے جواب میں انہوں نے کہا کہ: ''اس سے تکلیف کچھ نہیں، یہ صورت معمول کے خلاف ضرور ہے''۔ ان کا احساس یہ تھا کہ یونیورسٹی کے لئے اب جو اساتذہ منتخب ہوں گے، آئندہ شعبۂ اُردو کا مزاج اور معیار ان سے متعین ہوگا۔ اس لئے یہ مرحلہ ذمہ داری کا ہے اور انہیں اس موقع پر ملتان جانا ہی چاہیے۔ اسی درمیان میں ''میاں'' (انور وقار عظیم) رخصتی سلام کے لئے آ گئے۔ جو اس لمحے رحیم یار خاں جا رہے تھے۔

آخری ایام میں جو بہت سے کام وقار عظیم صاحب نے اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے۔ ان میں سے کاموں کا ایک سلسلہ وفاقی حکومت کا تفویض کردہ، علامہ اقبال کے جشنِ صد سالہ کے سلسلے کا بھی تھا۔ اس کی تین نوعیتیں تھیں۔

قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کی کتاب ''اقبالیات کا تنقیدی جائزہ'' (مطبوعہ 1955ء) کے نظر ثانی اور اضافہ شدہ ایڈیشن کی تیاری۔ پچھلے بیس بائیس برس میں اقبالیات پر جو کام ہوا اس کا احاطہ اور جائزہ، پھر 1955ء تک کے جائزے میں جو خلاء رہ گیا تھا۔ ان کی نشاندہی اور تکمیل۔ حق یہ ہے کہ یہ کام وقار عظیم صاحب ہی کے کرنے کا تھا، اقبالیات پر جن کی نظر کے بارے میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ افسوس کہ یہ کام وقار عظیم کے ناگہاں انتقال کے باعث ناتمام رہ گیا۔ اس ضمن میں انہوں نے جو متفرق جائزے تحریر کئے تھے۔ انہیں وقار صاحب کی اقبال سے متعلق بعض دوسری غیر مطبوعہ یا غیر مدوّن نگارشات کے ساتھ میں نے ''اقبالیات کا مطالعہ'' کے نام سے کتابی صورت میں مرتب کر دیا

ہے۔

6 نومبر 1976ء کی اس شب دیر تک ان تینوں علمی منصوبوں کے بارے میں وقار عظیم صاحب سے تفصیل سے گفتگو رہی۔ آخر جب وہ ہمیں رخصت کرنے باہر تک تشریف لائے تو فرمایا کہ اگلی اتوار (۱۴ نومبر) کو ضرور آیئے تاکہ سلسلۂ اقبال کے ان پھیلے ہوئے کاموں کو نمٹایا اور سمیٹا جا سکے۔ وقتِ رخصت فرمان صاحب سے ہاتھ ملایا، معاً بعد مجھ سے بھی مصافحہ کیا۔ یہ میرے لئے خلاف معمول تھا۔ مجھے عجب بے چینی کا سا احساس ہوا۔ اس وقت کیا خبر تھی کہ اس ملاقات اور لمس کی یاد ہی، ان سے ہوش و حواس کی آخری بات اور آخری یاد ہو کر رہ جائے گی۔

اس شب ہم رخصت ہونے لگے تو وقار صاحب نے اس پر افسوس اور معذرت کا اظہار کیا کہ میاں (انور وقار عظیم) کے ائیر پورٹ چلے جانے کی وجہ سے ہمیں اس وقت سواری کی دقت ہوگی۔ واپسی پر تیز رو رکشہ ملا۔ اور یہ رکشہ پیر مکی سے کچھ آگے، گھر کے نزدیک پہنچا تھا کہ اس کا ایک پہیہ کھل گیا۔ اور راوی روڈ کی نئی کشادہ شاہراہ پر ایک مہلک حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا، اس سے خدا کا شکر ادا کیا تھا، لیکن اب خیال آتا ہے کہ یہ حادثہ ہو جاتا اور وہ حادثہ جسے دیکھنے کے لئے میں رہ گیا، نہ ہوتا تو یہ کس درجہ منفعت بخش سودا ہوتا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب 7 نومبر کی صبح کو اسلام آباد چلے گئے جہاں سے جمعہ 12 نومبر کو انہیں واپس لاہور آ کر یہاں سے اتوار 14 نومبر کی صبح کو پہلی فلائیٹ سے کراچی روانہ ہونا تھا۔ 8 نومبر کو میں لائل پور چلا گیا۔ جمعرات

CS CamScanner

11 نومبر کو ہمارے کالج میں اسٹوڈنٹس یونین کا انتخاب تھا۔ جس کے بعد کالج چند روز کے لئے بند ہوگیا تو میں لاہور چلا آیا۔ جمعہ کو طے شدہ پروگرام کے مطابق فرمان صاحب بھی لاہور آ گئے۔

13 نومبر کو جب میں گھر سے نکلنے لگا تو زہرا نے پوچھا کہ آج وقار صاحب سے ملنے کا کوئی پروگرام نہیں ہے؟ میں نے بتایا کہ کل اتوار کو ان کے ہاں جانا پہلے سے طے ہے۔ تو زہرا نے دل گرفتگی سے کہا کہ آج فون پر ہی بات کر لیجیے۔ میں نے تردد سے پوچھا کہ خاص بات کیا ہے؟ بمشکل انہوں نے اپنے ایک تکلیف دہ خواب کی کیفیت سنائی کہ گویا ہم نے علامہ اقبال کی ولادت کی مناسبت سے اپنے کالج (اسلامیہ کالج برائے خواتین کوپر روڈ، لاہور) کی ایک تقریب میں وقار عظیم صاحب کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا ہوا تھا۔ ہم سارے انتظامات کے ساتھ تقریب میں ان کی شرکت آوری کے منتظر تھے کہ ان کے بجائے، ان کے بارے میں اندوہناک لیکن ناقابل یقین خبر پہنچی اور تقریب کا رنگ اور رُخ دوسرا ہوگیا۔ میں نے دلدہی کے طور پر کہا کہ آپ کے ہاں اِس ہفتے یہ تقریب بخیر وخوبی ہو چکی، اس موقع پر وقار عظیم صاحب کو زحمت دینے نہ دینے کا مرحلہ شدت سے آپ کے سامنے رہا۔ اس خواب کو اس حوالے سے لیا جائے تو اس میں یہ اطمینان کا پہلو ہے کہ یہ تقریب آپ کے ہاں خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام پا چکی۔ کہنے کو یہ سب کچھ کہہ تو دیا لیکن خود میں نے اپنی طبیعت پر ایک بوجھ محسوس کیا، ہفتے کا یہ دن فرمان صاحب کے ساتھ بے حد مصروف گزارا، اتوار 14 نومبر کو میں قبل دوپہر فرمان صاحب کو رخصت کر کے ایئر پورٹ سے واپس گھر پہنچا تو

زہرا نے ٹی وی کے حوالے سے بچشم پرنم یہ المناک خبر سنائی کہ وقار صاحب ''ہاجرہ میموریل کلینک'' میں داخل ہیں۔ اور انہیں ''او پازیٹو'' خون کی ضرورت ہے۔

8 نومبر کو وقار عظیم صاحب پہلی فلائیٹ سے ملتان تشریف لے گئے۔ اسی روز شام کی فلائیٹ سے واپس لاہور آئے، ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب اُن کے ہمراہ تھے۔ وہ ملتان کے قیام اور سفر کی روداد بڑی دل گرفتگی سے سناتے تھے۔ اس سفر کا طبیعت پر بُرا اثر ہوا۔ تھکن اور حرارت کے باعث اگلے روز 9 نومبر کو وہ اقبال اکادمی پاکستان کے زیرِ اہتمام ''یوم اقبال'' کی تقریب میں تشریف نہ لے جا سکے۔ لیکن گھر میں کسی تشویش کی فضا اس روز بھی نہیں رہی۔ آپا جان نے اس تقریب میں جانے سے منع کیا اور انہوں نے تقریب میں شرکت پر اصرار نہیں کیا اور بس۔ لکھنا پڑھنا، ہنسی، بات چیت، ٹی وی، کھانا پینا، غرض باقی سب معمول بحال رہے۔

10 نومبر کو وہ مجلس زبان دفتری کے اجلاس (منعقدہ پنجاب اسمبلی) میں شریک ہوئے۔ 11 نومبر کی صبح کو بھی وہ معمولاً وضع اصطلاحات کی میٹنگ میں شرکت کے لئے پنجاب اسمبلی میں تشریف لے گئے۔ اور سارے کام میں دل جمعی سے شریک رہے۔ اس شب پیشاب کے بند ہو جانے کا احساس ہوا تھا۔ میٹنگ سے پندرہ بیس منٹ پہلے اُٹھ گئے اور ڈاکٹر سے معائنہ کرایا۔ اکو (اختر وقار) ہمراہ تھے۔ ایکسرے وغیرہ ہوئے اور انہیں فوری طور پر ہسپتال میں داخل ہو جانے کا مشورہ دیا گیا۔ بایں ہمہ وہ پرسکون رہے۔ گھر آئے، اپنے مخصوص سفری بیگ میں

ضرورت کی سب چیزیں خود رکھیں، سلسلۂ اقبال کی ضروری کتابیں ہمراہ لیں۔ آپا جان کو اور پھر سب بچوں کو بتایا کہ ذرا سی تکلیف ہے۔ ایک دو روز ہسپتال میں رہنا ہوگا اس طرح 11 نومبر جمعرات کے روز، بعد دوپہر فرید کوٹ ہاؤس مزنگ روڈ پر واقع ''فیملی ہاسپٹل'' میں داخل ہو گئے ابتدائی تشخیص کا خلاصہ یہ تھا، لیور (جگر) کی خرابی اور جانڈس (یرقان) کے شدید حملے کا بھی پہلی بار پتہ چلا۔

12 نومبر کو جمعے کے روز ''فیملی ہاسپٹل'' سے ''ہاجرہ میموریل کلینک'' (واقع جیل روڈ لاہور) میں منتقلی عمل میں آئی۔ یہاں اندازہ ہوا کہ جانڈس کے شدید حملے کی صورتِ موجودہ میں 'اوّلاً اس کی فکر کرنا ہوگی، گردوں کا آپریشن بعد کی بات ہے۔ ہاجرہ کلینک کے ڈاکٹر خلیل الرحمٰن نے علاج شروع کیا۔

ہفتے کا دن انہوں نے ہسپتال میں ہشاش بشاش گزارا۔ سہ پہر میں گنے کے رس کے دو گلاس خود اپنے ہاتھ سے لئے۔ رات کو دس بجے کے لگ بھگ انہوں نے اچانک معدے میں شدید درد کی شکایت محسوس کی۔ یہ تکلیف بڑھتی ہی گئی۔ گڈو (اظہر وقار) اور میاں (انور وقار) اس رات ہسپتال میں ان کے پاس تھے۔ شب میں ڈیڑھ بجے نیم بے ہوشی کی صورت اختیار کر گئی۔ ڈاکٹر خلیل نے بتایا کہ جانڈس کا دماغ پر شدید حملہ ہوا ہے، متعلقین مطلع رہیں کہ اگلے پانچ گھنٹے فیصلہ کن ہیں۔ یہ پانچ سات گھنٹے بڑی کشاکش میں گزر گئے۔

14 نومبر اتوار کی صبح ڈاکٹر خلیل الرحمٰن کی اجازت اور ایماء پر میو ہسپتال لاہور کے پروفیسر ڈاکٹر عالمگیر سے رجوع کیا گیا۔ جنہوں نے دس بجے کے قریب وقار صاحب کا معائنہ کیا۔ اور لنگز کی تسلی بخش حالت دیکھ کر جسم

کے خون کی تبدیلی کا مشورہ دیا۔ اس عمل کی کامیابی کی صورت میں لیور کے باردگر کام شروع کر دینے کا امکان تھا۔

لاہور ٹی وی اور ریڈیو سے وقار عظیم صاحب کی علالت اور عطیۂ خون کی اپیل نشر ہوئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے خون دینے کے آرزومندوں کا تانتا بندھ گیا۔ ان میں بوڑھے بھی تھے، جوان بھی' خواتین بھی تھیں۔ بچیاں اور کم سن بچے بھی، غرض احباب، اعزہ، مداحوں، نیازمندوں اور شاگردوں کا ایک ہجوم تھا، سب مضطرب بے چین اور بیشتر آبدیدہ۔ وقار عظیم صاحب، ہاجرہ میموریل کلینک کے کمرہ نمبر 23 میں کوما کی حالت میں تھے۔ سانس اکھڑا ہوا تھا۔ گڈو (اظہر وقار)، مشرف انصاری صاحب، مشکور عظیم صاحب اور راقم الحروف ان کے اردگرد تھے۔

اتوار کو دن میں دو بجے کے قریب خون کی تبدیلی کا عمل شروع ہوا۔ جسم نے خون کے قبول میں زیادہ مزاحمت نہیں کی۔ چودہ گھنٹے کی جدوجہد کے بعد رات گئے چار بجے کے قریب یہ عمل بخوبی انجام پا گیا۔ اس درمیان رات کو آٹھ بجے کے قریب اس عمل میں رکاوٹ پیدا ہو جانے سے تنفس بگڑ گیا، اگلے پندرہ منٹ بے حد تکلیف اور تشویش میں گزرے۔ لیکن ڈاکٹر خلیل، ڈاکٹر رضیہ اور ڈاکٹر شاہد کی فوری توجہ سے یہ مشکل گھڑی ٹل گئی۔ چودہ گھنٹے میں خون کے سولہ بیگ دیئے گئے، بہتر سو سی سی خون قطرہ بہ قطرہ جسم میں داخل کیا گیا اور تہتر سو پچیس سی سی خون اسی رفتار سے خارج کیا گیا۔ اس طرح گویا پورے جسم کا خون بیک وقت دوبار تبدیل ہوا۔

15 نومبر پیر کا دن اور پھر رات یعنی اگلے چوبیس گھنٹے پرامید گزرے۔ جسم کی پیلاہٹ خصوصیت سے چہرے کی زردی سُرخی میں بدل گئی اور کیتھیٹر کے

CS CamScanner

ذریعے دو ہزار سی سی یورین خارج ہوا۔ اور اس کا رنگ بھی بہتر ہو گیا۔ یہ بڑی امید افزا علامت تھی۔ لیکن کوما کی صورت ضرور برقرار رہی۔ اگرچہ سر کے علاوہ مستقلاً جسم پن تک کا اثر قبول کرتا تھا۔ 15 نومبر کی صبح سے ایک مستعد پرائیویٹ نرس سسٹر بیلا کا انتظام ہو گیا۔ جو پہلے سے وقار صاحب سے متعارف اور اُن کی مداح تھیں۔ انہوں نے آخری تین ایام بڑی دردمندی اور ذمہ داری سے نرسنگ کی خدمت انجام دی۔

پیر کو جو حالت قدرے بہتر نظر آتی تھی۔ وہ منگل اور بدھ کو بتدریج خستہ اور خراب ہوتی چلی گئی۔ منگل اور بدھ کی شب بہت سخت گزری۔ اس رات گیارہ بجے کے قریب ڈاکٹر عالمگیر نے پھر معائنہ کیا۔ ان کا احساس تھا کہ لنگز میں کنجیشن بڑھ رہا ہے۔ اسے بہرطور قابو میں رکھنا ضروری ہے۔ انہوں نے نرسنگ کے ضمن میں ہمیں کچھ مزید ہدایات دیں۔ ڈاکٹر عالمگیر کا احساس تھا کہ نمونیے کا خفی اثر ہے۔ اس وقت تک نبض کی رفتار ٹھیک تھی۔ بلڈ پریشر نارمل تھا۔ پچھلے تین دنوں کے مقابلے میں کچھ ٹمپریچر ضرور ہو گیا تھا۔ گلوکوز پہلے دن ہی سے برابر دیا جا رہا تھا۔ منگل کی سہ پہر میں ہمارے توجہ دلانے پر ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اور ڈاکٹر رضیہ امتیاز نے آکسیجن دینے کا اہتمام بھی کیا۔

بدھ 17 نومبر 1976ء کی صبح پروفیسر ڈاکٹر عالمگیر نے پھر معائنہ کیا۔ لنگز کی حالت رات کے مقابلے میں بہتر محسوس کی، لیکن صورتِ حال بحیثیت مجموعی اچھی نہیں تھی۔ پچھلے چوبیس گھنٹے میں کیتھیٹر سے یورین کی بہت ہی کم مقدار خارج ہوئی تھی، اس out put کے مقابلے میں in take کی نسبت کہیں زیادہ

تھی۔ گردے بالکل ناکام ہو گئے تھے۔ جانڈس بہت بڑھ رہا تھا۔ اور یہ خون میں فاسد، زہریلے مادوں کو بڑھا رہا تھا۔

بدھ کو دن میں گیارہ بج کر پچیس منٹ پر پہلی بار بلڈ پریشر انتہائی مہلک سطح تک گر کر 40/70 رہ گیا۔ ڈاکٹروں کو بلایا گیا۔ بے ہوشی کی وجہ سے لازکس نہیں دیئے جا سکتے تھے لیکن اب چار وائیلز گلوکوز میں انجیکٹ کر دی گئیں۔ وٹامن k بھی دو روز سے گلوکوز میں دیا جا رہا تھا، جسم متورم ہو چکا تھا انٹروینس انجیکشن دینا ممکن نہیں رہا تھا۔ بصد مشکل کہیں نبض ملتی تھی۔ وہ بھی کچھ گھنٹوں کے بعد بند ہو جاتی تھی۔ ادویہ کے زیر اثر بارہ بجے کے بعد بلڈ پریشر یک لخت بڑھ گیا۔ لیکن آخر وقت تک اس میں اُونچ نیچ ہوتی رہی۔ ہاتھوں کی نبضیں دو بجے سے ڈوب گئی تھیں۔ بازو سرد، زرد اور بھاری ہو گئے تھے۔ یہی حال پاؤں کا اور ٹانگوں کا تھا۔ آخری چار پانچ گھنٹوں میں ہمارا احساس تھا کہ صرف پھیپھڑے اور دل کا ساتھ باقی رہ گیا ہے۔ یہ ساتھ بھی 17 نومبر 1976ء کی شام سات بج کر تینتیس منٹ پر چھوٹ گیا۔ مجھ سمیت مشرف بھائی، گڈو (اظہر وقار)، پھوپھا (نذر محمد شاہ) اور سسٹر بیلا پانچ لوگ اس لمحے ان کے بالیں پر موجود تھے۔ اگلے روز 18 نومبر کو قبل دوپہر گیارہ بجے میانی صاحب کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

رشید احمد صدیقی کا کہنا ہے کہ انسان کی سیرت اور شخصیت کا بھید مصیبت اور بیماری میں کھلتا ہے، کہیں اور نہیں کھلتا۔ مصیبت اور بیماری میں کسی طرح کا ملمع قائم نہیں رہتا۔ جب سارے دوسرے سہارے ٹوٹ چکے ہوں اس وقت بھی اپنا سہارا پکڑے رہنا بڑا کٹھن کام ہے۔ مجھے مرض الموت میں بسترِ مرگ پر شب و روز

CS CamScanner

وقار عظیم صاحب کے پاس رہنے کا شرف حاصل ہوا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ انہوں نے اپنا سہارا مرتے دم تک نہ چھوڑا۔ وہ اس جہان سے اُٹھ گئے اور اپنے ساتھ وہ تمام باتیں لے گئے جو اس درجہ میرے لئے اب کسی اور میں نہیں۔

کوئی ویسا نظر نہیں آتا
وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

* * *

آپ کو دی خدا نے طبعِ حلیم
آپ پر خاص فضلِ ربِ کریم
آپ دیتے ہیں سب کو درسِ حیات
آپ کا در ہے گویا بابِ نعیم

عظمتوں کے جہاں میں آپ عظیم
تشنگانِ ادب کے دل میں مقیم
ناز ہے ہم کو آپ پر لاریب
واقعی آپ ہیں وقارِ عظیم

خورشید زہرہ

سیّدِ محترم وقار عظیم

م ح مضطر

حاملِ صدق و مہر و خُلقِ عظیم
صاحبِ علم و حلم و طبعِ سلیم
مشفق و مونس و رحیم و کریم
سیّدِ محترم وقار عظیم

دودمانِ عظیم کے فرزند
جن کی عظمت کی کھاتے ہیں سوگند
ایسے عظمت نشاں بہ لطفِ عمیم
سیّدِ محترم وقار عظیم

صاحبِ طرز ادیب اور نقاد
قابلِ قدر و منزلت اُستاد
ایک ممتاز ماہرِ تعلیم
سیّدِ محترم وقار عظیم

کوئی شاہکار ہو کہ دردانہ
داستاں ہو کہ ناول افسانہ
اُن کی تنقید واجب التعظیم
سیدِ محترم وقار عظیم

وقف تھی زندگی ادب کے لیے
فیض اُن کا تھا عام سب کے لیے
کوئی تخصیص تھی نہ کچھ تعیم
سیدِ محترم وقار عظیم

اُن کا حسنِ بیان کیا کہنا
شستگئ زبان کیا کہنا
خلد میں جیسے کوثر و تسنیم
سیدِ محترم وقار عظیم

باغِ جنت سے جب بھی آئی نسیم
اُن کی خوشبو بھی ساتھ لائی نسیم
یوں بسے دل میں جیسے گل میں شمیم
سیدِ محترم وقار عظیم

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

سیّد وقار عظیم کا اسلوبِ بیان

مرزا ادیب

اُردو نے اپنی صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ میں کچھ ایسے اہل نقد ونظر بھی پیدا کیے ہیں جنہوں نے ذاتی ناقدانہ بصیرت سے شعری یا نثری ادب کا جائزہ لیا ہے اور اِنتقادی تسلسل کو برقرار رکھا ہے اور ان میں سے کسی کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا مگر یہ بات بلاتردد و تامل کہی جا سکتی ہے کہ جہاں تک ایک جامع فکر انگیز اور خیال افروز اُسلوب کا تعلق ہے سید وقار عظیم تنہا نظر آتے ہیں خصوصاً فکشن کے معاملے میں۔

سید مرحوم نے شاعروں کا بھی تجزیاتی مطالعہ کیا ہے داغ دہلوی اور علامہ اقبال کے بارے میں اُنہوں نے جو مضامین لکھے ہیں وہ اُن کے پختہ اِنتقادی ذوق کے مظہر ہیں لیکن نثر نگاروں کی ذہنی کاوشوں کے پرکھنے میں اُنہوں نے بڑی ژرف نگاہی اور گہرے تفکر کا ثبوت دیا ہے۔ اور اِس خصوص میں جو چیز خصوصی طور پر نمایاں ہے وہ اُن کا اُسلوب بیان ہے۔ اُسلوب پر گفتگو کرنے کے لیے میں چاہتا تھا کہ تمہیداً کچھ عرض کر کے آگے چلوں کیونکہ اُس کے بغیر وہ فکری تنظیم قائم نہیں رہ سکتی جو ایک مقالے کے لیے ضروری ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی مضمون کی تمہیدی سطور لکھنا خاصا مشکل کام ہوتا ہے۔ میں قدرے پریشان تھا کہ اُن کے مضامین کے مجموعے ''فن اور فنکار'' کے ایک مضمون کا خیال آیا جو اِس کتاب میں ''جمالیاتی تنقید'' کے

CS CamScanner

عنوان سے شامل ہے۔ اس مضمون پر دوبارہ نظر ڈالی تو یہ سطریں سامنے آ گئیں:

''ادب میں جس چیز کو عظیم کہا جاتا ہے اُس کا تعلق موضوع اور مواد سے ہے۔ یہ بات تسلیم۔ لیکن یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ چیز ادب بھی ہے یا نہیں جمالیاتی معیار بھی پیشِ نظر رکھنے پڑتے ہیں۔ یہی جمالیاتی معیار ہیں جن کی بناء پر میر‘ غالب‘ دانتے‘ گوئٹے‘ کالی داس اور ایلیٹ عظیم بنتے ہیں اس لیے کہ اگر سچ پوچھیے تو وہ تمام معیار جنہیں ہم آسانی کے خیال سے غیر ادبی یا غیر جمالیاتی کہہ سکتے ہیں کسی نہ کسی منزل پر آ کر جمالیاتی بن جاتے ہیں۔ جمالیاتی معیار موضوع اور مواد سے الگ ایک عنصر ہے اور یہ عنصر اُسلوب کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟''

اپنے ایک اور مضمون ''کہانی اور حسنِ بیان میں کہتے ہیں:

''بیان کا یہی حسن ہے جس نے لقمان اور سعدی کو‘ چیخوف اور ٹالسٹائی کو‘ فلابیر اور موپساں کو‘ گوئٹے‘ ڈکنز اور جوئس کو‘ میرامن اور نذیر احمد کو ہمیشہ کے لیے زندہ کیا ہے۔''

کہا جاتا ہے کہ اُسلوب مصنف کی اپنی شخصیت کا پرتو ہوتا ہے۔ جیسی ایک مصنف کی شخصیت ہوتی ہے ویسا ہی اُس کا اُسلوب ہوتا ہے۔ مواد‘ مشاہدے‘ تجربے اور مطالعے سے اخذ کیا جاتا ہے اور یہ مواد اظہار و ابلاغ کے لیے کس قسم کا طرزِ بیان‘ کس نوعیت کا اندازِ پیشکش اختیار کرتا ہے اِس کا تعلق اُسلوب سے ہے۔ اور اُسلوب ایک شخصی رجحان کا آئندہ دار ہوتا ہے۔ ایک اُسلوب کیسا ہے۔ اس سوال کا مفہوم یہ ہے کہ مصنف کی شخصیت کیسی ہے اور شخصیت کیسی ہے اس کا جواب اُس کے اُسلوب میں ملتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم کسی تحریر کا

اُسلوب دیکھ کر اُس کے خالق کے سلسلے میں کسی خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ سید وقار عظیم کے ضمن میں یہ بات قطعاً صحیح نہیں ہے۔ اُن کا اُسلوب تو اُن کی شخصیت سے ذرہ برابر بھی تفاوت نہیں رکھتا۔ اُسلوب کی یہ بنیادی خصوصیت ہے یا ہونی چاہیئے کہ جب اُس کا جائزہ لیں تو صاحبِ اُسلوب کی پوری تصویر اپنی تمام جزئیات کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے ظاہر ہو جائے۔ ہم میں سے بہت سوں نے سید صاحب کو سالہا سال تک دیکھا ہے، اُن کے احباب کی تعداد برِصغیر میں جہاں تہاں پھیلی ہوئی ہے۔ اُن کے شاگردوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے اس لیے جب ہم اُن کے مضامین اور مقالات پڑھتے ہیں تو سید صاحب فوراً مسکراتے ہوئے ہمارے خیالوں کی دُنیا میں آموجود ہوتے ہیں۔ ہم واضح طور پر جانتے ہیں اور اِس حقیقت کو مانتے ہیں کہ اُن کا اُسلوب صرف اُن ہی کا اُسلوب ہو سکتا ہے۔ ذات شناسی اُسلوب فہمی میں مدد کرے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ صرف ان کی تحریر پڑھ کر یہ اندازہ لگایا جائے کہ وہ کیا تھے اور کیا نہیں تھے اور اُن کی شخصیت کے عناصر ترکیبی کیا تھے۔ اُن کے طبعی میلانات کیا تھے۔ مختصراً یہ کہ وہ کس قسم کے آدمی تھے۔

سید وقار عظیم کا کوئی بھی مضمون پڑھ ڈالیے۔ اگر آپ نے اِسے غور سے پڑھا ہے تو آپ لازماً وقار عظیم صاحب کے اُسلوب کی یہ خصوصیات گنوائیں گے:

اُن کے اُسلوب کی سب سے بڑی خوبی اور سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ بغیر کسی تصنع، بناوٹ اور ابہام کے کہہ دیتے ہیں۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اُنہوں نے اندازِ تحریر کو اندازِ تقریر بنا دیا ہے۔

CS CamScanner

اُن کی کوئی بھی تحریر پڑھنا شروع کر دیں، یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ بذاتِ خود ہمارے ساتھ بیٹھ کر بڑی خاطر جمعی سے گفتگو کر رہے ہیں۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ الفاظ کے انتخاب میں وہ کچھ ایسا طریقہ کار اختیار کرتے ہیں کہ ہر لفظ اکائی کی حیثیت میں کل سے وابستہ ہو کر اُس موسیقیانہ لہر میں شامل ہو جاتا ہے جو مضمون کی ابتداء سے لے کر اُس کی انتہا تک ذہنی سطح پر خراماں رہتی ہے۔

چوتھی خصوصیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ لگتا ہے وہ بڑے اطمینان سے باتیں کر رہے ہیں اُنہیں کوئی عجلت نہیں ہے۔ پڑھنے والا خود بخود اس اطمینان بخش کیفیت کو اپنے اندر جذب کرتا چلا جاتا ہے جب مضمون ختم ہو جاتا ہے تو قاری یہ نہیں کہہ سکتا کہ مصنف جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ کہہ نہیں سکا۔ اور اِس بنا پر قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ جو کچھ اسے معلوم کرنا تھا وہ اُس نے معلوم کر لیا ہے۔

اور پانچویں خصوصیت یہ کہ وہ آہستہ، دھیمے دھیمے لہجے میں بات کرتے ہیں۔ اپنے قاری کو مرعوب کرنے کے آرزومند نہیں، اُس کے ساتھ دوستانہ روابط قائم کرنے کے خواہش مند رہتے ہیں۔

اُن کے اُسلوب بیان کے اجزائے ترکیبی کم و بیش اُن کی ہر تحریر میں کارفرما ہیں۔ قطع نظر اس امر کے کہ یہ تحریر انتقادیات کے ضمرے میں آتی ہے، خاکہ نگاری کے دائرے میں ہے یا کسی علمی یا ادبی موضوع پر اُن کا خاص زاویۂ نگاہ پیش کر رہی ہے۔ اُن کے یہاں فکری موضوعات کی حد بندی نہیں ہے۔ ادب کی بیشتر اصناف کو اُنہوں نے مرکزِ توجہ بنایا ہے۔ تاریخی ناول نگاری کے موضوع پر بھی

CS CamScanner

اظہارِ خیال کیا ہے۔ کہانی کی منطق کو بھی سمجھنے‘ سمجھانے کی کوشش کی ہے‘ ادب میں مشاہدے کی اہمیت کو بھی واضح کیا ہے‘ سرشار کی ظرافت پر روشنی ڈالی ہے‘ مولوی عبدالحق کی سیرت نگاری کی بھی توضیح کی ہے‘ نیز یہ بھی بتایا ہے کہ جوش جو غزل کے کٹر دشمن سمجھے جاتے ہیں اُن کی اپنی غزل کا کیا رنگ ہے۔ اُنہوں نے ''اندر سبھا'' پر بھی تحقیقی نظر ڈالی ہے اور ایک نئے نقطۂ نظر سے ادب کے اِس اولین ناٹک کا مطالعہ کیا ہے۔ آغا حشر کے تین ڈراموں کی ترتیب اور تدوین کرتے ہوئے آغا حشر کے فن پر ایک بسیط اور ایک پُر از معلومات دیباچہ سپردِ قلم کیا ہے۔ اقبالیات سے متعلق اُنہوں نے بڑا گراں مایہ فکری اثاثہ چھوڑا ہے۔ وہ ہمارے پہلے نقاد ہیں جنہوں نے داستان نگاری سے لے کر موجودہ افسانہ نگاری تک جتنے ارتقائی مراحل آئے ہیں اُن کی پوری پوری تفصیل بیان کی ہے اور موجودہ اُردو افسانے پر بھی جتنا کچھ لکھا ہے وہ اُردو ادب کی تاریخ کا ایک نہایت اہم باب گردانا جا سکتا ہے۔ یہ بہت کچھ ہے۔ لیکن سب کچھ نہیں۔ کیونکہ سید وقار عظیم کا قلم کبھی رُکا نہیں تھا۔

میں نے ابھی ابھی اُن کے اُسلوبِ بیان کی جن خصوصیات کا ذکر کیا ہے وہ اُن کی تمام تحریروں میں پائی جاتی ہیں۔ تصنیف اور تالیف کا کام سید وقار عظیم کے لیے ایک پیشہ ورانہ مصروفیت نہیں تھا۔ پیشہ کے اعتبار سے وہ ایک معلم تھے۔ درس و تدریس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہوتے ہوئے اُنہوں نے اپنی اُس اندرونی لگن کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے جو اُنہیں ذہنی تخلیق پر مائل کرتی تھی۔ وہ اُن اہلِ قلم میں سے تھے جو لکھنے لکھانے کی مشغولیت کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں اور پوری یکسوئی سے اِس عبادت میں محو ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں

افکار و تصورات کی رنگارنگی کے باوجود اندازِ بیان اور اُسلوبِ اظہار کی خصوصیات شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہیں۔ آنکھیں بند کر کے اُن کی تحریر سن لیں' ایک شبنمی سی کیفیت آپ کو فوراً یہ احساس دلا دیتی ہے کہ اس کے لکھنے والے وقار عظیم اور صرف وقار عظیم ہیں۔

عبادت کا بنیادی احساس احترام ہے۔ سید صاحب کے اندازِ بیان کی یہ ایک جداگانہ خصوصیت ہے کہ احترام کا گہرا سایہ اُن کی تحریروں پر چھایا رہتا ہے۔ یہ نہیں کہ اُنہوں نے تنقید اور تجزیے کے معاملے میں دوسروں سے اختلاف نہیں کیا یا بعض اہلِ قلم کی تخلیقات میں کچھ نقائص کی نشاندہی نہیں کی' اُنہوں نے جو درست سمجھا ہے اُس کے اظہار میں قطعاً تامل سے کام نہیں لیا لیکن اُنہوں نے یہاں بھی دوسروں کا احترام کیا ہے اور خود اپنی رائے کے احترام سے بھی دامن کش نہیں ہوئے۔

سید وقار عظیم واقعتاً ہمارے عظیم نقاد تھے اور اُردو ادب ہمیشہ اُن کا ممنونِ احسان رہے گا۔

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

اقبالیاتِ سیّد وقار عظیم

فتح محمد ملک

پروفیسر سید وقار عظیم نے اقبالیات کے اُستاد کی حیثیت سے درس و تدریس اور تنقید و تحقیق کی دنیا میں ایک یادگار تاریخی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ ہر چند اُردو فکشن کی تنقید میں اُنہیں جو امتیازی مقام حاصل ہے اُس کا شایانِ شان اعتراف کیا گیا ہے تاہم اقبالیات کی تفہیم و تفسیر میں اُن کے فیضان کا کما حقہٗ اعتراف اُردو تنقید پر ہنوز قرض ہے۔ بیسویں صدی کا پانچواں اور چھٹا عشرہ اقبال کے خلاف شدید ردِعمل کا زمانہ ہے۔ اس زمانے کے برصغیر میں ترقی پسند اور جدیدیت پسند ادبی تحریکیں کارل مارکس یا سگمنڈ فرائیڈ کی کورانہ تقلید پر نازاں تھیں۔ اگر ایک طرف ادب برائے ادب کا دبستان ادب میں کسی بھی نوعیت کی مقصدیت کو ادب کے لیے زہرِ قاتل قرار دیتا چلا آرہا تھا تو دوسری جانب مارکسی نقاد فکر و شعرِ اقبال میں گوناگوں تضادات ایجاد کرنے اور اقبالیات کو فکری تضادات کا آئینہ دار ثابت کرنے میں مصروف تھے۔ دورِ اوّل کے اختر حسین رائے پوری کی کتاب ''ادب اور انقلاب'' سے لے کر دورِ اوّل ہی کے ممتاز حسین اور مجنوں گورکھپوری تک اِن مفروضہ تضادات کی تشریح میں مصروف تھے۔ اس پیرویِٔ مغربی کے باعث اقبال کا روحانی انقلابی مسلک تشکیک و تردید کا نشانہ بن کر رہ گیا تھا۔

اقبال ناشناسی کے اِس دور میں سید وقار عظیم نے اقبال شناسی کی روشنی عام کرنے کا فریضہ بڑے انہماک کے ساتھ سرانجام دیا ہے۔

سید وقار عظیم نے 1950ء سے 1970ء تک پنجاب یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم ہماری دو نسلوں کے ذوقِ ادب کی تربیت کی ہے۔ وہ اپنے لیکچر کے دوران سوال اُٹھانے پر طالب علموں کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ تدریس کے ساتھ ہی ساتھ اُن کی تنقید نگاری نے مارکسی اور نفسیاتی تنقیدی دبستانوں کی پھیلائی ہوئی غلط فکری کے منفی اثرات سے نجات کا سامان بھی مہیا کیا ہے۔ اقبال کی شاعری اور اقبال کی فکر کا فیضان اُن کے اپنے شخصی ارتقاء کا جزوِ اعظم ہے۔ وہ اپنی کتاب اقبال.... شاعر اور فلسفی'' کے ''پیش لفظ'' کا آغاز ہی اِس اعتراف کے ساتھ کرتے ہیں کہ:

> ''کلام اقبال کے ساتھ میری یادوں کا رشتہ پینتالیس چھیالیس سال پرانا ہے۔ اِس رشتے کا آغاز بچے کی دُعا، ترانہ ہندی، جگنو، نیا شوالہ اور ایک آرزو کے مطالعے سے ہوا۔ درسی کتابوں میں پڑھی ہوئی ان نظموں کے ایک ایک شعر نے مجھے کیوں کر اپنا گرویدہ بنایا، اس کا تجزیہ میرے لیے ممکن نہیں۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ میر کی ایک غزل، غالب کی دو غزلیں، اور اقبال کی یہ چند نظمیں میں بار بار پڑھتا اور ان میں ایک نامعلوم سی لذت محسوس کرتا تھا۔ آگے چل کر یہ لذت میری جذباتی اور فکری زندگی کا عزیز سرمایہ بنتی گئی۔ زندگی کے مختلف مرحلوں میں یہ سرمایہ عزیز سے عزیز تر ہوتا رہا اور بالآخر اقبال کا کلام میرے مادی اور روحانی وجود پر چھا گیا۔ اس نے بہت سے نازک مرحلوں پر مجھے

روشنی دکھائی۔''[1]

میں قبل ازیں اِس جانب اشارہ کر چکا ہوں کہ جس دور میں یہ مضامین وجود میں آئے تھے اُس دوز میں اگر ایک طرف جدیدیت پسندوں کے ہاں مقصدیت کو فن کے حسن و تاثیر کے لیے زہر قاتل قرار دے دیا گیا تھا تو دوسری جانب مارکسیت پسندوں کے مادی ہمہ اُوست کا ڈنکہ بج رہا تھا۔ چنانچہ اقبال کی شاعری اور اقبال کے فلسفے میں تضادات کی نشاندہی اِن ادبی مسالک سے وابستہ ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کا پسندیدہ شغل بن گیا تھا۔ اقبال پر اِس الزام کو بے بنیاد قرار دیتے وقت سید وقار عظیم کا استدلال قابل غور ہے:

''اقبال کو ساری دنیا فلسفی زیادہ سمجھتی ہے اور شاعر کم۔ لیکن میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ گو اقبال کی حکیمانہ حیثیت بہر حال مسلم ہے، لیکن حکیم فرزانہ کی حکمت کو دلنشیں اور دل آویز اقبال کے مزاج کی رچی ہوئی شاعرانہ کیفیت نے بنایا۔ اقبال کی حکمت اور اقبال کے شعر کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اِس مجموعے کے تمام مضامین کی اساس یہی احساس ہے۔''[2]

اقبال کے خلاف ردِعمل کی اِس فضا میں سید وقار عظیم نے اقبالیات کی تدریس کے دوران اور اقبالیات کی تفہیم و تفسیر میں اپنے گراں قدر مقالات سے اقبال کے خلاف ردِعمل کے منفی اثرات کا نہایت مئوثر انداز میں تدارک کیا ہے۔ یوں سید وقار عظیم نے ہمیں نفی سے اثبات کی جانب گامزن رہنے کا حوصلہ بخشا

---

[1] اقبال شاعر اور فلسفی، سید وقار عظیم۔ لاہور، 1968، صفحہ 11۔

[2] ایضاً

CS CamScanner

ہے ۔ جہاں تک اقبال کے فلسفہ وشعر میں تضادات کے الزام کا تعلق ہے سید وقار عظیم اپنے استدلال کو زیادہ وضاحت اور قطعیت کے ساتھ مضمون بعنوان ''اقبال شاعر اور فلسفی'' میں پیش کرتے ہیں:

''مفکر اقبال یا فلسفی اقبال صحیح معنوں میں شاعر ہے ۔۔۔۔ اقبال کی شاعرانہ شخصیت ہمیشہ اقبال کی حکیمانہ شخصیت پر قبضہ پا کر یا اسے اپنا تابع بنا کر ایک فکری اور ذہنی تجربے کو جذباتی تجربے میں بدل دیتی ہے۔ جو بات دماغ کی دنیا سے شروع ہوتی ہے وہ دل کی دنیا میں جا کر اپنی جگہ بناتی ہے۔ ان کے شعر میں ہمیشہ ایک منزل ایسی آتی ہے جب حکیمانہ حس اور جمالیاتی حس ایک دوسرے سے بغل گیر ہو جاتے ہیں اور جو کام حکمت کے وقار اور سنجیدگی سے بن نہیں آتا اسے جمال کی رعنائی ایسے انداز میں مکمل کرتی ہے کہ اقبال کی کہی ہوئی بات ہر ایک کے دل کی بات بن جاتی ہے اور یوں میری وہ منطق جس سے میں نے بات شروع کی تھی، پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے ۔''[1]

وہ اپنے مضمون ''اقبال ۔۔۔۔ حضور باری میں'' اقبال کے اُن نقطہ چینوں کے استدلال کو بڑی خوبی کے ساتھ جھٹلاتے ہیں جو ''اقبال کی ذات کو مجموعہء اضداد اور ان کے کلام کو اُن کی ذات کے متضاد عناصر کا عکس کہتے رہے ہیں ۔''[2] ان میں سے نمایاں ترین تضادات عقل و عشق اور من و تُو کے مکالمات میں اپنے خالق حقیقی کے ساتھ بحث تکرار ہے ۔ ''اُنہوں نے عشق کی مداحی و ثنا خوانی کو اپنا شاعرانہ اور فلسفیانہ مسلک بنایا لیکن وہ عقل کی اعلیٰ صلاحیتوں سے انکار نہیں کرتے ۔'' جہاں تک

---

[1] اقبال، شاعر اور فلسفی، صفحات 21-22

[2] اقبال، شاعر اور فلسفی، صفحات 35-36

CS CamScanner

عقل و عشق کے معاملات کا تعلق ہے اقبال کے فلسفہ و شعر کا عمیق مطالعہ کرنے والا ہر قاری یہ سمجھتا ہے کہ اقبال کی نظر میں عشق، عقل کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ جہاں عقل کی رسائی ختم ہوتی ہے وہاں سے عشق کی قلم رو شروع ہو جاتی ہے۔ سچ کہتے ہیں علامہ اقبال: ''اک جنوں ہے کہ باشعور بھی ہے۔'' سید وقار عظیم نے اپنے اسی مضمون میں یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ:

> ''اقبال خدا کا ذکر کبھی اس طرح کرتے ہیں کہ ان کا ایک ایک حرف، رنگ عبودیت میں جذب و سرشار نظر آتا ہے اور کبھی یوں کہ سننے والے ان کی بے باکی و گستاخی پر انگشت بدنداں ہوتے ہیں۔ شکر کو اپنا شیوہ بنانے والا اقبال کبھی عبودیت کے پورے عجز و انکسار کے ساتھ کہتا ہے:

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ

اور کبھی عبودیت کے سارے آداب ترک کر کے یہ پیش گوئی کرتا ہوا سنائی دیتا ہے:

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

یہاں اس حقیقت کو ہرگز فراموش نہ کرنا چاہیے کہ عبودیت کی آخری منزل عشق ہے: 'رمزیں ہیں محبت کی، گستاخی و بیباکی'۔ من و تو کے سلسلۂ مکالمات میں عبودیت عشق بن کر خالق حقیقی سے محبت کی رمزوں میں ہمکلام ہے۔ سید وقار عظیم اقبال کی شاعری اور اقبال کے فلسفے کی روشنی میں کلامِ اقبال کے اس مفروضہ تضاد کی نفی کرتے ہیں:

> ''اقبال کی پوری شاعری ان کی شخصیت کے تین رخوں (فکری، تخیلی اور جذباتی) کا مکمل آئینہ اور ان کے رچے ہوئے مزاج کی ایک مؤثر صورت ہے۔ ان

کی شخصیت کے یہ تینوں رُخ ان کی شاعری کے ہر پہلو میں نمایاں دکھائی دیتے ہیں لیکن اس کا جتنا واضح اظہار ان تینوں حیثیتوں سے، جس طرح ان کے کلام کے اس حصے میں ہوا ہے جہاں وہ بارگاہ ایزدی میں حاضر ہو کر خداوند تعالیٰ سے مخاطب ہوئے ہیں، کسی اور موقع پر نہیں ہوا۔ خدا سے مخاطب ہوتے وقت اقبال نے تین مختلف منصب ادا کیے ہیں۔ اور یہ منصب ادا کرتے وقت نہ فکری تقاضوں کو نظرانداز کیا ہے نہ شعری مطالبات کو۔ اُن کی نغمے کی لے اُن کے منصب کے مقاصد کے ساتھ بدلی اور اس سے ہم آہنگ رہی ہے، اور یہ بات صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے کہ شاعر کے فکری نظام میں کسی طرح کا انتشار نہ ہو، وہ مفکر ہونے کے باوجود یہ نہ بھولے کہ وہ شاعر ہے اور ان دونوں چیزوں کے ساتھ ساتھ یہ یاد رکھے کہ فکر اور شعر جب تک جذبے میں نہ سمویا جائے ان میں نہ صداقت پیدا ہوتی ہے نہ تاثیر۔''[1]

اپنے مضمون ''اقبال کی شاعری کا ایک کردار'' میں سید وقار عظیم مُلّا کے کردار کو زیرِ بحث لائے ہیں۔ اسی زمانے میں خلیفہ عبدالحکیم نے اسی موضوع پر ''اقبال اور مُلّا'' کے عنوان سے اپنا مقالہ ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا تھا۔ خلیفہ صاحب کا انداز تند و تیز اور جارحانہ تھا۔ اس کے برعکس سیّد صاحب نے اپنے مقالے میں بڑی نرمی اور نزاکت کے ساتھ مُلّائیت پر اقبال کے تجزیہ و تنقید کے بنیادی نکات پیش کیے ہیں۔ خلافتِ راشدہ کے بعد خلافت کے پردے میں ملوکیت کا نظام قائم ہو گیا تھا جو تب سے لے کر اب تک بیشتر مسلمان ممالک میں رائج ہے۔ ملوکیت کے نظام کو مشرف بہ اسلام کرنے کی خاطر سلاطین و ملوک کو مُلّا کی رہنمائی اور دستگیری درکار ہے۔ ملوکیت اور مُلّائیت

---

[1] اقبال، شاعر اور فلسفی، صفحات 60-61

کے اس گٹھ جوڑ نے صدیوں سے مسلمانوں کی زندگی کو اجیرن بنا رکھا ہے۔ اسی باعث اقبال نے اپنی شاعری اور اپنے فلسفے میں مُلّا کے کردار کو ہدفِ ملامت بنا رکھا ہے۔ سید وقار عظیم نے اقبال کی ابتدائی نظم ''زہد اور رندی'' سے لے کر اقبال کے دورِ آخر کے کلام تک کے تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ کو یوں تکمیل تک پہنچایا ہے:

> ''اقبال نے مُلّا اور اس کی ملائی کے سارے طلسم کو اس لیئے توڑنا اور اس کے راز کو اس لیے فاش کرنا چاہا ہے کہ اس راستے پر چل کر انسان کے لیے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنا ناممکن ہے۔ اس کٹھن منزل کا زادِ سفر ''عمل کا توشہ'' ہے اور مُلّا کو فطرتاً اس توشے سے کوئی تعلق اور مناسبت نہیں۔ یہ بات کہنے اور اسے زیادہ سے زیادہ عام کرنے کے لیے اقبال نے منطق، فلسفہ، شاعری اور رندی کے سارے وسیلوں سے کام لیا اور اپنے نزدیک دنیا کی نظر سے وہ پردہ ہٹا دیا جو مُلّا کی پرکاری نے ڈالا تھا۔''[1]

اُن کا دوسرا مجموعہ، مقالات بعنوان ''اقبالیات کا مطالعہ'' اُن منتشر مضامین پر مشتمل ہے جنہیں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے بڑی محبت اور محنت کے ساتھ یکجا کر دیا ہے۔ اقبال اور اسلامی اشتراکیت ایک ایسا موضوع ہے جو ہماری دانشگاہوں میں آج تک ایک شجرِ ممنوعہ چلا آ رہا ہے۔ نام نہاد اسلام پسند مدرس نقاد اِس باب میں اقبال سے نظریاتی اختلاف رکھتے ہیں۔ ہر چند اقبال علمی، فکری اور سیاسی اختلافات کو مبارک سمجھتے تھے تاہم یہ لوگ، آج تک، اپنے اِن اصولی اختلافات کو موضوعِ بحث بنانے سے گریزاں چلے آ رہے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی بھی اقبالیات کے اِس موضوع سے چشم پوشی کی مرتکب ہے۔ سید وقار عظیم نے اس موضوع

---

[1] اقبال، شاعر اور فلسفی، صفحہ 215

پر بڑی جرأتِ رندانہ کے ساتھ دادِ تحقیق دی ہے۔ اُنہوں نے قیام پاکستان سے پہلے شائع ہونے والی عزیز احمد کی کتاب: ''اقبال کی نئی تشکیل'' میں پیش کردہ اسلامی اشتراکیت کے تصور کے خصوصی مطالعہ سے لے کر اسلامک آئیڈیالوجی اور اسلامک سوشلزم کے موضوعات پر خلیفہ عبدالحکیم کی تصنیفات میں بیان کیے گئے تصورات، پروفیسر محمد عثمان، صفدر میر اور محمد حنیف رامے کی کتابوں میں عصری سیاست کے حوالے سے اسلامی سوشلزم کی نئی تعبیر تک بے لاگ تجزیہ کیا ہے۔ اس تجزیہ و تحسین کے ساتھ ساتھ جسٹس ایس اے رحمٰن اور جناب اے کے بروہی کے سوشلزم مخالف استدلال کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔ سید وقار عظیم خلیفہ عبدالحکیم کی تفہیمِ اقبال کی تحسین میں لکھتے ہیں:

''پیامِ مشرق'' کی نظموں کا تجزیہ کر کے خلیفہ صاحب نے بڑے واضح انداز میں یہ بات دکھائی ہے کہ اقبال ہر حال میں محنت کش کے وکیل اور سرمایہ کار و مزدور کی کشمکش میں مزدور کے حامی اور ہم نوا ہیں اور اُسے طلب حق کی راہ پر گامزن ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ زمین کی ملکیت کا مسئلہ 'استحصال کی بدترین صورت ہے۔ ہر قسم کے سوشلسٹ اور کمیونسٹ اس معاملے میں ہم خیال ہیں۔ اقبال'' جسے مسلم سوشلسٹ کہنا چاہیے، ہر قسم کی سوشلزم اور کمیونزم سے اس مسلے پر اتفاق رکھتا ہے کہ زمین خدا کی پیدا کی ہوئی ہے اور اس کی حیثیت ہوا اور پانی کی سی ہے جس پر کسی کی کوئی شخصی ملکیت نہیں۔ اقبال اشتراکت کے تمام معاشی پہلوؤں سے اتفاقِ رائے رکھتے تھے۔ سوا اس کے کہ اس تمام تنظیمِ جدید نے انسان کے دل و دماغ پر یہ غلط عقیدہ مسلط کر دیا ہے کہ تمام زندگی مادی اسباب کی عادلانہ یا مساویانہ تقسیم سے فروغ اور ترقی کر سکتی ہے۔ علامہ اقبال: انسانی زندگی کا مقصود جسمانی ترقی نہیں بلکہ

روحانی ترقی سمجھتے تھے۔ جس قسم کا انقلاب روس میں ہوا۔ اُس سے ملتا جلتا انقلاب ملتِ اسلامیہ میں بھی دیکھنا چاہتے تھے، لیکن اس کا محرک اسلام ہونا چاہیے نہ کہ الحاد۔''[1]

اقبالیات کے ضمن میں سید وقار عظیم نے تنقید اور تدریس ہر دو شعبوں میں ناقابلِ فراموش خدمات سرانجام دی ہیں۔ ایک ایسے دور میں جب اقبال کے خلاف ردِعمل ہماری ادبی دنیا کا سکہ رائج الوقت تھا، سید صاحب نے اقبال کے فکروفن کی حقیقی تفسیر و تعبیر پیش کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اُنہوں نے تدریسِ اقبال کا حق ادا کرتے ہوئے ہماری نئی نسلوں کے قلوب اور اذہان کو فکرِ اقبال سے منور کر دیا ہے۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جسے ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے

> میں کبھی اچھا طالب علم نہیں رہا۔ لیکن سید وقار عظیم کا انداز تدریس اتنا دلکش اور من موہنے والا تھا کہ غیر حاضر رہنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں یہاں ایک اور بات کا بڑی خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنا چاہوں گا کہ اقبالؒ کے لئے میرے دل میں جو محبت اور ان کی عظمت کا جو نقش ہے وہ سراسر پروفیسر وقار عظیم کی دین ہے وہ ہمیں اقبالؒ اور داستانوی ادب پڑھایا کرتے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں ان سے جتنا کچھ سیکھا کاش میں اس پر عمل بھی کر پاتا' تاکہ میں یہ دعویٰ کرنے کی پوزیشن میں ہوتا کہ میں سید وقار عظیم کا شاگرد ہوں۔
>
> عطاء الحق قاسمی

---

[1] اقبالیات کا مطالعہ۔ مرتب: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، لاہور، 1977ء، صفحات 304-305

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

سید وقار عظیم ۔ شخص و عکس

پروفیسر سحر انصاری

پروفیسر سید وقار عظیم ہماری ادبی اور تہذیبی تاریخ کی ایک اہم شخصیت ہیں۔ اُنہوں نے ایک نقاد، محقق، مدیر اور اُستاد کی حیثیت سے جو کارنامے سرانجام دیے ہیں اُنہیں ہر لحاظ سے مثالی کہا جا سکتا ہے۔ وقار صاحب اب ہم میں نہیں ہیں لیکن اُن کے علمی، ادبی اور تحقیقی آثار سے استفادے کی سبیل برابر جاری ہے۔ میں اپنے طالب علمی کے زمانے سے وقار عظیم صاحب کی تحریروں کا مطالعہ کرتا تھا۔ تاہم ان کی جس تحریر نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا (اور یہ 1950ء کی دہائی کا ذکر ہے)، وہ وقار صاحب کا ایک طویل مضمون تھا ’’اُردو کی کلاسیکی شاعری میں ترقی پسند عناصر۔‘‘ اُس وقت ایک عام اعتراض ترقی پسندوں پر یہ تھا کہ وہ اپنے ’’منشور‘‘ اور انقلابی نظریات کی بنا پر ادب کے کلاسیکی سرمائے کو دریا بُرد کرنا چاہتے ہیں۔ سید وقار عظیم نے ژرف نگاہی، دلائل اور مثالوں کے ذریعے یہ ظاہر کیا کہ اُردو کی کلاسیکی شاعری میں بھی انسانی مسائل کی جھلکیاں موجود ہیں جن پر ترقی پسند ادیب و شاعر توجہ دے رہے ہیں۔ وقار صاحب کے اس مضمون کے بعد ہی ظ انصاری کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں غزل خصوصاً حافظ شیرازی کی غزل میں بے عملی اور خیال پرستی کی نشان دہی کر کے اسے ترقی پسند نظریات کے منافی قرار دیا گیا تھا۔ اس

CS CamScanner

وقت سیّد سجاد ظہیر نام نہاد راولپنڈی سازش کیس کے تحت مچھ (بلوچستان) کی جیل میں اسیر تھے۔ وہیں انہوں نے ظ انصاری کے رد میں حافظ کا دفاع لکھا اور ''حافظ شناسی'' کے عنوان سے سجاد ظہیر کی ایک اہم تصنیف معرضِ وجود میں آ گئی۔

کراچی سے ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان کا ایک ماہ نامہ ''ماہِ نو'' جاری ہوا۔ 1948ء سے 1950ء کی دہائی میں سیّد وقار عظیم ''ماہِ نو'' کے مدیر رہے۔ پھر وہ لاہور منتقل ہو گئے جہاں پروفیسر کی حیثیت سے آخر تک خدمات انجام دیں۔ رسالہ ''نقوش'' اور مجلسِ ترقیِ ادب کے علمی و ادبی معاون بھی رہے۔ اس وقت تک وقار صاحب سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ میں نے وقار صاحب کو پہلی بار کراچی میں منعقد ہونے والے ادیبوں کے کنونشن میں دیکھا جس کے تحت پاکستان رائٹرز گلڈ کا قیام عمل میں آیا۔

سیّد وقار عظیم اس وقت موسم کی مناسبت سے گرم شیروانی، تنگ پاجامے میں ملبوس تھے۔ گلے میں مفلر تھا۔ قامت کشیدہ، چھریرا بدن اور شائستگی اور مشرقی تہذیب کا ایک مرقع۔ ہم لوگ اس وقت نئی نسل کے ادیبوں میں شمار ہوتے تھے۔ اس لیے بزرگوں اور سینئر ادیبوں سے مل کر بہت خوشی ہو رہی تھی۔ سابق مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی تمام زبانوں کے سرکردہ ادیب، شاعر، نقاد، ناول نویس، ڈراما نگار، افسانہ نویس یک جا تھے۔ بہت یادگار تقاریب ہوتی رہیں اور نتیجہ خیز فیصلے ہوتے رہے۔

وقار صاحب نے گلڈ کی کارکردگی میں عملی حصہ بھی لیا لیکن اپنے مزاج کی اصول پسندی کو ہر جگہ قائم رکھا۔ اس ضمن میں اس وقت رائٹرز گلڈ کے جنرل سیکرٹری

CS CamScanner

جمیل الدین حالی نے ایک واقعہ ایسا بیان کیا جس سے وقار صاحب کی اصول پسندی اور کھرے انداز سے بات کرنے کا رُخ سامنے آ جاتا ہے۔ عالی جی کا بیان ہے کہ رائٹرز گلڈ کی جانب سے کتابوں پر ادبی انعام شروع کیا گیا تھا۔ ایک سال جب ممتاز مفتی کا ''علی پور کا ایلی''، جمیلہ ہاشمی کا ''تلاش بہاراں''، شوکت صدیقی کا ''خدا کی بستی'' زیرِ غور تھا تو منصفین میں پروفیسر وقار عظیم بھی شامل تھے۔

''میں ججوں کو ایک قریبی ریستوران میں کھانے پر لے گیا۔ میں نے ہمت کر کے ڈاکٹر رائے پوری سے پوچھا: کہ جناب کیا آپ نے ''علی پور کا ایلی'' پورا پڑھ لیا تھا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے تو کسی قدر توقف کیا، پروفیسر سید وقار عظیم کہ میرے اُستاد نہ ہونے کے باوجود میرے لیے اُستاد کا درجہ رکھتے تھے اور مجھے پسند بھی کرتے تھے، ایک دم خفا ہو گئے۔ عالی میاں آپ کو معتمد انعام ہونے کی ذمہ داریاں ملحوظ رکھنی پڑیں گی۔ آپ کو ججوں سے اس موقع پر ایسے سوال کا کیا حق ہے؟''

وقار صاحب ایک سنجیدہ طبع انسان تھے لیکن حسِ مزاح سے عاری نہیں تھے۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ قیام لاہور کے زمانے میں وہ محمد طفیل کے رسالے ''نقوش'' کے ''پس پردہ مدیر'' تھے۔ یعنی رسالے پر مدیر یا شریکِ مدیر کی حیثیت سے وقار صاحب کا نام درج نہیں ہوتا تھا۔ تاہم بیشتر کارگزاری وقار صاحب کے ذمے تھی۔ اسی زمانے میں ''نقوش' کا ایک افسانہ نمبر زیرِ ترتیب تھا۔ وقار صاحب کے ایک بے تکلف دوست علامہ راشد الخیری کے صاحب زادے صادق الخیری تھے جو افسانہ نگار اور مترجم کی حیثیت سے معروف تھے اور ان کی ایک اشتہار ساز کمپنی بھی تھی۔ وقار صاحب نے افسانہ ارسال کرنے کے لیے اُنھیں ایک خط لکھا۔ پھر ایک

آدھ ہفتے کے بعد ایک اور خط میں ''نقوش'' کے لیے اشتہار کی فرمائش کی۔ صادق الخیری نے جواب میں خط لکھ کر دریافت کیا کہ پہلے افسانہ بھیجوں یا اشتہار؟ وقار صاحب نے شوخیِ طبع کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب لکھا کہ ''پہلے اشتہار بھیج دیجیے، پھر افسانے پر توجہ فرمایئے۔''

قیامِ پاکستان کے بعد کراچی سے جو غیر سرکاری ماہ نامے شائع ہوئے، ان میں صہبا لکھنوی کے ''افکار'' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ صہبا لکھنوی کا یہ ماہ نامہ ترقی پسند ادب کی اشاعت سے خصوصی دلچسپی رکھتا تھا۔ صہبا لکھنوی نے نامساعد حالات کے باوجود ''افکار'' کو تن دہی اور جاں فشانی سے کام لے کر جاری رکھا اور اس کے بعض یادگار خصوصی شمارے بھی شائع کیے۔ سید وقار عظیم کی تحریریں ماہ نامہ ''افکار'' میں شائع ہوتی تھیں۔ صہبا لکھنوی کے چچا پروفیسر سید نواب علی ایک جید عالم تھے۔ وہ بڑودہ اور جوناگڑھ کی ریاستوں میں وزیرِ تعلیم بھی رہ چکے تھے۔ ان کی اہم تصانیف میں ''سیرۃ الرسول''، ''معارج الدین''، ''تاریخ صحفِ سماوی''، ''الغزالی'' بہ طورِ خاص اہم ہیں۔ ہجرت کے بعد وہ کراچی میں سکونت پذیر ہوئے۔ اُن کے دو بیٹے سید احمد علی اور سید محبوب علی تھے۔ دونوں کا تعلق بینک کاری سے تھا۔ بڑے بیٹے سید احمد علی کی شادی عربی کے ممتاز ادیب اور پروفیسر ڈاکٹر یوسف کی ہمشیرہ سے ہوئی جب کہ دوسرے بیٹے سید محبوب علی کی شادی سید وقار عظیم کی صاحب زادی سے ہوئی۔ میرا قریبی تعلق اس پورے گھرانے سے رہا۔ اس کے بعد وقار صاحب جب کراچی آتے تو سید محبوب علی کے مکان ہی میں قیام کرتے تھے۔ میں کوشش کرتا تھا کہ فرصت کے لمحات میں وقار صاحب سے ملاقات کروں اور اُن کے خیالات سے مستفیض ہوں۔

CS CamScanner

وقار صاحب متانت اور سنجیدگی کا پیکر تھے لیکن ایک اچھے اُستاد اور ایک روشن خیال ادیب کی حیثیت سے اُن کے سماجی برتاؤ میں کسی قسم کا تکلف یا تصنع شامل نہیں تھا۔ میں مختلف موضوعات پر اُن سے گفتگو کرتا تھا۔ وقار صاحب کے چھوٹے بھائی سید اقبال عظیم سے بھی میرے قریبی مراسم تھے۔ وہ بھی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ وقار صاحب سے بات کر کے بہت کچھ حاصل ہوتا تھا کیوں کہ مختلف مباحث اُن کے ذہن میں واضح ہوتے تھے اور اُن پر اظہارِ خیال کرتے وقت وہ اس امر کا خیال رکھتے تھے کہ گفتگو کا مرکز و محور متعلقہ موضوع ہی رہے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں اس وقت شروع کرتے تھے جب متعلقہ موضوع پر سیر حاصل گفتگو ہو جائے۔

اُردو زبان کے تنقیدی سرمائے کا جائزہ ظاہر کرتا ہے کہ شاعری پر مضامین اور کتابیں زیادہ تعداد میں لکھی گئی ہیں۔ داستان، ناول اور افسانے پر تنقید کا حجم نسبتاً مختصر ہے۔ داستان، ناول اور افسانے کو مجموعی طور پر فکشن یا فسانے کا نام دیا گیا۔ یہ کہنا حقیقت سے قریب ہے کہ اُردو فکشن پر شاید سب سے زیادہ سید وقار عظیم نے لکھا ہے اور اُنہیں بعض اعتبار سے یہ فوقیت بھی حاصل ہے کہ انہوں نے بالخصوص اُردو کے داستانی ادب پر زیادہ وسعت، گہرائی اور جدید ذہن کے ساتھ لکھا ہے۔ داستان سے اپنی خصوصی دلچسپی کے محرکات اور جواز کو خود وقار صاحب نے اس طرح بیان کیا ہے:

''داستان کو اُردو نثر کی سب سے اہم صنف سمجھنے کا میرے پاس وہی جواز ہے جو غزل کو شاعری کی اہم صنف سمجھنے کا۔ جس طرح غزل ہمارے مشرقی مزاج اور اس مزاج کے اکثر نازک اور پیچیدہ پہلوؤں کی عکاس ہے، اسی طرح داستانیں

ہماری تہذیبی زندگی اور اس کے بے شمار گوشوں کی مصور و ترجمان ہیں جس طرح غزل کے حرف حرف میں ہمارے ساز دل کی ہر جھنکار اور اس شیشے کی ہر کھنک سنائی دیتی ہے اسی طرح داستان کی ہر سطر میں تقریباً ڈیڑھ سو برس کی معاشرت، تہذیب اور انداز فکر و تخیل کا رنگ صاف جھلکتا اور چھلکتا نظر آتا ہے۔ غزل اور داستان دونوں ہماری داخلی اور خارجی زندگی کی بڑی مکمل اور بڑی دلکش تصویریں ہیں۔''

وقار صاحب کی تحریر تنقید اور تجزیے کی خوبیوں کا اندازہ اس ایک اقتباس ہی سے اچھی طرح ہو جاتا ہے۔ ایک تو داستان سے ان کی دلچسپی کا احوال واضح ہو گیا۔ دوسرے انہوں نے غزل کی مثال دے کر داستان اور غزل کی معاشرتی اور تہذیبی، خارجی اور داخلی اہمیت کو متوازی تجزیے کے ذریعے اس طرح اجاگر کیا ہے کہ داستان کے ساتھ ساتھ غزل کی اہمیت اور انفرادیت بھی اجاگر ہوتی چلی گئی ہے۔ وقار صاحب کی زبان اور انداز بیان کا تو کیا کہنا تاہم وہ ادبیت اور فیصلوں کی قطعیت کے ساتھ جس طرح اپنی تنقیدی تحریروں میں شگفتگی پیدا کر دیتے ہیں یہ وقار صاحب ہی کا خاصہ ہے۔

وقار صاحب کی افسانوی ادب پر تحریروں کی اشاعت کا آغاز قیامِ پاکستان سے قبل ہی ہو چکا تھا۔ نیاز فتح پوری کے ''نگار'' اور دلی سے شائع ہونے والے سرکاری ماہ نامے ''آج کل'' میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ وقار صاحب نے اُردو افسانے کے تاریخی، موضوعاتی اور اسالیبی پہلوؤں پر بھی لکھا ہے لیکن ان کو یہ اختصاص بھی حاصل ہے کہ خود ''فن افسانہ نگاری'' پر بھی ان کی ایک مستقل کتاب موجود ہے اور انہوں نے ایک طرح سے اُردو افسانے کی

CS CamScanner

''بوطیقا'' تیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح اُردو افسانے کے مجموعی سرمائے کی تحسین اور تنقید کے ساتھ ساتھ وہ نئے نکات بھی اجاگر ہوئے ہیں جن پر پہلے بہت کم توجہ دی گئی تھی اور جو وقار صاحب کے قلم سے نکلنے کے بعد آئندہ فکشن کے نقادوں کی رہنمائی بھی کرتے رہے۔

سید وقار عظیم نے اُردو ناول کو ایک طرح سے داستان اور افسانے کے درمیان کی کڑی قرار دیا ہے۔ ان کی کتاب ''داستان سے افسانے تک'' اگرچہ مختلف مضامین کا مجموعہ ہے لیکن جب اُنہیں یک جا اور تسلسل کے ساتھ پڑھا جائے تو داستان، ناول اور افسانے کے ارتقا اور ہر ایک صنفِ نثر کی انفرادیت واضح ہوتی چلی جاتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کو اُردو فکشن کا ایک اہم نام سمجھنے کے ساتھ ساتھ یہ تاثر بھی بہ وجوہ قائم ہے کہ وہ ایک ''مشکل'' فکشن نگار ہیں۔ اس کے اسباب بالکل واضح ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے مشرق کے ساتھ ساتھ مغرب کے ادب، فلسفے اور تاریخ سے جس قدر اور جس طرح تخلیقی انداز میں استفادہ کیا اور اپنی تحریروں کا جزو بنایا اس کی دوسری مثال کم از کم اُردو فکشن میں نہیں ملتی۔ وقار صاحب نے قرۃ العین حیدر کی اہمیت پر روشنی تو ڈالی ہے لیکن جس طرح ان کے انفرادی اسلوب کو اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے وہ وقار صاحب کی تنقیدی بصیرت کی عمدہ مثال ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اُردو کے ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر نے تکنیک کے اس مغربی انداز کو اپنایا اور اس کے عناصر کو بڑی خوبی سے مشرقی روایت کے حسن میں سمویا ہے۔

ان کے ناولوں کا فن ناول نگاری کی اس جدید روش کا بڑا کامیاب نمونہ ہے جس میں واقعات اور ان کے ارتقا سے زیادہ فرد کی زندگی اور اس کی ذہنی اور جذباتی کیفیتوں کے بیان کو کہانی سمجھا جاتا ہے۔ اس فن نے پلاٹ کا وہ تصور باقی نہیں رکھا جس میں واقعات کی ایک کڑی دوسری کڑی سے مربوط اور وابستہ رہ کر ایک مکمل زنجیر کی تشکیل کرتی ہے۔'' (داستان سے افسانے تک، وقار عظیم، ص 130-129)

وقار صاحب نے داستان، ناول اور افسانے کے علاوہ اُردو ڈرامے سے بھی خصوصی دلچسپی قائم رکھی۔ اُنہوں نے آغا حشر کے ڈراموں کے متن، تحقیق اور جستجو کے بعد صحت کے ساتھ مرتب کیے۔ آغا حشر کے ڈراموں کے متن ایک مدت تک اس لیے ناقص رہے کہ ان کی تدوین کی طرف توجہ نہ دی گئی اور آغا حشر کے زمانے میں اور ان کے بعد بھی جن افراد یا اداروں نے ان کے ڈرامے پیش کیے ان میں اپنی طرف سے تبدیلیاں اور اضافے کرتے رہے۔ آغا حشر کی اصل اور صحیح تحریروں کو تلاش کر کے ان کے صحیح متن تیار کرنے کا کام اتنا آسان نہ تھا لیکن وقار عظیم نے متنی تنقید کے اصولوں کو مدنظر رکھ کر یہ اہم کام بہ حسن وخوبی مکمل کیا۔ اس ضمن میں وقار صاحب کے مزید کارنامے اس وقت سامنے آئے جب امتیاز علی تاج کے زمانے میں مجلسِ ترقی ادب نے اُردو ڈرامے کے متون کو تاریخی ترتیب کے ساتھ صحیح اور دیدہ زیب انداز میں شائع کیا۔ متون کی تصحیح، ترتیب اور ان کی پیشکش میں سید وقار عظیم کی خدمات سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کی ایک تحریر کا اقتباس پیش کرنا چاہوں گا یہ وقار صاحب کی تنقید نگاری کے وصف کو جس طرح ظاہر کر رہا ہے میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

’’وقار عظیم داستانوں کو زندگی اور تہذیب کا ترجمان سمجھتے ہیں۔ یعنی وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ اور اسی زاویۂ نظر سے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ انہوں نے باغ و بہار، رانی کیتکی کی کہانی، داستانِ امیر حمزہ، آرائش محفل، بیتال پچیسی، نو رتن، فسانۂ عجائب، شرارِ عشق، شگوفۂ محبت، گل و صنوبر، قصہ اگر و گل اور سرشار کی الف لیلیٰ جیسی مشہور مختصر اور طویل داستانوں کا تنقیدی مطالعہ اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ یہ عبارت دیکھیے جس میں اُنہوں نے ہر داستان کی الگ الگ اور منفرد خوبیوں کا ذکر کیا ہے:

’’مجھے ہر داستان میں ایسی بات نظر آئی ہے جو صرف اس داستان کا امتیاز ہے اور اسی امتیازی خصوصیت کو اپنے مضامین کا موضوع بنایا ہے۔ مثلاً باغ و بہار کا امتیاز قصہ گوئی اور لطف بیان کی خصوصیتوں کے علاوہ اس کا وہ متوازن سنبھلا ہوا اسلوب ہے جو باغ و بہار کے علاوہ کسی اور داستان میں نہیں ملتا، اسلوب کا یہی توازن و ہمواری اور بیان کی گئی شگفتگی و دل نشینی ہے، جس نے اسے قبولِ عام کا شرف بخشا ہے۔ فسانۂ عجائب کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کا وہ انداز بیان ہے جس پر لکھنؤ کے تہذیبی مزاج کی گہری چھاپ ہے، رانی کیتکی کی کہانی انشاء کی ذہانتِ طبع اور جدت تخیل کی ترجمان ہے۔ نو رتن کی کہانیوں کے تنوع نے انہیں دل چسپ بنا دیا، حاتم کی مہموں میں حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے دلکشی پیدا ہوئی ہے اور داستانِ امیر حمزہ کے دو مختلف نسخوں میں مصنفوں کے مزاج اور ماحول کا نقش ثبت ہے۔‘‘ (ہماری داستانیں، وقار عظیم، ص 6)

اس عبارت سے مختصراً داستانوں کے متعلق ان کے خیالات کا اندازہ ہو

جاتا ہے اور یہ بھی علم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک کون سی داستان کس لیے قبولِ عام رکھتی ہے اور وجہ مطالعہ بنی ہے۔

* * *

میں 1965ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں تعلیم ختم کر کے پاکستان، لاہور کے راستے سے آیا تھا۔ اُستادِ گرامی مرتبت پروفیسر احتشام حسین نے میرے تعارف کے طور پر اپنے چند دوستوں کو خطوط لکھ دیئے تھے کہ ایک اجنبی اور اکیلے نوجوان کی آئندہ زندگی میں معاون ہوں گے۔ ڈاکٹر وحید مرزا، فیض احمد فیض، سید سبطِ حسن، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور سید وقار عظیم۔ ان میں کوئی بھی تعارف کا محتاج نہیں۔ وقار عظیم صاحب کی فکشن پر تنقید ہمارے نصاب کا حصہ تھی۔ اُن کی تصویریں دیکھی تھیں، ملے تو کمال شفقت کے ساتھ۔ مجسم شرافت، علم، متانت، بردباری۔

اتنا علم اور ایسی عاجزی اور اتنی بے نیازی۔ پہلے دن جیسے ملے۔ زندگی کے آخری دنوں تک اس رویے میں کہیں کمی نہ دیکھی۔

افتخار عارف

وقار عظیم صاحب کی کتاب اُردو ڈراما تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ

ضیا محی الدین

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

وقار عظیم صاحب بیسویں صدی کے ایک بہت ہی معتبر نقاد اور مشفق اُستاد تھے۔ دونوں حیثیتوں سے ان کا مقام بہت اُونچا ہے۔ اُردو داستانوں اور افسانے پر ان کا کام ایسا مستند ہے کہ بیسویں صدی کی ہر بڑی علمی اور ادبی شخصیت نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ اُردو ڈرامے پہ جو مضامین اُنہوں نے لکھے اور جو اُن کی کتاب اُردو ڈراما۔ تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ میں شائع ہوئے ہیں ان کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ڈرامے میں ان کی دلچسپی اور ڈرامے کے فن پہ ان کی نظر کتنی گہری تھی۔

ہمارا ڈرامائی ورثہ بہت مختصر ہے اس لئے ہمارے یہاں ڈرامے کی بھر پور روایت نہیں رہی۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ ڈراما ایسے معاشرے میں پھلتا پھولتا ہے جہاں تھیٹر اس معاشرے کی ثقافتی زندگی کا حصہ ہو۔ ہمارے ہاں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ہماری زبان کی تاریخ میں صرف پچھتر اسی سال کا ایک دور ایسا آیا ہے جب پیشہ ورانہ میلوڈراما (جو ڈرامے کی ایک ہیجان خیز صنف ہے) دیکھنے میں آیا۔ اس کا آغاز واجد علی شاہ کے مختصر دور حکمرانی میں ہوا۔

یہ ڈرامائی سرگرمی انیسویں صدی کے وسط میں ممبئی کے پارسی منتظمین کی تاجرانہ مہم جوئی کے بغیر نہ تھی۔ وہ لوگ بھانپ گئے تھے کہ میلوڈراما کی صنف (جس میں ناچ گانا

بھی شامل ہوتا ہے) جو اس وقت انگلستان میں بہت مقبول تھی ہمارے لوگوں کا مزاج خوب بھائے گی۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اُردو زبان (مثنویات کے ذخیرے کی وجہ سے، جن میں ناکام محبت کی داستانیں پیش کی جاتی تھیں) اس عہد کے تماشائیوں کے ذوق کو سب سے زیادہ تسکین پہنچائے گی چنانچہ انہوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر بہت سے منشیوں کو معقول معاوضے پر ممبئی بلوایا تاکہ وہ نئے سے نئے میلوڈراما لکھیں۔

ایک بات ذہن میں رکھیئے۔ منشی آج کل اس شخص کو کہا جاتا ہے جو تاجروں کے حساب کتاب کی دیکھ بھال کرے یا اس شخص کو سمجھا جاتا ہے جو ڈاک خانوں یا کچہریوں کے باہر زمین پر قلم کان میں اُڑس کر اپنا بستہ بچھائے رکھتا ہے کہ اس سے عرضیاں وغیرہ لکھوائی جائیں۔ لیکن انیسویں صدی میں یہ ایک قابل تعظیم لفظ تھا اور اُردو کے ادیبوں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اُردو کے ناول نگار پریم چند کو بھی منشی پریم چند کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

میں نے واجد علی شاہ کا ذکر کیا۔ وقار عظیم صاحب ہمیں بتاتے ہیں کہ “ہمارے ڈرامے کی جو شکل آج سے سو ڈیڑھ سو سال پہلے تھی اس کا نقش وہ چھوٹا سا ناٹک تھا جو واجد علی شاہ نے اپنی ولی عہدی کے دنوں میں لکھا تھا اور جس کی بنیاد رادھا اور کنہیا کی داستان محبت ہے اس داستان کو ڈرامائی شکل دینے میں واجد علی شاہ نے کیسی عرق ریزی کی اس کی ایک مثال تو یہ ہے کہ انہوں نے کرداروں کی پوشاکوں اور زیوروں کی ایک نہایت جامع تفصیل لکھی، جو قابل غور ہے۔

1۔ کنہیا۔ کارچوبی مکٹ، کارچوبی گلوبند، جانگھیا، گھانگھرا، چاندی کی بانسری۔

2۔ رادھا۔ لہنگا، پھریا، پیشواز، نتھ، بینا اور تمام ہندوانے زیور۔

3۔ سکھیاں۔ ڈوپٹہ، پاجامہ، پیشواز، جیغہ، کلغی، سلطان بند اور کُل زیور۔

4۔ پریاں۔ پُرزر جامۂ حُسن، پُرزر پاجامہ، دو کار چوبی پَر، کُل زیور۔

5۔ دیو۔ سیاہ جاکٹ، سیاہ پتلون، سیاہ دستانے، سیاہ جرابیں کا مقوے
کریہہ چہرہ، بڑے بڑے سیاہ کاغذی پَر، لکڑی کا گُرز

6۔ جوگن۔ شنجرفی کفنی، تہبند، مصنوعی لمبی جٹا، کپڑے کی جھولی، تونبا،
کپڑے کا بڑا سانپ، لکڑی کی بیراگی، بھبھوت۔

7۔ مکھن والیاں۔ ساری، ہندوانہ زیور، لکڑی کی متھانی، مٹکی، سینی، کھریا،
کلھیاں، آخری چاروں چیزیں چاندی، گلٹ یا پیتل کی۔

8۔ پنہارنیں۔ ساری، زیور، تانبے کا کلسا، ڈول، رسّی، مصنوعی کنواں اور گراری۔

9۔ مسافر۔ انگرکھا، پاجامہ، پگڑی، گٹھری، لوٹا، لاٹھی، توشہ بستہ، چھوٹی دری۔

10۔ غربت۔ انگرکھا، چپکن، پاجامہ، پگڑی، پٹکا سب چیزیں سفید۔

11۔ رام چیرا۔ دھوتی، مرزائی، پہنیا، انگوچھا، جینؤ، ہاتھوں کے کڑے چاندی کے۔

12۔ رہس والیاں۔ پُرزر دوپٹا، پُرزر پاجامہ، مسالے دار پُرزر پیشواز، زیور۔ [1]

وقار عظیم صاحب نے واجد علی شاہ کے ڈرامے کے شروع میں ان ہدایات (جنہیں Stage Directions کہتے ہیں) کا ذکر کیا ہے اور یہ ان ہدایات سے مختلف نہیں جو ہمیں برنارڈ شا کے ڈراموں میں ملتی ہیں۔

> ''دو سکھیاں کار چوبی پَر لگا کر بھاری جامۂ حُسن پہنیں۔
> ایک کا نام ارغوان پری۔ دوسری کا نام زعفران پری ہے۔

---

[1] اُردو ڈراما، تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ، صفحہ 137

CS CamScanner

اور ایک مرد بہ شکل دیو کریہہ منظر بنے۔ اس کا نام عفریت ہے۔
اور ایک سکھی جوگن بنے اس کا نام صحرا ہے۔
اور ایک مرد خادم جوگن کا بنے' اس کا نام غربت ہے۔
بعد ختم رہس (مراد ناچ) سب سکھیاں بیٹھ جائیں
اور ایک جانب پریاں دونوں کرسیوں پر بیٹھیں
اور ایک طرف جوگن کرسی پر اجلاس کرے۔
اور دیو پریوں کے سامنے گرز لئے ہاتھ باندھے کھڑا ہو۔
اور غربت جوگن کے آگے دست بستہ استادہ ہو۔
اور ایک جانب رادھا کنہیا مکٹ اور نتھ بینا لگائے ہوئے،
گھونگھٹ بنگالہ نکالے ہوئے' کرسیوں پر اجلاس کریں۔
اور رام چیرا دونوں کی خدمت میں دست بستہ حاضر ہو۔
اور چار سکھیاں' ایک کا نام للتا' دوسری ساکھا' تیسری چینا' چوتھی لزوا'
جیغہ کلغی لگائے ہوئے' جھرمٹ کئے ہوئے علیحدہ کھڑی ہوں۔
اور چار پنہارنیں مصنوعی کنوئیں سے ٹھمری گاتی ہوئی۔ پانی بھرتی ہوں۔
اور ایک مرد مسافر کی صورت میں بنا ہوا مع گٹھری اور عصا بدست حاضر ہو
اور چار مکھن والیاں ہوری۔ گاتی ہوئی اور مکھن نکالتی ہوئی ہوں۔
جوگن کو چاہیئے غم زدہ بیٹھنا۔
ان ہدایات کے بعد ناٹک کے مکالمے شروع ہوتے ہیں۔" [1]

---

[1] اردو ڈراما۔ تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ، صفحہ 139

ظاہر ہے کہ اس ناٹک کے لوازمات میں اُس زمانے میں لاکھوں روپے صرف ہوئے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں روایتی Proscenium تھیٹر کا عروج بھی دیکھا ہے اور زوال بھی۔ دائرے میں کھیلے جانے والے Theatre in the round کو بھی اُبھرتے دیکھا۔ براڈوے کے بڑے بڑے سٹیج کو بھی یوں پھیلتے دیکھا ہے کہ رومن Colosseum کے عظیم الشان تماشوں میں Spectacles کی یاد تازہ ہو جائے۔ اور نئے نئے تجرباتی تھیٹر کے ایسے دقیق کھیل بھی دیکھے کہ باہر نکل کر کھلی فضا میں سانس لینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میں نے پرانی وضع کے تھیٹر پر فرسودہ ہونے کی پھبتی بھی سنی ہے اور جدید Avant Garde تھیٹر پر مبہم ہونے کا الزام لگتے بھی سنا ہے۔

ایک دوسرے کو یکسر رد کرنے کا یہ کھیل نہ ختم ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ جنہیں تھیٹر کی تقدیس کی فکر ہے وہ نئی اختراع کو بری نظر سے دیکھتے اور جو روایت کو پرانا فیشن اور رجعت پسند گردانتے ہیں وہ سجے سجائے ڈرائنگ روم والے کھیل کو ایک فرسودہ اور کھوکھلی چیز سمجھتے ہیں۔ میں نہ ایک کا پرچارک ہوں نہ دوسرے کا، میرا عقیدہ یہ ہے کہ ڈرامہ خواہ دائرے میں کھیلا جائے یا Proscenium کے اندر۔ جادو جگانا شرط ہے۔ میری مراد شعبدہ بازی نہیں بلکہ وہ سحر ہے جو دیکھنے والے کی حدِ نظر کو پھیلا دے، جو اچھے بُرے تصورات کو ہلا کر، جھنجھوڑ کر رکھ دے۔ اور اُنہیں تمنا کا دوسرا قدم لینے پر اُکسائے۔

ڈراما ایک متحیر صنف ہے۔ ڈراما آپ کو ہنساتا بھی ہے رُلاتا بھی ہے۔ وہ آپ کو جھنجھوڑتا بھی ہے، اپنی اعلیٰ ترین سطح پر وہ آپ کی سوچ کو اُکساتا ہے۔ ڈراما سٹیج پہ دیکھنے کیلئے لکھا جاتا ہے، پڑھنے کے لئے نہیں۔ لیکن ڈراما پیش کرنے والوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ آپ کو اس طرح مسحور کریں کہ آپ کی بینائی کو چونکا دے اور سماعت کو تڑپا

دے ۔ ایسا کرنے کے لئے اس فن کی تربیت حاصل کئے بغیر نہ اداکار یہ کر سکتے ہیں نہ ہدایت کار ۔ یہ فن کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لئے آپ یہ کتاب پڑھئے ۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اُردو پڑھنے والوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ اُنہوں نے پروفیسر وقار عظیم صاحب کے تمام مضامین کو یکجا کر دیا ہے ۔ جو اُنہوں نے ڈراما اور اس کے فن’ اس کا فنی تجزیہ’ اس کی فنی قدریں اور ”ڈراما اور زندگی کا باہمی ربط“ کے بارے میں 1954 اور 1967 کے درمیان میں لکھے تھے ۔

کتاب کا وہ حصہ جس میں وقار عظیم صاحب نے اندر سبھا کی ادبی حیثیت اور فنی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے وہ پڑھنے والوں کے لئے ایک حیرت انگیز انکشاف ہوگا ۔ اُنہوں نے امانت کی اندر سبھا کے متعلق جو روایتیں عام ہوگئی تھیں ۔ ان سب کو رد کرتے ہوئے اس کے انداز اور اس کے فنی پہلوؤں کا بہت تفصیل سے تجزیہ کیا ہے ۔ اور نہایت عمدگی سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہمارے ڈرامے کا سارا ادبی اور فنی تخیل اندر سبھا سے ماخوذ ہے ۔ ڈرامے کا شوق رکھنے والوں کو یہ کتاب مفید معلومات کے علاوہ انتہائی لطافت بھی پہنچائے گی ۔ میں وقار عظیم صاحب کی اس بات سے سو فیصد متفق ہوں کہ ”ڈرامے کے مطالعے سے اس عہد کے مزاج’ رسوم’ عادات و اطوار اور انداز فکر اور جذبات و احساسات کی صحیح تصویریں سامنے آتی ہیں ۔“

پروفیسر وقار عظیم صاحب کی یہ کتاب اُردو کا نہایت اہم سرمایہ ہے ۔

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

سید وقار عظیم اور ڈرامے کا فن

اصغر ندیم سید

ارسطو کی بوطیقا (Poetic) نے ڈراموں کے ارتقا، تفہیم اور ترویج کے سلسلے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اپنے زمانے میں یونانی ڈراموں کو دیکھ کر اور پڑھ کر ارسطو نے ڈرامے کی شعریات وضع کی تھی۔ اور ڈرامے کی اسی شعریات نے مغربی ڈراموں کی تدریس اور پیشکش میں ایک بڑے عرصے تک شائقین ڈراما کو حیرت واستعجاب سے معمور رکھا بلکہ ڈراموں کے مختلف نظریات کی بنیاد بھی اسی حوالے سے پڑی۔ کچھ اسی طرز کا فیض ہندوستانی ڈراموں کے سلسلے میں بھرت منی کے نائیہ شاستر نے بھی پہنچایا ہے۔ ڈرامے کی تدریس اور پیشکش میں نائیہ شاستر اور ارسطو کی شعریات نے سالہا سال غور وفکر کی راہیں ہموار کیں اور اظہار کے مختلف اسالیب کی اہمیت کو روشن کیا ہے۔

ارسطو نے جو عالمی ادب میں ڈرامے کے فن کو فنی اور تخلیقی سطح پر متعارف کرایا۔ ایسے ہی برصغیر میں ہندوستانی ڈرامے کی تاریخ کو جس تخلیقی نقاد نے اُردو کے افسانوی ادب کے ساتھ کئی سطحوں پر عالمی اور تنقیدی سطح پر تکنیکی باریکیوں کے ساتھ پرکھا اور تجزیاتی شعور کے ساتھ ہندوستانی مزاج کو تھیٹر اور ڈرامے کے ذریعے دریافت کیا۔ وہ پروفیسر سید وقار عظیم ہیں۔ جو بنیادی مطالعہ' ڈرامے کے فن اور تکنیک سے متعلق وقار عظیم صاحب نے ہمیں دیا آج تک ڈرامے کی تنقید انہی

اُصولوں پر کارفرما ہے۔ سید صاحب نے یونانی المیہ کے عناصر کے ذریعے برصغیر کے ڈرامے کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اور برملا اعتراف کیا کہ ہمیں ڈرامے کے فن کو جاننے اور پرکھنے کے لیئے جن بنیادی اُصولوں کو معیار بنانا چاہیے وہ مغرب ہی سے آئیں گے اور ہمیں انہیں جانے بغیر ڈرامے کی جڑوں اور روح کو سمجھنا مشکل ہوگا۔ سید وقار عظیم نے اپنے اصول اس بیان میں وضع کر دیئے تھے۔

''ڈرامے کے فن پر انگریزی میں جو کتابیں میں نے پڑھیں۔ اُن سے متاثر ہوا۔ اُن کے خیالات لیئے۔ اُنہیں اپنے اندر جذب کیا۔ اُنہیں اپنے الفاظ میں بیان کیا۔ اور اسے ضروری سمجھتا ہوں میں کہ جو چیز ہم مغرب سے لائے ہیں، اُس کا فن بھی وہیں سے آئے گا۔ البتہ اسے اپنے ماحول میں اور یہاں کی ضرورت کے سانچے میں ڈھالنا چاہیئے۔ اس کی میں نے کوشش کی ہے اپنی تحریروں میں۔''

اس بیان نے سید صاحب کے نقطہ نظر اور فنی شعور کا تعین کر دیا ہے۔ اگر اُن کا یہ مطالعہ نہ ہوتا تو وہ سائنسی اور تخلیقی انداز نہ اپنا سکتے۔ اُنہوں نے معروضی اور فکری پہلوؤں سے ڈرامے کی تاریخ و تحقیق کے ساتھ ساتھ فنی اور تکنیکی زاویوں کو بہت باریکی سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ افسانوی ادب کی تنقید میں سید وقار عظیم کا انداز ایک سکالر اور ایک اُستاد کا امتزاج ہے۔ جس سے ڈرامے کے فن کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ تمام علمی اور فکری بحثیں جن کا آغاز یونانی ڈراموں سے ہوا تھا اُن کو برصغیر کے ماحول اور مزاج کو سمجھتے ہوئے سید وقار عظیم نے اُردو کی زبان کی اصطلاحات اور تکنیکی معلومات سے ہم آہنگ کر دیا۔ یہ بے حد بنیادی کام تھا جس کی اُردو زبان میں پہلے سے کوئی مثال موجود نہیں تھی۔ جس طرح مولانا حالی نے تنقیدی اصولوں کو دریافت کرنے کے لیے مغربی نظریہ سازوں کا

سہارا لیا تھا۔ اور ابتدائی خدوخال واضح کرنے کی کوشش ''مقدمہ شعروشاعری'' میں کی تھی۔ بعد کی تنقید کے لیے وہ بنیاد بن گئی۔ اگرچہ مولانا حالی انگریزی اور دوسری مغربی زبانیں نہیں جانتے تھے پھر بھی اُنہوں نے صحیح نتائج وضع کیے لیکن سید وقار عظیم تک آتے آتے انگریزی اور مغربی ادب کی تنقید ہمارے ادب اور ہمارے شعور کا حصہ بن چکی تھی۔ اس لئے وقار صاحب نے اُردو ادب کو ڈرامے کے فن میں تمام جدید وقدیم نظریات وخیالات سے وسعت بخشی ہے۔ اُن کے مضامین کا مجموعہ ''اُردو ڈرامہ.... فن اور منزلیں'' وہ دستاویز ہے جو آج بھی برصغیر میں اُردو ڈرامے کے فن پر انتہائی بنیادی اور معتبر حوالہ ہے۔

چند سال پہلے میں کلکتہ ایک کانفرنس میں گیا تو پہلی شام ہی مجھے کلکتہ کے تھیٹر کے گروپس کا ایک وفد ملنے آ گیا۔ مجھے ان سے کلکتہ میں تھیٹر کی صورت حال اور روایت کا صحیح تناظر حاصل ہوا۔ ان میں تھیٹر کی روح رواں اور سوشل Activist ظہیر انور بھی شامل تھے۔ ظہیر انور نے تھیٹر پر کئی کتابیں اُردو میں لکھی ہیں۔ اُنہوں نے اپنی ساری کتابیں مجھے دیں اور نئی کتاب کا دیباچہ بھی لکھوایا جو شائع ہو چکی ہے۔ اُنہوں نے اپنی کتابوں میں سید وقار عظیم کی کتابوں سے کئی حوالے دیئے ہیں۔ ان کے نزدیک ڈرامے پر جس تنقید نے اُنہیں مدد دی یا رہنمائی کی وہ سید وقار عظیم کی ہے۔ ظہیر انور خود بھی صاحب مطالعہ اور ہندوستانی زبانوں میں ڈرامے کی ترویج کے پارکھ ہیں۔ اُن کی کتاب سے سید وقار عظیم کا یہ اقتباس بے حد اہم معلوم ہوتا ہے:

''ڈرامے میں ہر لفظ کی ایک اہمیت ہوتی ہے۔ ہر لفظ کسی نہ کسی بات کا انکشاف بھی کرتا ہے۔ اور قصے کے آگے بڑھنے کے لئے راستہ بھی ہموار کرتا ہے۔ اس لیئے مکالمے میں لفظ اتنے ہی ہونے چاہئیں جتنے ان دونوں مقاصد کے حصول میں مدد دیں۔''

CS CamScanner

مکالمے کی تعریف کے ضمن میں وقار صاحب کی بات کو امریکی مصنفین نے بھی تقریباً انہی الفاظ میں لکھا ہے۔ خود ٹیلی وژن ڈرامہ لکھتے ہوئے میں نے اسی اصول کو رہنما بنایا۔ سید صاحب کی کتاب میں دو حصے ہیں۔ فن کے حصے میں بہت سے بنیادی سوالوں کا جواب فراہم کیا ہے۔ ''ڈرامے کے فنی تجزیہ'' کا مضمون اگر کہانی کے ارتقاء کے حوالے سے پڑھیں تو سید وقار عظیم کے داستان، ناول اور افسانے کے فنی پہلوؤں پر مضامین یاد آ جاتے ہیں اور یہ مضمون ان کی توسیع معلوم ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کہانی کی فنی ساخت اور سٹرکچر کے حوالے سے جو نظریہ سید وقار عظیم کا شروع سے چلا آتا ہے۔ اُسے انہوں نے ڈرامے کی دلچسپی اور اُتار چڑھاؤ کے لئے یہاں بھی ضروری قرار دیا ہے۔

> ''تیاری اور وضاحت کے فنی عناصر کے علاوہ واقعات کے انتخاب اور واقعات اور کرداروں کے رشتے کو تماشائی کے نقطہ نظر سے فطری زندگی کے مطابق اور اعتبار سے قابلِ قبول اور جذباتی حیثیت سے مؤثر بنانے کے لئے ڈرامہ نگار کو جن فنی اصولوں اور ضابطوں کی پابندی کرنی پڑتی ہے اس کی اہمیت مسلّم ہے۔''

برصغیر میں اٹھارویں صدی کے وسط کے آس پاس کلکتہ میں ڈرامہ کمپنیاں اپنے ابتدائی خدوخال کے ساتھ وجود پذیر رہی تھیں۔ میں نے کلکتہ کے سفر میں تھیٹر کے ان ابتدائی خدوخال کو دیکھا۔ قدیمی تھیٹر کے آثار اور تھیٹر کے اسالیب کی کچھ اشکال دیکھنے کو ملیں۔ برصغیر میں ناٹک اسٹیج پر مذہبی، فوک اور علاقائی کہانیوں پر، محدود وسائل سے معمولی کاسٹیوم اور مقامی سازوں کی موسیقی کے ذریعے کھیل ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ کئی سالوں تک چلتا رہا۔ کسی نے اسے رام لیلا کا نام دیا۔ کسی نے اسے لوک تھیٹر کا نام دیا۔ مگر یہ بے حد ابتدائی سطح پر رہا۔ پھر جب کلکتہ میں انگریزوں، پرتگالیوں اور حملہ آوروں

نے اپنے کلچر کو کہانیوں کے ذریعے متعارف کرانے کا سلسلہ شروع کیا تو باہر کی زبانوں کے ڈرامے ترجمہ ہونے شروع ہوئے۔ اور برصغیر میں تھیٹر کا باقاعدہ تصور سامنے آیا۔ ایسے میں پارسی' کلکتہ اور بمبئی کے ساحلوں پر اُترے۔ وہ اپنے ساتھ فنون لطیفہ کے مختلف میڈیم لے کر آئے۔ جن میں مجسمہ سازی کے ساتھ تھیٹر کا آرٹ بھی تھا۔ اس لیئے تھیٹر کے تمام شعبوں میں پارسی فنکاروں نے بنیادی کردار ادا کیا۔

سید وقار عظیم نے انہی جزوں کی تلاش میں برصغیر کے سبھی ڈرامہ اسالیب کا ہر طرح سے مطالعہ کیا اور پھر تین بڑے مکاتیب کا مطالعہ ہمارے سامنے پیش کیا۔ جہاں تک اُردو تھیٹر کے ابتدائی خدوخال کا تعلق ہے تین بنیادی مکاتیب یا اسالیب ہمارے سامنے آتے ہیں' امانت لکھنوی کی ''اندر سبھا'' آغا حشر کے ڈرامے اور امتیاز علی تاج کا ڈرامہ ''انار کلی''۔ اتفاق کہیے کہ جب گورنمنٹ کالج لاہور میں 1986ء میں مجھے سید معین الرحمٰن نے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع دیا تو اگلے ہی سال مجھے فکشن کا پرچہ دے دیا۔ اس لیئے کہ میرے ڈرامہ سیریلز پی ٹی وی سے شروع ہو چکے تھے۔ اس کے بعد میں نے دو دہائیوں تک ''اندر سبھا'' ''انار کلی'' ''رستم وسہراب'' ''سفید خون'' پڑھایا۔ ''اندر سبھا'' اور ''انار کلی'' کا ڈرامہ تو پڑھنے کے بعد آپ اپنی تنقیدی سوچ بھی بروئے کار لا سکتے ہیں اور یہ دونوں ایسے ڈرامے ہیں جو ہندوستانی تاریخ ، تہذیب اور ثقافتی مزاج کی تفہیم کے لیئے کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ میری مدد سید وقار عظیم کے مقالات نے کی کہ اُنہوں نے ان ڈراموں کے متن کی جس طرح تشریح کی اور اُس میں شامل مختلف فنون کی جس طرح نشاندہی کی وہ کسی نقاد کا منصب نہیں ہے۔ وہ ایک تاریخ دان، ایک محقق اور ایک داستان گو کا مقام ہے۔ ایسا سید وقار عظیم

کے بعد صرف ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو یہ مقام و مرتبہ نصیب ہوا ہے۔ میرا تعلق چونکہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے پچیس سال سے ہے اس لیئے میں جانتا ہوں کہ میرے محسن سید وقار عظیم کی روایت کا نارنگ صاحب تک آنا بھی محض اتفاق نہیں ہے۔

میں نے ’’اندر سبھا‘‘ کو سمجھا، اور ’’انارکلی‘‘ کے بطون میں چھپے ڈرامائی اسرار کو بھی سمجھا اس طرح طلبا، کی تشفی بھی کی اور اپنے ذوق کی تسکین بھی کی۔ سید صاحب نے ’’اندر سبھا‘‘ کو لکھنو کے تناظر میں نوابوں کے کلچر میں دیکھا اور عوام کے ذوق کی تسکین کے لیئے واجد علی شاہ کی اس کاوش کو تکنیکی سطح پر اس طرح پیش کیا۔

’’اندر سبھا‘‘ کا مطالعہ ہمیں فن کی حیثیت سے اس سے آگے نہیں لے جاتا۔ وہ اسٹیج کی ظاہری صورت کا کوئی واضح تصور قائم کرنے میں ہماری کوئی رہنمائی نہیں کرتا۔ زمان و مکان کے وقفوں کی پیچیدگیوں کو حل کرنے کے بجائے وہ انہیں اور اُلجھا دیتا ہے۔ کرداروں کے لباس اور وضع قطع کے بارے میں بھی اس میں صرف مبہم اشارے ہیں۔ اور اس لیئے ’’اندر سبھا‘‘ کو اُردو کے اسٹیج ڈرامے کی روایت کا پہلا غیر فانی نقش کہنے والا شاعرانہ مبالغے کا مجرم ٹھہرتا ہے۔‘‘

’’اندر سبھا‘‘ پر یہ تنقید سید وقار عظیم کی عالمانہ بصیرت کی دلیل بھی ہے اور ڈرامے کے فن پر دسترس کا ثبوت بھی۔ ’’اندر سبھا‘‘ کی تخلیق کا پس منظر بے حد واضح تھا کہ واجد علی شاہ کو اپنی رعایا کے لیئے بالکل ایسی ہی تفریح چاہیئے تھی جیسی لکھنؤ کے اُمراء، رؤسا اور اشرافیہ کو لکھنؤ کی تہذیب کے روح رواں بالا خانوں کے ذریعے حاصل ہوتی تھی۔ اُن کی خواہش تھی کہ بالا خانے تک تو رعایا یا متوسط طبقے کی رسائی ہو ہی نہیں سکتی تو کیوں نہ بالا خانے کو عوام کے درمیان لایا جاتا۔ اس لیئے ’’اندر سبھا‘‘ محض رقص، غزل گیت اور دیگر گائیکی اور رقص کے اسالیب پر مشتمل

CS CamScanner

ہے۔ کہانی نہ صرف برائے نام ہے بلکہ صرف ان تفریحی عناصر کو آپس میں جوڑنے کے لیئے پیدا کی گئی ہے۔ اسی لیئے سید وقار عظیم نے اس کی نشاندہی اس طرح کی ہے۔

> ''امانت کا مقصد یہ تھا کہ میں ایک ایسی مجلس آراستہ کروں جس سے اپنے عہد کے رہنے والے ہر شخص کے لیئے تفریح طبع کا سامان مہیا ہو۔ اس وقت کی جو تفریح تھی وہ گانا اور ناچ تھی۔ اس لیئے مختلف طرح کے گانے اور ناچ ہوتے تھے۔ متوسط طبقے کے لوگ بھی تھے، پڑھے لکھے لوگ بھی تھے، جنہیں اس زمانے کی ایک خاص طرح کی غزل پسند تھی۔ تو پریاں آتی ہیں۔ اُسی طرح کی غزل گاتی ہیں۔''

ڈرامے کے فن پر بحث کئی مضامین میں موجود ہے جس میں یک بابی ڈرامے اور کئی ایکٹ کے ڈراموں کے فن اور اُس کی پیچیدگیوں پر گہری نظر ڈالی گئی ہے۔ تماشائیوں کے جذبات و احساسات کا تعین مختلف زمانوں کے حساب سے کرتے ہوئے اُس وقت کے ڈرامے کی تاریخ میں جو رجحانات در آئے تھے ان کی بہتر نشان دہی کی ہے۔ سید صاحب کے بقول ڈرامہ جیسا بھی ہوگا وہ دیکھنے والے کے ذوق کی نشان دہی بھی کرے گا کہ ڈرامہ تماشائی کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ جب میں تھیٹر کے طلبا سے سوال کرتا ہوں کہ تھیٹر کے لیئے سب سے اہم جز کون سا ہوتا ہے تو کوئی کہتا ہے سکرپٹ، کوئی کہتا ہے اسٹیج، کوئی کہتا ہے ایکٹر، کوئی کہتا ہے لائٹ، کوئی کہتا ہے ڈائریکٹر۔ میں کہتا ہوں یہ سب جواب غلط ہیں تو طلبا میرا منہ تکتے ہیں۔ جب میں کہتا ہوں تھیٹر کے لیئے سب سے زیادہ ضروری تماشائی ہوتے ہیں تو وہ سکھ کا سانس لیتے ہیں۔ سمجھ جاتے ہیں کہ تماشائی نہ ہو تو تھیٹر ہو ہی نہیں سکتا۔ اسٹیج نہ بھی ہو، سکرپٹ نہ بھی ہو، ڈائریکٹر نہ بھی ہو، تب بھی تھیٹر ہو سکتا ہے۔ اُسے صرف تماشائی چاہئیں۔ اس بات کو سید وقار عظیم نے اس طرح بیان کیا ہے:

''اسٹیج اور ایکٹر کے علاوہ بعض اور چیزیں بھی ہیں جنہوں نے ہمیشہ ڈرامے کے فن کو مختلف حیثیتوں سے متاثر کیا ہے۔ لیکن اثر انگیزی کے اعتبار سے جو نمایاں درجہ ڈرامے کے تماشائیوں کو حاصل ہے وہ کسی اور چیز کو حاصل نہیں۔ اس لیئے کہ ڈراما نگار حقیقت میں ڈراما انہی تماشائیوں کو محظوظ اور متاثر کرنے کے لیئے لکھتا ہے۔''

''اندر سبھا'' کے ساتھ ہی امتیاز علی تاج کا ''انارکلی'' اور آغا حشر کے ڈرامے اُردو ادب کی تدریس میں تو اہمیت کے حامل تھے ہی۔ اسٹیج کی تاریخ میں بھی ان کا حوالہ بے حد اہم ہے۔ یہ تین ایسے سنگِ میل ہیں جن کو چھوئے بغیر ہم جدید ڈرامے تک نہیں پہنچ سکتے۔ سید وقار عظیم نے ان تینوں ڈرامہ نگاروں کو معروضی اور تاریخی تناظر میں پہلی بار تخلیقی تجزیے کے ذریعے نقادوں اور ادب کے طالب علموں کی تفہیم کا فرض ادا کیا۔ امتیاز علی تاج کا ''انارکلی'' 1922ء میں لکھا گیا شائع بعد میں ہوا اور وہ اب تک ڈرامے کا معتبر حوالہ سمجھا جاتا ہے۔ اس حوالے سے سید وقار عظیم نے ایک لیکچر فیصل آباد میں دیا تھا۔ جسے ریکارڈ کر کے ان کی ''اُردو ڈراما فن اور منزلیں'' کتاب میں شائع کیا گیا ہے۔ سید صاحب کا طلبا، اور اساتذہ کو سمجھانے کا جو سلیقہ وقرینہ اور فکری تسلسل اس کے ذریعے ہمیں ملتا ہے۔ وہ اُن کے بعد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے حصے میں آیا۔

سید وقار عظیم نے کتنے اسٹیج ڈرامے دیکھے ہوں گے۔ ہم تصور کر سکتے ہیں کہ لاہور میں تھیٹر کی جو صورتِ حال تھی وہ سید صاحب کو اپنی طرف راغب نہیں کر سکتی تھی۔ پھر بھی جو پڑھے لکھے تعلیم یافتہ لوگ تھیٹر سے وابستہ ہوئے ان میں انور سجاد، کمال احمد رضوی، نعیم طاہر، صوفی گلزار اُن کے بھائی اور پھر بات سرمد صہبائی تک آ سکتی ہے۔ تو میرے حساب سے وقار عظیم صاحب کو زیادہ تھیٹر دیکھنے کے مواقع نہیں ملے ہوں گے ان کا اس فن

پرمحاکمہ اتنا مکمل اور جامع ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ کچھ تو ان کا مطالعہ اور کچھ ڈرامے کی صنف اور فن سے دلچسپی نے اِنہیں ایسے جامع فکری اور تکنیکی تجزیوں کا مالک بنایا کہ آج برصغیر میں ڈرامے کے فن پر سید وقار عظیم سے رجوع کیئے بغیر کوئی تحقیقی کام مکمل نہیں کہلا سکتا۔

وہ بلاشبہ فکشن یعنی افسانوی ادب کے ایک بڑے نقاد اور تجزیہ نگار ہیں اور اُردو ادب کی تاریخ میں اس وجہ سے منفرد پہچان کے مالک ہیں۔

> ''وقار عظیم، فکشن کے نقاد کی حیثیت سے ہندوستان اور پاکستان میں احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ اُن کی شہرت کی ابتداء ان کی پہلی کتاب ''اُردو افسانہ'' سے ہوئی۔ پاکستان سے ان کی دو خاص کتابیں ''داستان سے افسانے تک'' اور ''ہماری داستانیں'' شائع ہوئیں۔ اس طرح وہ پہلے ادیب تھے جنہیں اُردو نثر کا پہلا نقاد کہنا چاہیئے۔ افسانے اور ناول پر تو متعدد حضرات لکھتے رہے ہیں لیکن وہ پاکستان کے واحد ادیب تھے جنہوں نے داستانوں پر بھی توجہ صرف کی اس اعتبار سے وہ امتیاز رکھتے ہیں کہ داستانوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے ناول اور افسانے پر بھی کام کیا اور اُردو فکشن کے بارے میں ایک جامع تنقیدی نظر پیدا کی۔ اسی جامعیت کی وجہ سے اُردو فکشن کے نقاد کی حیثیت سے ہندوستان اور پاکستان میں ان کا مدتوں کوئی ثانی نہیں رہا۔
>
> وہ ناپ تول کر لکھنے والوں میں تھے۔ وہ تو چلے گئے اُن کی تحریریں موجود ہیں جو اُن کی یاد کو زندہ رکھیں گی۔''
>
> پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

CS CamScanner

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

حیاتِ وقار کے دو ثروت مند عشرے

ڈاکٹر زاہد منیر عامر

پروفیسر سیّد وقار عظیم صاحب کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے راقم کی یادوں کے سرمائے پر ایف سی کالج نے دستک دی اور ایف سی کالج کے ریورنڈ آر ایم یوینگ کی ایک تحریر یاد آئی جس میں انہوں نے ایک یونیورسٹی اُستاد کی صفات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:[1]

Academic qualifications should not be the only criteria.Characters, personality,congeniality of temperament, adaptability are much more important.

ان سطروں میں ایک زندہ حقیقت مستور ہے۔ یونیورسٹیوں میں تقرر کرنے والے اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھیں تو جامعات کی زندگی کا ماحول تبدیل ہو سکتا ہے اور جامعات کی زندگی کے ماحول کی تبدیلی کا مطلب پورے معاشرے کے ماحول کی تبدیلی ہے۔ کبھی کبھی اتفاق سے جب اس پر عمل ہو جاتا ہے تو اس حسنِ عمل کے نتائج بھی مدتوں اپنے مؤثرات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کی تاریخ میں سیّد وقار عظیم صاحب کا شعبۂ اُردو سے انسلاک بھی ایک ایسا ہی تقرر تھا۔

---

[1] Report Punjab University Commission 1950-52 Page 101، بحوالہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، صد سالہ تاریخ جامعہ پنجاب لاہور: جامعہ پنجاب لاہور، پاکستان 1982ء، ص 256

CS CamScanner

راقم نے اورینٹل کالج سے پروفیسر سیّد وقار عظیم کے انسلاک کی تاریخ جاننا چاہی تو ڈاکٹر وحید قریشی کی ضخیم تالیف ”یونیورسٹی اورینٹل کالج کے اساتذہ کا تحقیقی ادبی اور درسی سرمایہ“ سے رجوع کیا۔ اس کتاب میں سیّد صاحب کے بہ طور لیکچرر شعبہ اُردو سے وابستہ ہونے کی تاریخ 1955ء اور بہ طور ریڈر تقرر کی تاریخ 1965ء لکھی ہے۔[1]

اورینٹل کالج کے شعبہ اُردو کا آغاز یوں تو 1928ء میں ہوا لیکن اس وقت تک یہ ایک تحقیقی شعبہ تھا اور اگلے بیس برس تک اس کی یہی شناخت رہی تا آنکہ 1948ء میں اس شعبے میں ایم اے اُردو کی تدریس کا آغاز ہوا اور اس کی زمام ڈاکٹر سیّد عبداللہ مرحوم نے سنبھالی۔ اس شعبے کے آغاز کے دو برس بعد سیّد وقار عظیم صاحب اس سے بہ طور لیکچرر وابستہ ہوئے یہ سنہ پچاس کی بات ہے نہ کہ پچپن کی۔ اورینٹل کالج سے ان کی وابستگی کی درست تاریخ جاننے کے لیے یونیورسٹی کی تاریخ کے ایک اور ماخذ ”زندگی نامہ“ سے رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ اس ماخذ میں اورینٹل کالج سے ان کی وابستگی کا مہینہ اور سال فروری 1950ء درج ہے۔[2] دن کے تعین میں تاریخ یونیورسٹی اورینٹل کالج نے مدد کی جس کے مطابق سیّد صاحب سینئر لیکچرر اُردو کی حیثیت سے 3 فروری 1950ء کو شعبہ اُردو سے وابستہ ہوئے[3] یہی تاریخ بعد ازاں خود ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی مرتبہ اساتذہ اور ریسرچ سکالروں کی فہرست میں بھی درج ہے، جس میں اساتذۂ شعبہ اُردو کے ضمن میں سیّد صاحب کے نام کے تحت ”3 فروری 1950ء تا حال“ مرقوم ہے۔[4]

---

[1] ڈاکٹر وحید قریشی (مرتب) لاہور: یادگار جشن صدمین سال تاسیس دانشکدہ خاورشناسی دانشگاہ پنجاب 1970 میلادی ص 248

[2] ڈاکٹر عبدالشکور احسن (مرتب) زندگی نامہ لاہور: ادارۂ تحقیقات پاکستان دانشگاہ پنجاب 1983ء ص 166

[3] ڈاکٹر غلام حسین تاریخ یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور: اورینٹل کالج 1962ء ص 223

[4] ڈاکٹر وحید قریشی (مرتب) لاہور: یادگار جشن صدمین سال تاسیس دانشکدہ خاورشناسی دانشگاہ پنجاب 1970 میلادی ص 17

اورینٹل کالج سے سید صاحب کی وابستگی ان کی زندگی میں ایک اہم موڑ کی حیثیت اختیار کر گئی اگرچہ اس سے پہلے بھی وہ جامعاتی سطح پر تدریس کا تجربہ رکھتے تھے اور 1937ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بہ طور لیکچرر اُردو اپنے کیریر کا آغاز کر چکے تھے۔ 1938ء سے 1942ء تک جامعہ ملیہ دہلی میں بھی تدریسی فرائض انجام دے چکے تھے۔ 1942 سے 1946ء کے زمانے میں دہلی پولی ٹیکنیک میں بھی پڑھا چکے تھے لیکن یونیورسٹی اورینٹل کالج سے ان کی وابستگی ان کی زندگی کا طویل ترین تدریسی تجربہ بن گئی اور یہاں آنے کے بعد انہوں نے صرف شعبہ اُردو ہی میں خدمات انجام نہیں دیں بلکہ یونیورسٹی کے بعض دوسرے اداروں نے بھی ان کی خدمات سے استفادہ کیا۔

وہ شعبے میں لیکچرر کی حیثیت سے 3 فروری 1950ء کو آئے تھے انہیں ستمبر 1965ء میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کی خالی نشست پر عارضی ریڈر مقرر کیا گیا اور پھر ریڈر کی دو مزید اسامیاں تخلیق کر کے ایک پر انہیں مستقل کر دیا گیا[1] شعبہ اُردو سے ڈاکٹر سید عبداللہ کی حادثاتی رخصتی اور پھر 1966ء میں ان کے پروفیسر ایمریطس بنائے جانے کے بعد سید وقار عظیم شعبہ اُردو کے قائم مقام صدر بھی بنا دیے گئے۔ ایک نسبتاً کم اہم بلکہ کمزور ماخذ مظہر ہے کہ انہیں ستمبر 1963ء میں ایسوسی ایٹ پروفیسر بنایا گیا۔ اس منصب پر وہ جنوری 1969ء تک فائز رہے یہاں تک کہ جنوری 1969ء میں غالب پروفیسر کا منصب تخلیق کیے جانے پر ان کا تقرر اس پر ہو گیا اور وہ 30 ستمبر 1970 تک غالب پروفیسر آف اُردو کی حیثیت سے اورینٹل کالج سے وابستہ رہے[2]

---

[1] صد سالہ تاریخ جامعہ پنجاب ص359

[2] پروفیسر ڈاکٹر نسرین اختر تاریخ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور 1963تا2001، لاہور: سنگت پبلشرز 2006، ص170

یہ وضاحت بھی کر دینی چاہیے کہ اس زمانے میں ریڈر کا منصب ایسوسی ایٹ پروفیسر کے برابر ہوتا تھا۔

شعبہ اُردو کی تدریس اور سربراہی کے زمانے میں وہ ایک مقبول اُستاد تھے اس بات کا اندازہ ان کے اس زمانے کے شاگردوں کے تاثرات سے کیا جا سکتا ہے جو وہ مختلف مواقع پر ظاہر کرتے رہے ہیں۔ سیّد وقار عظیم صاحب کی زندگی کا یہ زمانہ ان کی علمی زندگی کا بھرپور دور ثابت ہوا انہوں نے جہاں شعبہ اُردو میں بہ طور اُستاد اور صدر شعبہ خدمات انجام دیں وہاں وہ یونیورسٹی کے بعض دوسرے اداروں سے بھی وابستہ رہے۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ جب پاکستان میں ذریعہ تعلیم کو اُردو بنانے کی بحث شروع ہوئی تو اس کی تان اس بات پر ٹوٹی کہ پنجاب یونیورسٹی میں تالیف و ترجمہ کا ایک ادارہ قائم کیا جائے۔ یہ تجویز پروفیسر حمید احمد خان صاحب کی تھی، جو انہوں نے اس وقت کے وائس چانسلر شیخ محمد شریف کے نام ایک خط کی صورت میں پیش کی تھی۔ وائس چانسلر نے یہ تجویز سنڈیکیٹ میں رکھ دی اور سنڈیکیٹ نے اس مسئلے پر جسٹس ایس اے رحمٰن میاں بشیر احمد، ڈاکٹر رفیق احمد خان، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا غلام رسول مہر، مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر نیاز احمد، ڈاکٹر نذیر احمد پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کر دی جس کا کنوینر پروفیسر حمید احمد خان کو بنایا گیا۔ اس کمیٹی کی سفارش پر دسمبر 1962ء میں ادارہ تالیف و ترجمہ کا قیام عمل میں آیا اور پروفیسر سید وقار عظیم اس کے اوّلین مہتمم قرار پائے۔ یہ ایک مستحسن فیصلہ تھا۔ اپنی زندگی کے اس ابتدائی دور میں ادارے نے مختلف علوم کی اصطلاحات سازی کو اپنا نصب العین قرار دیا اور متعلقہ علوم کے اساتذہ و علما کے تعاون سے ان علوم کی فنی اصطلاحات کو اُردو میں منتقل کرنے کا کام شروع کیا گیا جن میں ابتدائی طور پر معاشیات،

نفسیات، اطلاقی نفسیات اور سیاسیات وغیرہ شامل تھے۔ پروفیسر سید وقار عظیم 31 دسمبر 1970ء تک اس ادارے کے مہتمم رہے، جب وہ اپنی مدت ملازمت پوری کر کے یونیورسٹی سے سبکدوش ہو گئے اور ان کی سبکدوشی پر یہ منصب ڈاکٹر سید عبداللہ کے حصے میں آیا۔

اورینٹل کالج میں آنے کے بعد تدریسی خدمات کے علاوہ پروفیسر وقار عظیم صاحب کی ایک اور خدمت تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند کی ادارت میں شمولیت ہے۔ یہ منصوبہ پروفیسر حمید احمد خان کی صدارت اور گروپ کیپٹن سید فیاض محمود کی ادارت میں اکتوبر 1964ء میں شروع ہوا۔ اس منصوبے کو چودہ جلدوں میں مکمل کیا جانا طے پایا۔ سید وقار عظیم اس منصوبے کی ساتویں جلد کے مدیر خصوصی مقرر ہوئے۔ ساتویں جلد، اُردو ادب کی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ اُردو ادب کی تاریخ پانچ جلدوں پر مشتمل تھی۔ تاریخ ادبیات کے مکمل شمار میں ساتویں جلد اُردو ادب کی دوسری جلد ہے جو 1707ء سے 1803ء تک کے زمانے کا احاطہ کرتی ہے اور مدیر خصوصی سید وقار عظیم کی ادارت میں شائع ہوئی۔ [1] اس جلد کا پیش لفظ سابقہ مجلدات کی طرح وائس چانسلر پروفیسر علاء الدین صدیقی صاحب کا ہے جب کہ تعارف مدیر عمومی نے لکھا ہے۔ مدیر عمومی گروپ کیپٹن سید فیاض محمود تھے۔ کتاب میں ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، الف۔ د۔ نسیم، غلام حسین ذوالفقار، سید عبداللہ، وحید قریشی، افتخار احمد صدیقی، مجید یزدانی، ابواللیث صدیقی، مشرف علی انصاری، محمد زبیر منگلوری، محمد صادق اور سید عابد علی عابد کے مقالات شامل تھے۔ دور حاضر میں تاریخ ادبیات کے منصوبے کا احیا ہوا اور اُردو ادب کی مجلدات کی

---

[1] تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند اردو ادب (جلد دوم) 1707ء تا 1803ء، پنجاب یونیورسٹی لاہور مدیر عمومی پروفیسر خواجہ محمد زکریا 2009ء

اشاعت نو ہوئی۔ چنانچہ اس عمل میں اُردو ادب کی دوسری جلد بھی جو اصل منصوبے کی ترتیب میں ساتویں جلد تھی دوبارہ شائع ہوئی ہے۔ بہ اعتبار مواد کتاب وہی ہے جو پہلے تھی وہی مقالے اور وہی مقالہ نگار۔ ابواب کی ترتیب میں جزوی تبدیلی کی گئی ہے، عبارات کو مختصر کیا گیا ہے اور بعض ابواب و مندرجات حذف کر دیے گئے ہیں۔ پہلی جلد کے سرورق پر سیّد وقار عظیم صاحب کا نام مندرج تھا اب اسے پرنٹ لائن میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ [1] تاریخ ادبیات کے علاوہ سیّد صاحب نے پنجاب یونیورسٹی کے سب سے بڑے علمی منصوبے اُردو دائرہ معارف اسلامیہ کے لیے بھی مقالات لکھے لیکن جس منصب کو ان کی علمی زندگی کا سب سے بڑا اعزاز کہنا چاہیے وہ ان کا مسند غالب پر تقرر تھا۔

جنوری 1969ء میں ڈاکٹر آفتاب احمد خان نے اس بات کی تحریک کی کہ 1969ء میں مرزا غالب کی صد سالہ برسی شایان شان طریقے سے منائی جائے جس کے نتیجے میں پنجاب یونیورسٹی میں مجلس یادگار غالب کا قیام عمل میں آیا۔ اس وقت کے وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خان اس مجلس کے صدر مقرر ہوئے۔ ارکان میں دوسرے علما کے ساتھ سیّد وقار عظیم صاحب کا نام بھی شامل تھا۔ اس مجلس کے تحت مرزا غالب کی جملہ تصانیف نظم و نثر اُردو و فارسی کو مرتب کر کے از سر نو شائع کیا گیا اور پنجاب یونیورسٹی میں مسندِ غالب Ghalib Chair قائم کی گئی۔ مجلس یادگار غالب کی جانب سے شائع ہونے والی غالب مطبوعات کے آغاز میں شامل مشترک پیش لفظ میں نئے وائس چانسلر

---

[1] تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ساتویں جلد اردو ادب (دوم) (1707ء تا 1803ء)، مدیر خصوصی سیّد وقار عظیم لاہور: پنجاب یونی ورسٹی لاہور 1971ء

CS CamScanner

پروفیسر علاء الدین صدیقی نے لکھا کہ:

''یونیورسٹی کے ایک اور فیصلے کی رو سے شعبہ اُردو میں کرسی غالب قائم ہوئی۔ میں مسرت کے ساتھ اعلان کر رہا ہوں کہ اس اسامی پر پروفیسر سیّد وقار عظیم کا تقرر کیا جا چکا۔''[1]

یہ ایک بڑا اعزاز تھا جو پروفیسر سیّد وقار عظیم صاحب کو حاصل ہوا، اس سے جہاں غالب سے ان کے شغف کا اعتراف ہوا وہاں علمی دنیا میں خود ان کے لیے پائے جانے والے احترام کا بھی اظہار ہوا۔ غالب سے سیّد وقار عظیم کی دلچسپی کا اظہار 1933ء سے ہو رہا تھا جب انہوں نے غالب پر اپنا پہلا مقالہ لکھا اس وقت وہ بی۔ اے کے طالب علم تھے۔ ان کا یہ مقالہ ''غالب کے خطوط اور ان کی احباب پرستی'' کے عنوان سے رسالہ ساقی میں شائع ہوا تھا[2] اس کے بعد ان کے قلم سے غالبیات کے سلسلے میں جو تحریریں نکلیں ان میں ''غالب کی غزلوں میں قیس و فرہاد کا تصور''[3] ''غالب...... خطوں کی روشنی میں''[4] ''غالب اپنے معاصرین کی نظر میں''[5]، ''غالب کی صد سالہ برسی کیوں''[6] شامل ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ تبصرے اور تاثرات بھی ان کے قلم سے نکلے جن میں غالب اپنے شارحین کی مجلس میں[7]

---

[1] میرزا اسد اللہ غالب دیوان غالب، تحقیق متن وترتیب حامد علی خان لاہور: مطبوعات مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی 1969ء ص (7) یہ دیباچہ مجلس یادگار غالب کی تمام مطبوعات میں شامل ہے

[2] دہلی جنوری 1934ء

[3] مجلہ تحقیق (فنون پنجاب یونیورسٹی لاہور 1969ء

[4] اوراق لاہور جنوری 1967ء

[5] داستان لاہور 1969ء

[6] اوراق لاہور اپریل 1969ء

[7] الحمرا لاہور فروری 1954ء

اور غالب اپنے شاگردوں کی مجلس میں[1] قابل ذکر ہیں۔ غالب مطبوعات میں ایک کتاب کی بنیاد غالب کے بارے میں مختلف علما کے ذاتی تاثرات پر رکھی گئی تھی اس کتاب میں بھی سید وقار عظیم صاحب کے تاثرات شامل تھے جس میں انہوں نے اپنے دورِ طالب علمی میں غالب کے ساتھ قائم ہو جانے والے تعلق کی نشاندہی کی اور لکھا کہ ''غالب مجھے سب شاروں اور شاعروں سے زیادہ عزیز ہے کہ مجھ میں جو تھوڑا بہت تنقیدی شعور ہے وہ اسی کا عطا کیا ہوا ہے۔ اتفاقات اور حادثات نے غالب کو مجھ سے چھین لیا کس سے کہوں کہ یہ غم میری زندگی کا کتنا بڑا غم ہے۔''[2]

غالب سے ان کا یہی تعلق ان کے مسند غالب پر تقرر کی بنیاد بنا، یوں کہا جا سکتا ہے کہ اورینٹل کالج میں آنے کے بعد انہوں نے صرف تدریسی فرائض ہی انجام نہیں دیے بلکہ تاریخ ادبیات، دائرۂ معارف اسلامیہ، ادارہ تالیف و ترجمہ، مسند غالب سے متعلق ذمہ داریاں بھی انجام دیں۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اورینٹل کالج میں آنا سید وقار عظیم صاحب کی زندگی کا ایک انقلاب آفریں واقعہ ثابت ہوا۔ ان اکیس سالوں میں جہاں انہوں نے خود مسلسل کام کیا وہاں دوسروں کو بھی کاموں میں لگایا یوں ان کی عمر عزیز کے یہ دو عشرے علم و ادب کی دنیا میں گوناگوں ثروتمندی کا باعث بنے۔

---

[1] العصر لاہور فروری 1956ء

[2] عبدالشکور احسن، سجاد باقر (مرتبین) غالب ذاتی تاثرات کے آئینے میں لاہور، مطبوعات مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی 1959ء ص100

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

سید وقار عظیم بحیثیت نقاد

ریاض صدیقی

حالی اور ترقی پسند تحریک کے ہمہ گیر تموج نے تخلیقی اور تعمیری جینیس کی نشو ونما کے لیے جو فضا تیار کی تھی اس کے زیر اثر ہماری علمی و ادبی اور تہذیبی دنیا شعور و آگہی اور دروں بینی کے اطراف و آفاق کی مظہریت سے مانوس ہوئی۔ بیسویں صدی کی تاریخ اسی سچائی کے اعتراف سے عبارت ہے۔ تنقیدی روایت کی نمو پذیری نے شعور و آگہی کی متحرک رو پیدا کی اور اس رو کے تحرک نے تخلیقی ادب کے متون۔ اس کی فنی صورت اور تکنیکی تنظیم میں نہ صرف تنوع اور گیرائی کو راہ دی۔ بلکہ سائنسی منطق اور دلائل کے برمحل استعمال سے قدیم افلاطونی کلاسکیت۔ عہد رینائساں کی مابعد الطبیعاتی خیال آفرینی اور جدید لایعنی میلانات کے زہر کا تریاق بھی مہیا کرتی رہی۔ حالی صرف تنقید ہی کے نہیں بلکہ صنفی تنقید کے بھی معلم اول ہیں۔ ان کی قوتِ تسخیر نے جس روایت کی بنیاد ڈالی تھی ترقی پسند عہد میں سید احتشام حسین، ڈاکٹر اختر حسین، رائے پوری، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، پروفیسر ممتاز حسین اور سید وقار عظیم نے اس کے نامیاتی اور معنی آفریں کینوس کو وسیع تر تناظر میں تبدیل کر دیا۔ سید وقار عظیم اسی قبیلے کے ایک معتبر، صاحب الرائے اور اعتدال پسند نقاد ہیں۔

وہ ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم سنگِ میل ہیں جو سدا ادبی راہ پیاؤں کی رہنمائی کریں گے۔ ان کی انفرادیت یوں بھی مسلّم ہے کہ اُنہوں نے صنفی تنقید

کو ایک مکمل اور منظم صورت بخشنے کی کامیاب مثال اس وقت قائم کی جب ہمارے علمائے تنقید نثری مسائل و موضوعات سے دامن کشاں محض شعری مسائل و معاملات پر توجہ دے رہے تھے۔ چنانچہ تنقید کے حوالے سے یہی غالب رجحان نسل در نسل یوں منتقل ہوتا رہا کہ شاعری اور شاعرؔ تنقید کا مقصدِ منتہا بن کر رہ گئے۔ سید وقار عظیم نے روز اول ہی سے تنقیدی رجحان کی اس تنگ دامانی کو محسوس کر لیا۔ چنانچہ اُنہوں نے تخلیقی نثر جیسی ہمہ گیر صنف، یعنی قصہ گوئی کی تاریخ، اس کے ارتقائی مدارج اور تکنیکی تقسیم کا انتخاب کر کے اپنے لیے ایک پائیدار موضوع تلاش کیا اور اس قلمرو میں اول و آخر ایک سند بن گئے۔ یقیناً اگر مرحوم قصہ گوئی کی صنف پر ایسی مکمل گرفت قائم نہ کرتے تو ادب کا یہ فعال شعبہ جو کمیت و اثرات کے اعتبار سے ایک بنیادی شعبہ ہے اور روز افزوں پھیلاؤ کے باوجود دائرہ تنقید کی گرفت سے تقریباً آزاد نشوونما پا رہا تھا۔ ہنوز کسی صاحبِ نظر کا منتظر ہوتا۔ سید وقار عظیم نے جس وقت اُردو افسانے اور ناول کی تنقید کا آغاز کیا۔ اس زمانے میں افسانہ و ناول نے داستان گوئی کی تاریخ سے راستہ کاٹ کر اپنے سفر کا آغاز کیا تھا اور بتدریج پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ خارجی و باطنی گہرائیوں میں فرانسیسی اور انگریزی کے اثرات کو سمیٹ رہا تھا۔ غالباً اسی مقداریت اور متعدد سمتی وسعت کی تہہ در تہہ میکانیت کا بار تھا کہ درجہ اول کے ناقدین اس کوچے سے سرسری گزر جانے پر اکتفا کرتے رہے۔ سید وقار عظیم اس خلا میں اُترے اور فکشن کی تاریخ کے حوالے سے معنوی جزویات اور ان جزویات کے اثرات و عوامل کو فن، تکنیک، اور بین الاقوامی رشتوں کے ممکنہ محرکات کی بحث سے دریافت کیا۔ اس مہم کو سرانجام

CS CamScanner

دینے کی خاطر انہوں نے مغربی فکشن کے فن اور اس کی عہد بہ عہد تاریخ وتنقید کا احاطہ کیا اور اپنے تنقیدی مواد کو اناطول فرانس، آرنلڈ بینٹ، اسکاٹ، ڈوما، لٹن، والٹر پیٹر، ہارڈی، ورجینا وولف، اسٹیونس، شیفرڈ، تھیکرے، موپساں، چیخوف اور نیل ہاتھرون وغیرہ کے حوالوں سے معتبر اور جامع صورت میں پیش کیا اور اس طرح مجموعی مطالعہ کے تانے بانے میں تنقید کے تجزیاتی اور تحلیلی عمل کو راہ دے کر صورت اور مواد کو عصری حسیت اور معاشرتی روابط کا تابع بنایا۔ فکشن کی تاریخ وتنقید پر ان کے مجموعی کام کا دائرہ کار اکاڈمی یا ادارے کی حدود سے کسی طرح کم نہیں شمار ہوگا۔ سید وقار عظیم نے بلاشبہ تخلیقی نثر کے اس جز کو محض تبصرہ آرائی اور تاریخ بیانی تک محدود نہیں رکھا۔ افسانہ کیا ہے، کن مراحل سے چل کر اس نے جدید قالب پایا ہے۔ اس کی فنی جزئیات کیا ہیں؟ افسانوں اور ناول کا انسانی سماج سے کیا رشتہ ہے؟ ان سوالوں کے متعین جوابات سب سے پہلے وقار عظیم کی تصنیف ''فن افسانہ نگاری'' میں سامنے آئے۔ اس تصنیف کا دامن تنقیدی بصیرت اور موضوع پر عالمانہ مہارت سے خالی نہیں۔ اس حقیقت کا پرتو ان اقتباسات میں نمایاں ہے۔

> ''مختصر افسانہ کی منطقی تعریف بھی اتنی ہی دشوار ہے کہ اسے آسانی سے غیر ممکن کہا جاسکتا ہے اور اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ وہ مختلف ادبی اصناف کی ایک مجموعی فنی شکل ہے۔''

سید وقار عظیم نے ایڈگر ایلن پو، ایلش ون اور دوسرے مغربی ماہرین فن کی متعین کردہ تعریفات پر تنقیدی بحث کو سمیٹتے ہوئے افسانے کی تعریف کا تعین ان الفاظ میں کیا:

”مختصر افسانہ ایک ایسی مختصر فکری داستان ہے جس میں کسی ایک خاص واقعہ کسی ایک خاص کردار پر روشنی ڈالی گئی ہو۔ اس میں پلاٹ ہو اور اسی پلاٹ کے واقعات کی تفصیلیں اس طرح گتھی ہوئی اور اس کا بیان اس قدر منظم ہو کہ وہ ایک متحد اثر پیدا کر سکے۔“

مختلف تکنیکی مباحث سے گزر کر وہ افسانے کی تنقید تک پہنچتے ہیں:

”ہم اپنے افسانوں کو کبھی پسندیدہ نہیں خیال کر سکتے اگر وہ ہماری فطرت کی کسی نہ کسی حقیقت پر مبنی نہیں ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جس بات کا بے حد خیال رکھنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اس حقیقت کو فن کا پابند ہونا چاہیے۔ اسے افسانے میں سائنٹفک نہیں بلکہ شاعرانہ اور افسانوی حقیقت بن کر رہنا پڑے گا۔“

جدید سائنسی تنقید تقابلی تکنیک کے وسیلے کو دریافتوں اور تعینات کے لیے استعمال کرتی ہے اور اتفاق سے ہمارے یہاں تقابلی تنقید ایک ضروری وسیلے کی حیثیت سے مروج نہیں رہی ہے۔ سید وقار عظیم نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے تقابلی تکنیک سے کام لیا ہے۔ اپنی اولین تصنیف ”فن افسانہ نگاری“ اور اس کے بعد والی تصانیف میں انھوں نے افسانہ و ناول اور ناول و ڈرامہ کے مابین مدلل تقابل سے کام لیا ہے۔ اسی تقابل کے نتیجہ میں انہوں نے اس حقیقت کا تعین کیا ہے کہ ”مختصر افسانہ ناول سے بھی بہت بعد کی چیز ہے۔“

سید وقار عظیم کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ”فن اور فن کار“ کے نام سے 1966ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعہ میں انہوں نے افسانہ اور ناول کے علاوہ کچھ نئے ہنگامی موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے۔ ”کہانی کی منطق“، ”کہانی اور اصلاح معاشرہ“، ”کہانی اور حسن بیان“، ”جمالیاتی تنقید“، ”مولوی عبدالحق کی سیرت نگاری“ اور

''ادب میں مشاہدے کی اہمیت'' فن تنقید کا شاہکار ہیں۔ کہانی کے تانے بانے میں جمالیاتی عناصر کی تحلیل کے جن امکانات کی نشان دہی ان کی اولین تصنیف میں ہوئی ہے۔ ''کہانی اور حسن بیان'' اسی بحث کی توسیع کرتا ہے۔ اسی حوالے سے وہ جمالیات اور مشاہدے جیسے متنازعہ مسائل کی ازسرنو تعبیر و توضیح تک پہنچے ہیں۔ ''کہانی اور حسن بیان'' میں لکھتے ہیں:

''بیان کا یہی حسن ہے جس نے لقمان اور سعدی کو، چیخوف اور ٹالسٹائی کو، فلابیر اور موپساں کو، گوئٹے، ڈاکنز اور جوائنز کو۔ میر امن اور نذیر احمد کو ہمیشہ کے لیے زندہ کیا ہے۔''

اسلوب یقیناً ایک سچائی کا نام ہے جس کے ترقی پسند بھی معترف ہیں اور اس مفروضے کو تسلیم کرتے ہیں کہ (Style is itself the man) انتظار حسین نے سچ لکھا ہے:

''جس طرح حالی کو شاعری کی تنقید میں اولیت کا درجہ حاصل ہے اسی طرح وقار عظیم کو افسانے کی تنقید میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔''

جمالیات اور مشاہدہ پر ان کی تنقیدی بحث ادبی اقدار کی ازسرنو دریافت کی طرف ایک اہم قدم ہے۔ اس مسئلہ پر وہ بعض انتہا پسند ترقی پسندوں سے متفق نہیں ہیں۔ جنہوں نے فن اور ہیئت کے بنیادی اثرات و عوامل کو سیاسی اور معاشی فلسفے کی بھینٹ چڑھا دیا۔ ردّ و قبول کی اس جذباتی رہ گزر میں وہ فن کی سماجی مقصدیت اور نامیاتی و مادی رشتوں کی صداقت کے اعتراف میں کبھی ابہام یا غیر یقینیت سے دوچار نہیں ہوئے۔ تاہم وہ جمالیاتی تاثر آفرینی، اسلوب کے حسن اور ہیئت کے اجزاء کو روح تخلیق کا مرتبہ دینے میں کسی حکمت عملی (Strategy) سے مرعوب بھی نہیں ہوئے۔ اپنے استدلال سے اُنہوں نے ادب اور جمالیات کے رشتوں کو دوبارہ تلاش کیا ہے اور اس احساس کو

فروغ دیا ہے کہ انسانی شعور کی ہر تہہ جمالیاتی حسیت کی رنگ آمیزی سے تخلیق پاتی ہے اور یوں جمالیات اور موضوعی مشاہدے کا تعلق گوشت و ناخن کے تعلق کی طرح انسانی سائیکی کا مسئلہ بن جاتی ہے۔ البتہ وہ مابعد الطبعیاتی طرز کی جمالیات جو ریڈ، فرائی، فرائیڈ، ژونگ اور برگساں اور کروچے کے فلسفوں مثلاً تخلیقیت اور Intuition) سے عبارت ہے تسلیم نہیں کرتے۔ جمالیات کے بارے میں ان کے تعینات قابل توجہ ہیں:

> ''حقیقی تنقید وہ ہے جو فن کو سمجھنے اور اس کی معنوی گہرائیوں میں جذب کردینے کے علاوہ اس سے حظ اُٹھانے میں بھی مدد دیتی ہے۔ فنی تخلیقات کو ہمیشگی کی سند اور دستاویز جمالیاتی تنقید ہی کے ہاتھوں ملتی ہے۔ کوئی تنقید جو محض مواد کی تنقید ہے اور مواد کی تنقید کرتے وقت اس بات کو پیشِ نظر نہیں رکھتی کہ مواد کس طرح پیش کیا گیا ہے۔ فنی تخلیق کو بہتر بنانے میں اس کی رہنمائی نہیں کرتی۔''

جمالیاتی تنقید کے معاملے میں سید وقار عظیم نے میتھیو آرنلڈ، مارکس اور مورس کا اتباع کیا ہے اور مجموعی اعتبار سے ان کا تنقیدی نقطۂ نظر آرنلڈ اور مارکس کے ادبی نظریات کا متوازن امتزاج ہے جس پر مقامی ماحول کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے۔ مسائل و موضوعات کی تنقید کے لیے بھی سید وقار عظیم نے ''ریختہ'' نما نثری اصناف ہی کو منتخب کیا۔ سرشار کے فن، نیاز کی ناول نگاری اور مولوی عبدالحق کی سیرت اور اقبال کے فکر و فن پر ان کی تنقیدی آرا اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ادب میں موضوعی مشاہدے اور جمالیات جیسے اہم عناصر سے ان کی وابستگی ہی نے اُنھیں ایک منفرد، اچھوتا اور دل نواز اسلوب دیا ہے اور بیانیہ نثر میں ان کے اسلوب بیان کی دل کشی شبلی نعمانی کے اسلوب کی یاد تازہ کرتی ہے۔

CS CamScanner

مثلاً یہ عبارت:

''انسانی زندگی سادگی کی جگہ رنگینی و پرکاری کی لذتوں سے آشنا ہوئی اور ہموار و بے خطر راستوں کی جگہ سنگلاخ و پر پیچ راہوں میں گم رہنے میں زیادہ مزے لینے لگی تو قصہ گو نے بھی حقیقت کی سادگی میں ہلکے ہلکے رنگ بھرنے شروع کیے۔ مشاہدے اور تجربے کی دکھائی ہوئی سیدھی ڈگر سے ہٹ کر تخیل کی بنائی ہوئی پگڈنڈیوں پر بھی چلنا شروع کر دیا۔''

نظریاتی و عملی تنقید کے جملہ مقاصد کا اُنہیں کس درجہ ادراک ہے اور کیسی مہارت سے انھوں نے حقیقی ترقی پسند فکر کو تنقیدی قلمرو میں اظہار کا موقع دیا ہے اس کا اندازہ ان جملوں سے کیا جا سکتا ہے:

''جن ادیبوں نے ماونو کی قلمی اعانت کی ہے وہ انسان کے مستقبل کی طرف سے مایوس نہیں ہیں۔ اُنہیں انسانیت کی فتح کا یقین ہے وہ محبت، اخوت اور انسانیت کو دنیا میں عام کرنے کے خواہش مند ہیں۔ ان کا جذبہ پُر امن، پُرسکون اور پُر مسرت مستقبل کی ضمانت ہے۔''

نیاز کے فن پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دونوں ناولچوں میں نیاز کا فن 'لذت کا فن ہے اور یوں فن' فکر کی سنجیدگی سے زیادہ تخیل کی رنگینی اور اضطراب و بے تابی کا فن بنتا ہے۔ یہ فن، ان عواقب سے بے خبر اور بے نیاز ہے جو انسان کی بربادی کا پیش خیمہ بنتے ہیں۔ دونوں ناولوں میں ایسے واقعات پیش آئے ہیں جو صرف خوابوں کی دنیا میں پیش آ سکتے ہیں۔''

رفیق خاور کی تصنیف پاکستان کے لوک گیت پر تبصرہ کرتے ہوئے بھی وہ

اپنے تنقیدی منصب کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور اپنے معاصر کے لیے لکھتے ہیں:

> ”مترنم بحر اور جذباتی تخیل ان گیتوں میں ہے۔ البتہ بعض اس حد تک ہلکے پھلکے ہو گئے ہیں کہ وہ کوئی سنجیدہ جذباتی فضا پیدا کرنے کے بجائے تھیٹر اور سینما کا ماحول پیدا کرتے ہیں۔“

سید وقار عظیم کو ان تمام موضوعات سے فطری مناسبت رہی ہے جو ناتسخیر (Unexplored) رہے ہیں۔ چنانچہ قیام پاکستان کے فوراً بعد 1948ء میں وہ پہلے پاکستانی ادیب و نقاد ہیں جنہوں نے سندھ کے مشہور شاعر شاہ لطیف پر باقاعدہ کام کیا ہے اور شاہ کے رسالو کے بعض غیر مطبوعہ نسخوں کی فہرست بھی قلم بند کی ہے۔ اس موضوع پر ان کے دو مفصل مضامین ”ماہِ نو“ اپریل و مئی 1948ء کے مندرجات میں شامل ہیں۔ تاریخ ادب میں اُن کا منصب انہی کے نام سے زندہ رہے گا کہ انہوں نے ناتسخیر موضوعات پر قلم اُٹھایا۔ اُن کی تاریخ ساز حیثیت کے استحکام کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ان کے جلائے ہوئے چراغ سے نئے چراغ روشن ہوئے اور نئی نسل کے بعض ذہنوں نے نثری اصناف پر تنقید کے سلسلے کو مزید آگے بڑھایا۔

سید وقار عظیم کے فن اور ان کے مقام کا تعین کرتے ہوئے احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

> ”اُردو تنقید میں سید وقار عظیم کا جو مقام ہے وہ سراسر اُن کا اپنا ہے اور مستقبل میں بھی یہ مقام انہی کا رہے گا۔ کیونکہ ان کے انداز و اسلوب سے مستقبل کے نقاد رہنمائی اور روشنی حاصل کرتے رہیں گے۔“

سید وقار عظیم کی تنقید سے ترقی پسند شعور کی معنویت کو اس وقت فروغ حاصل ہوا جب ترقی پسند تحریک کے خدوخال پوری طرح نمایاں بھی نہیں ہو سکے تھے اور ترقی پسند افسانوں کا پہلا مجموعہ ”انگارے“ منظر عام پر نہیں آیا تھا گویا ترقی پسند شعور کے دروازے پر

سید وقار عظیم نے سب سے پہلے دستک دی اور ترقی پسند افسانہ نگاروں کے لیے افسانوی فن کا ایک منشور فراہم کر دیا۔

* * *

وقار عظیم صاحب ہمیں اُردو فکشن پڑھایا کرتے تھے۔ دھان پان جسم والے وقار صاحب شیروانی پہنے اور مفلر اوڑھے کلاس میں داخل ہوتے تو یوں لگتا جیسے متانت مجسم ہو کر آ گئی ہے۔

اُردو کے کلاسیکی اور داستانوی ادب پر ان کی نظر ایسی گہری تھی کہ وہ اپنے لیکچر کے دوران گویا گزشتہ صدیوں کو ایک بار پھر سے زندہ کر دیتے تھے۔ ہم نے ان کو بہت کم ہنستے دیکھا ہے لیکن ایک خوشگوار مسکراہٹ ہمیشہ ان کے لبوں پر کھیلتی رہتی اور ان کی آنکھوں میں ایک ایسی شفقت اور محبت تھی جس کی مثال کے لئے لفظ نہیں ملتے وہ ان اُستادوں میں سے تھے جو اپنے سر پر رکھا ہوا علم کا بوجھ کلاس میں پھینک کر آنے کے قائل نہیں تھے بلکہ انہیں پڑھانے میں لطف آتا تھا وہ بولتے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنی بات سے خود بھی لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ تدریس کے ساتھ یہ کمٹ منٹ ایسی تھی جس کا اثر ان کے طالب علموں پر بھی ہوتا تھا۔ ان کی کتابیں بھی ان کے مخصوص دھیمے لیکن علمی مزاج کی نمائندہ ہیں اور اُردو داستانوں پر ان کا کام آج بھی ایک حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔

امجد اسلام امجد

* * *

CS CamScanner

میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

سیّد وقار عظیم فن اور زندگی

ڈاکٹر رضیہ نور محمد

ادبی تنقید نگاری محض ادب پاروں کے یکے بعد دیگرے یا عہد بہ عہد تخلیق کیئے جانے کے جائزہ کا نام نہیں بلکہ انسانی ذہن یا فطانت کے مختلف ارتعاشات کا ایک مرقع ہے۔ ادب کا وہ خمیر جس سے اس کی تعمیر ہوئی ہے اس شکل سے مختلف ہوتا ہے جو ہمیں ادبی کارناموں میں نظر آتی ہے۔ سید وقار عظیم نے ذہنی ایمانداری کو اپنا رہبر بنا کر زندگی کے واقعات کے اُتار چڑھاؤ، کش مکش، افراتفری، اس کے چہرے کا حسن اور بدصورتی، اور فراوانی کو پوری چھان بین کے بعد اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ اُنہوں نے 1930ء کے پس و پیش کچھ افسانے رسالہ ساقی، نیرنگ خیال اور عالمگیر میں لکھے تھے مگر بقول سید وقار عظیم اُن کی طبیعت میں جو افسانہ نگاری یا شعر گوئی کا رجحان تھا وہ تنقید نگاری کی طرف منتقل ہو گیا اور ادب اور شاعری پر اپنے خیالات کو ظاہر کرنے کا عزم غالب آ گیا۔ الیگزینڈر پوپ نے سچ کہا ہے:

Both must alike from heaven derive their light.

These Born to judge, as well as those to write.

انہیں ازل سے اسی کام کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔

CS CamScanner

سیّد وقار عظیم نے ادب کی ہر صنف پر اظہار خیال کیا ہے۔ مثنوی، افسانہ، ناول، ڈرامہ، داستان، فن اور فنکار، بچوں کا ادب اور اقبال۔

فرماتے ہیں: '' ہماری تنقید بہت سی قیدوں سے آزاد ہو کر بھی مجبور اور بے بس ہے۔ مگر میں اپنی طرف سے مطمئن ہوں کہ یہ میری اپنی رائیں ہیں''۔

نیز اُن کے الفاظ میں '' تنقید کے اس مقصد کو کسی اختلاف رائے کے بغیر تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ ادبی اور فنی تحقیقات کا جائزہ ہے۔ جس میں فنی تخلیق کو ایک تخیلی تجربے کی طرح جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ ایک ایسا تخیلی تجربہ جو اپنی جگہ مکمل بھی ہے اور جس پر کوئی تاریخی تبصرہ اثر انداز نہیں ہوتا۔''

ایڈمنڈ ولسن (Edmand Wilsan) کا حوالہ دیتے ہوئے ''فن اور فنکار'' میں کہتے ہیں:

'' تنقید کا کام اچھے، بُرے اور اعلیٰ و ادنیٰ کی تمیز ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو سمجھنا چاہیے کہ وہ معاشرتی یا سیاسی تاریخ ہے۔ جس نے ادب کا روپ دھارا ہے یا نفسیاتی مطالعے ہیں جنہیں ادبی تخلیق کی شکل ملی ہے.... '' گویا اچھے اور بُرے کی پرکھ اور ادنیٰ و اعلیٰ کی تمیز تنقید کا اصل مقصد ہے۔

سیّد وقار عظیم ماہر فن اُستاد ایک نرم مزاج نقاد اور ایک وضعدار طبیعت کے مالک شخص تھے۔ اُن کی تحریریں اُن کے مزاج، شخصیت اور شعار کا عکس، پرتو اور تصویریں تھیں۔ اُن کی شخصیت لکھنوی مزاج کی اعلیٰ تہذیبی قدروں سے مطابقت رکھتی تھی۔ وہ شائستگی، نفاست اور تہذیب کے مجسم پیکر تھے۔ لہٰذا ان کی تنقید ادب کی کسی ایک صنف کی تشریح، اس کی اقسام اور شروع سے لے کر زمانۂ جدید تک اس

CS CamScanner

کی ارتقائی منازل کی تفصیل ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر ''آغا حشر اور اُن کے ڈرامے''، ''ہمارے افسانے''، ''نیا افسانہ''، ''ہماری داستانیں'' توجہ طلب ہیں۔

سیّد وقار عظیم نے مغربی ادب سے بھی استفادہ کیا۔ کیونکہ مختصر افسانہ، ناول اور جدید ڈرامہ سب مغرب کی پیداوار ہیں۔

نئے افسانے پر بحث کرتے ہوئے سیّد وقار عظیم نے بڑی خوش اسلوبی سے ایک منطقی ربط کے ساتھ افسانے کی ارتقائی منازل کا تجزیہ کیا ہے۔ فنی اعتبار سے سیّد وقار عظیم کے علم اور احساس نے منفرد اور منتشر اکائیوں کو سمیٹ کر اکٹھا کیا اور ترتیب و تنظیم سے ایک مرتب اور منظم تنقید ظہور میں آئی۔ مختصراً یہ کہ تقریباً تین صدیوں میں اُردو میں جو نثر اور نظم کی ان گنت قصے کہانیوں کی کتابیں لکھی گئیں سیّد وقار عظیم کی تنقید نے اُن کا احاطہ کیا ہے۔

سیّد وقار عظیم کا انداز بیان ایک گہری، پُرسکون اور شفاف ندی کی طرح تھا۔ جس کی لہروں کے زیر و بم اور پانی میں ارتعاش کی ہلکی ہلکی آواز آتی تھی۔ اُن کے ہاں جوشیلے فقرے اور جذباتی بیانات کہیں نہیں ملتے۔ نہ کہیں آندھیاں اور جھکڑ ہیں اور نہ طوفانی ہواؤں میں لہروں کا جوش و خروش۔ اُن کی زندگی میں نظم و ضبط بدرجۂ اتم تھا۔ اُنہیں جب بھی دیکھا بڑے پُرسکون اور دھیمے لہجے میں بات کرتے ہوئے پایا۔ چال میں اتنی نرم روی تھی کہ اُن کے چلنے کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ جیسے ہوا کا لطیف جھونکا پاس سے گزر جائے۔

سیّد وقار عظیم کا ذہنی سفر (1935)ء سے اُن کی پہلی کتاب ''فن افسانہ نگاری'' سے شروع ہو کر ''اقبالیات کا مطالعہ'' (1977)ء تک ختم

CS CamScanner

ہوا۔ اُن کے فن کی ارتقائی منازل تقریباً چالیس برس کے عرصے پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اُن کی پہلی اور آخری تصانیف کا موازنہ کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو ادبی رفعتیں اقبالیات میں ملتی ہیں ''فن افسانہ نگاری'' میں اُن کی صرف چند جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ مگر ایک بات حیرت انگیز ہے کہ چالیس سالوں میں انہوں نے اپنا انداز بیاں اور اسلوب نہ بدلے۔ اُن کا سٹائل جو ''فن افسانہ نگاری'' میں 1935ء میں تھا وہی سٹائل 1966-67ء میں رہا۔ جب انہوں نے ''فن اور فنکار'' اور ''آغا حشر اور اُن کے ڈرامے'' لکھے۔ البتہ انہوں نے علامہ اقبال پر جو تین کتابیں اور بے شمار مقالے لکھے اُن کا ادب میں مقام ہی کچھ اور ہے۔ اور اس کی وجہ اُن کے دل میں علامہ اقبال کی محبت، عقیدت اور تحریم ہے۔

وہ بہت معیاری اُردو لکھتے تھے اور اُن کے سٹائل میں روانی اور بے ساختگی ہے۔

بحیثیت ایک نقاد کے سیّد وقار عظیم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تنقید کرتے وقت ہمیشہ Dispassionate رہے۔ اور اُن کی وضاحتوں اور تشریحات میں Involvement نظر نہیں آتی۔

شجرۂ نسَب

پروفیسر سیّد وقار عظیم

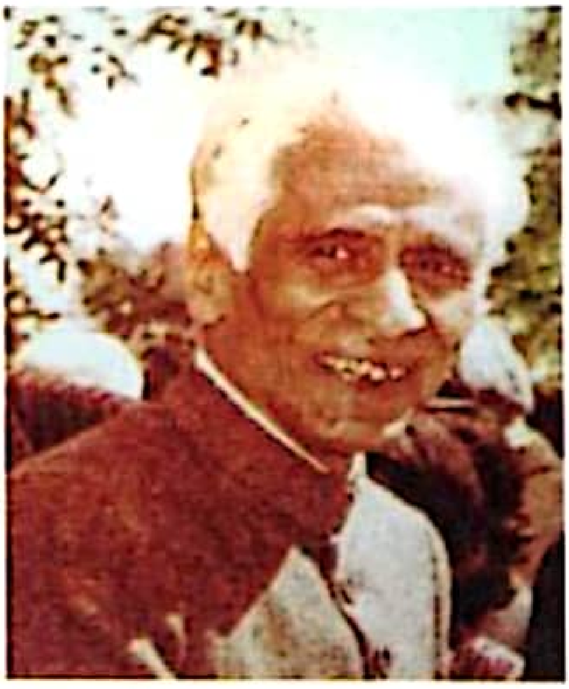

شجرہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تا حضرت شاہ ابوالمعالی قدس سرہٗ

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
حضرت فاطمۃ زوجہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ
حضرت امام حسین علیہ السلام
حضرت زین العابدین علیہ السلام
حسین الاکبر
سیّد عبداللہ مکی
سیّد علی مکی
سیّد حسین مکی
سیّد حمزہ مکی
سیّد احمد مکی
سیّد محمد شجاع مکی
سیّد محمد مکی
شاہ محمد اشرف مکی
سیّد امام اجل لاانام مکی
سیّد محمد شریف مکی
سیّد عبد الصمد مکی
سیّد عبد الشکور مکی
سیّد عبد الغفور مکی
ابوالبرکات
میر سیّد مجتبیٰ مکی
میر سیّد علی مکی
سیّد شمش الدین مکی
سیّد محمد مکی
سیّد شہاب الدین مکی
سیّد محمد محمود مکی
سیّد احمد مکی
سیّد امام عبداللہ الحسینی
سیّد ظہیر الدین
سیّد نصیر الدین
سیّد عبدالغفور
سیّد عبدالطیف
سیّد شیروز
سیّد عبدالباقی
سیّد عبدالسمیع

CS CamScanner

سیّد عبدالسمیع ابن سیّد عبدالباقی

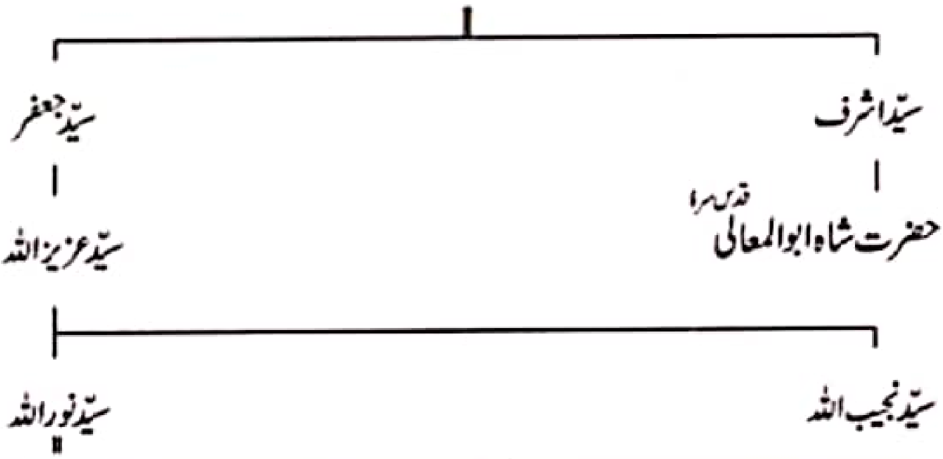
سیّد اشرف
سیّد جعفر
حضرت شاہ ابوالمعالی قدس سرہ
سیّد عزیز اللہ
سیّد نجیب اللہ
سیّد نور اللہ

سیّد نور اللہ ابن سیّد عزیز اللہ

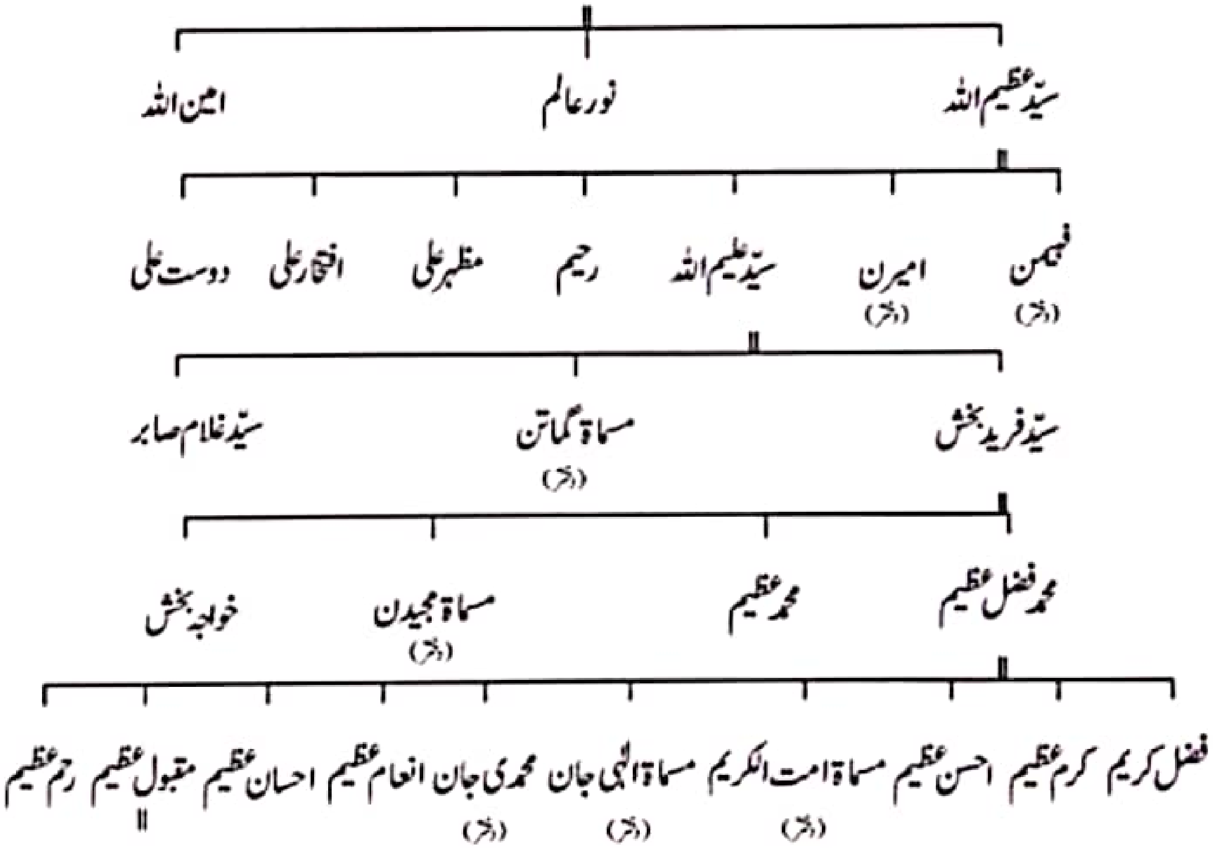
سیّد عظیم اللہ
نور عالم
امین اللہ
فہمن (دختر)
امیرن (دختر)
سیّد علیم اللہ
رحیم
مظہر علی
افتخار علی
دوست علی
سیّد فرید بخش
مسماۃ گماتن (دختر)
سیّد غلام صابر
محمد فضل عظیم
محمد عظیم
مسماۃ مجیدن (دختر)
خواجہ بخش
فضل کریم
کرم عظیم
احسن عظیم
مسماۃ امت الکریم (دختر)
مسماۃ الٰہی جان (دختر)
محمدی جان (دختر)
انعام عظیم
احسان عظیم
مقبول عظیم
رحم عظیم

مقبول عظیم ابن محمد فضل عظیم

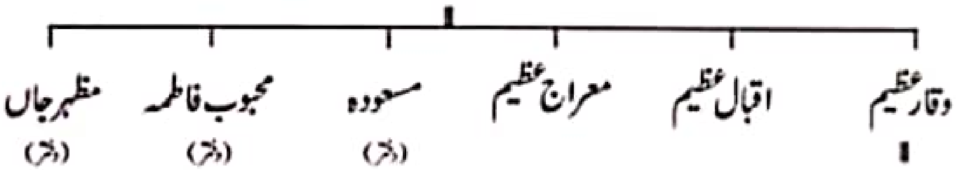
وقار عظیم
اقبال عظیم
معراج عظیم
مسعودہ (دختر)
محبوب فاطمہ (دختر)
مظہر جاں (دختر)

سیّد وقار عظیم ابن مقبول عظیم

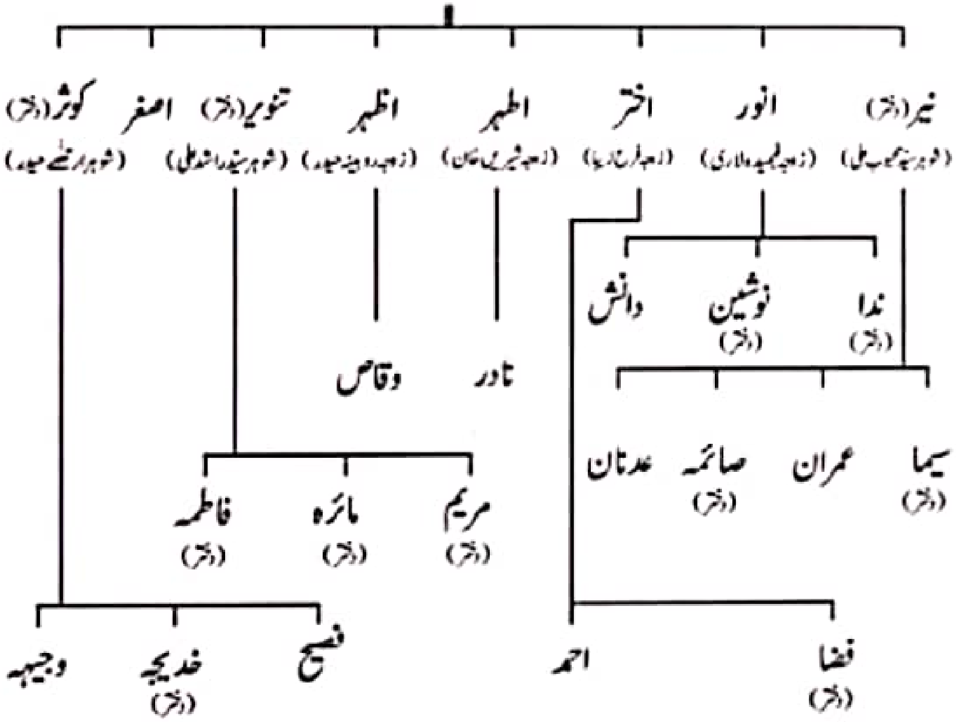
نیر (دختر) (شوہر سید محبوب علی)
انور (زوجہ حلیمہ ملاری)
اختر (زوجہ فرح نازیہ)
اطہر (زوجہ شیریں خان)
اظہر (زوجہ روبینہ حمید)
تنویر (دختر) (شوہر سید راشد علی)
اصغر
کوثر (دختر) (شوہر مرتضےٰ حمید)
ندا (دختر)
نوشین (دختر)
دانش
نادر
وقاص
سیما (دختر)
عمران
صائمہ (دختر)
عدنان
مریم (دختر)
مائزہ (دختر)
فاطمہ (دختر)
فضا (دختر)
احمد
فصیح
خدیجہ (دختر)
وجیہہ

پیشِ خدمت ہے "کتب خانہ" گروپ کی طرف سے ایک اور کتاب

پیشِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔ گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

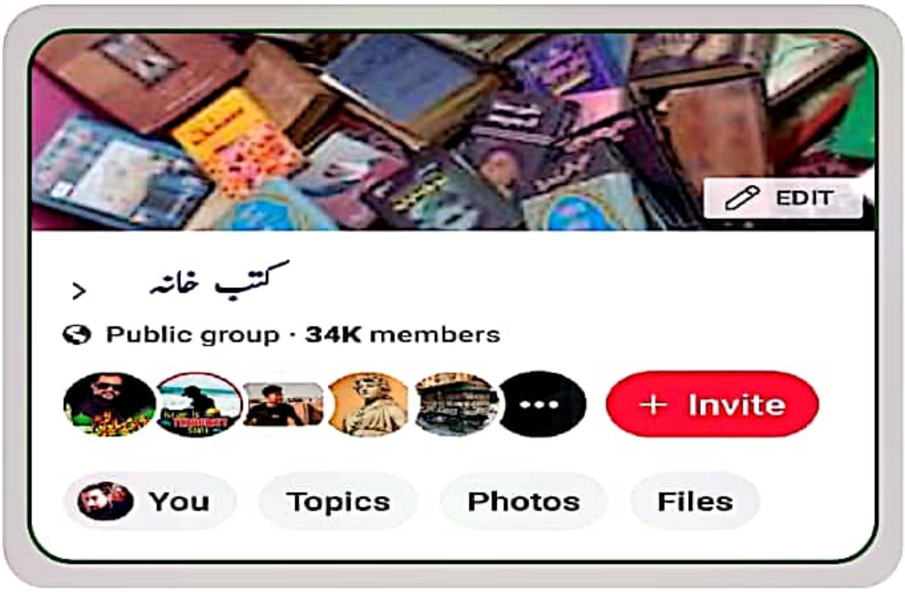
EDIT
کتب خانہ
Public group · 34K members
+ Invite
You
Topics
Photos
Files

عقابی : +923055198538
محمد اطہر اقبال : +923340004895
محمد قاسم : +971543824582
میاں شاہد عمران : +923478784098
میر ظہیر عباس روستمانی : +923072128068

طالبانِ دعا:
ایڈمنز "کتب خانہ"

CS CamScanner

37131 202 054 847
DR Dawes Road

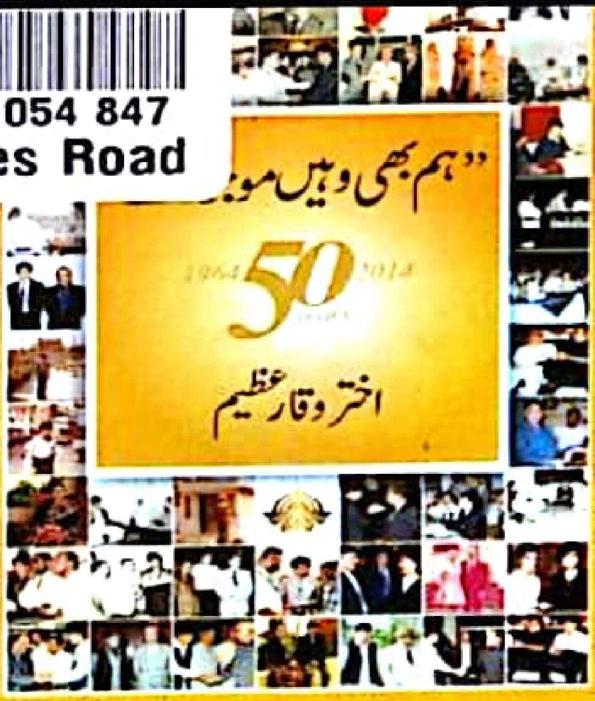

"ہم بھی وہیں موجود تھے" پی ٹی وی کے 50 برسوں کی کتھا کہانی ہے۔ اس میں کہیں تلخی نہیں، کسی کی عیب جوئی نہیں اور خود کو طرم خان ثابت کرنے کی کوشش نہیں۔ یہ اختر وقار عظیم کا کمال ہے۔

زاہدہ حنا

یہ کتاب ٹیلی وژن کے اندر کی دنیا آپ کے سامنے لے آتی ہے۔ اختر صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے پوری قوم کو یہ دکھا دیا کہ ادارے کیسے بنتے ہیں۔ چھوٹی سی بیرک میں بھی لال قلعہ بن سکتا ہے اگر بنانے والوں کے ہاتھ اور حوصلے مضبوط ہوں۔

حسینہ معین

اختر تم نے برا کیا ایک اچھی کتاب لکھ کر ہمیں پرانے اچھے زمانے یاد کرا دیئے۔

کشور ناہید

جس دلچسپ اور رواں دواں انداز میں یہ کتاب لکھی گئی ہے اس کا تقاضا ہے کہ وہ اسی موضوع سے متعلق ایک اور کتاب لکھ کر اس دائرے کو وسیع تر کریں تا کہ یہ پی ٹی وی کے عروج و زوال کی ایک مستند دستاویز بن سکے۔ یہ کام اختر وقار جیسا قابلِ اعتبار راوی ہی کر سکتا ہے۔

امجد اسلام امجد

صاف و سادہ، رواں و موثر اور دلکش انداز میں کتاب اپنے آپ کو پڑھوائے چلی جاتی ہے اور واقعات آپ کو بہائے لیے جاتے ہیں۔

افتخار عارف

لمبے عرصے کے بعد اردو نثر میں ایک کتاب آئی ہے جس کے اسلوب کی جمالیاتی رعنائی مطالعے کو رفعت عطا کرتی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید

خوب کتاب لکھی ہے۔ باتوں باتوں میں پورے سنہری دور کو نظروں کے سامنے لا کھڑا کیا۔ پڑھتے جاؤ مسکراتے جا

انتظار حسین

HY

Azim, Sayyid Vaqar,
Padram Sultan Bood :Prof.
Seyyed Waqar Azeem :

www.sangemeel.com
ISBN-10 969-35-3047-0
ISBN-13 978-969-35-3047-6
9789693530476